قصے لاہور کے

عبدالمجید شیخ

قصے لاہور کے

عبدالمجید شیخ

قصے لاہور کے

ہمدم دیرینہ اسد اللہ غالب
کے ذوقِ مطالعہ کی نذر!

عبدالمجید شیخ
وحید رضا بھٹی
۱۰ر اپریل ۲۰۱۵ء

انگریزی سے ترجمہ

وحید رضا بھٹی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

954.9143 Sheikh, Abdul Majid
Qissay Lahore Kay/ Abdul Majid Sheikh, Urdu tr. by Waheed Raza Bhati.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2015.
256pp.
1. History - Lahore.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/ مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

2015ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2836-0
ISBN-13: 978-969-35-2836-7

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sangemeel.com e-mail: smp@sangemeel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

انتساب

میں یہ کتاب معنون کرتا ہوں

☆ اپنے والدین، حمید شیخ اور وائلٹ ایڈیتھ کے نام جن کی پرورش نے زندگی سے پیار کرنے کے قابل بنایا۔

☆ اپنی شریکِ حیات، ریحانہ کے نام، جس نے مجھے اب تک برداشت کیے رکھا ہے۔

☆ اپنی بیٹیوں، سعدیہ اور سحر کے نام، جو میری سب سے بڑھ کر حمایتی اور نقّاد ہیں۔

☆ لاہوریوں کے نام جو نہایت منفرد اور خیال رکھنے والے ہیں۔

ترتیب

	دیباچہ	11
1۔	راوی کے دفینے	14
2۔	گم گشتہ پتّن کشتیوں کا معاملہ	20
3۔	گمشدہ کشتیوں کا پُل	23
4۔	کچا کوٹ جولاہور بن گیا	26
5۔	سیتا اور اشوک کے بارے میں	29
6۔	لاہور اور اس کی نیل کی صنعت	32
7۔	لاہور کی کہنہ سالی پردے میں پوشیدہ	36
8۔	لاہور میں قحط سالی	39
9۔	بسنت اور صوفی بزرگ	43
10۔	داتا دربا: جہاں سب کو کچھ نہ کچھ مِل جاتا ہے	46
11۔	اگر مُرادیں گھوڑے ہوتیں	49
12۔	چھ پاکدامن خواتین کی پُراسراریت	52
13۔	بزرگ یا گنہگار_ مقبرے کی گہری پُراسراریت	55
14۔	لاہور کی تین مؤثر ہستیوں سے محرومی	58
15۔	کپلنگ اور کِم کے بارے میں	61
16۔	سول اینڈ ملٹری گزٹ نے چرچل کی زندگی کو کیسے سنوارا؟	64
17۔	لاہور کی عکس بندی	67
18۔	ایڈولف ہٹلر کا تحفہ	70
19۔	سام براؤن بیلٹ کی اصلیت	74
20۔	اطالوی نژاد لاہوری جنونی	77
21۔	لاہور کا وحشی حکمران	81

22۔	بلّو اور اس کی رانیوں کی مقبولِ عام روایت	84
23۔	گھڑ سوار جس نے فیروز پور روڈ بنائی	87
24۔	حسّو تیلی کے روحانی معجزے	90
25۔	لاہور کے راجپوت قبائل کا سلسلۂ نصب	92
26۔	قلم اور تلوار	95
27۔	شہزادہ جو فقیر ہو گیا	98
28۔	قزلباش قازق	101
29۔	بَدذات چندو شاہ	104
30۔	لاہور کا رابرٹس خاندان	107
31۔	بدمعاش جو بزرگ سے زیادہ نامور ہُوا	110
32۔	نامور خواجہ سرا	113
33۔	جگے کی بہن مِیداں	116
34۔	یہ بلاقی شاہ تھا کون؟	119
35۔	مشہور اکھاڑے اور گاماں کی روایت	122
36۔	باگھ کی مانند شخص	125
37۔	دینا ناتھ برہمن ___ باز ماندہ	128
38۔	ڈاکٹر ہرلان کی جادوئی دوا	131
39۔	لاہور بھنگیوں کی دسترس سے کیسے نکل گیا؟	135
40۔	'تین حکیموں' کا تیس سالہ دورِ حکومت	138
41۔	سلطان ٹھیکیدار پر عذابِ الٰہی	141
42۔	جس روز قصائیوں کو ناک کٹوانا پڑے	144
43۔	گھوڑا جس نے لاہور کو جنگ میں دھکیل دیا	147
44۔	موئیاں دی منڈی کی کہانی	150
45۔	وہ شخص جس نے تاج محل ڈیزائن کیا	153
46۔	لاہور کے یہودیوں کی پُراسراری	156
47۔	شہر کا سب سے بڑا دھما کا	160
48۔	بھگت سنگھ اور خونی دائرہ	163
49۔	گیونچی سے موصولہ خط	166

50۔	لاہوراور کوما گاٹا مارو	170
51۔	اس نے شکست پر موت کو ترجیح دی	173
52۔	ذہن سے محَو جان لیوا کھیت	176
53۔	بغداد اور لاہور میں نسل کشی	179
54۔	نادر شاہی مجموعی روگ	182
55۔	آزادی کی جنگ دائمی ہوتی ہے	185
56۔	غول بھاروچہ کا آم کا درخت	189
57۔	جب مغربی محاذ ابھی خاموش نہیں ہُوا تھا	192
58۔	میاں میر کے مقام پر 26ویں نیٹوؤ کا ذبیح	195
59۔	اپنی نامور دیواروں کے بغیر لاہور	198
60۔	ریل کی ایک مقدّس پٹڑی کے ساتھ ساتھ پیدل چلتے ہوئے	202
61۔	لاہور کے برف گڑھے	205
62۔	جی پی اَو کا پرانا گھنٹا	208
63۔	شالامار باغ کا حیرت انگیز نظامِ آب قوائی	211
64۔	جادو گھر اور اس کی دائمی پُراسراریت	215
65۔	میانی صاحب اور جنونی سکھ	218
66۔	لاہور دربار کا تیز طرار شخص	221
67۔	بریڈلے ہال کی تاریخی اہمیت	224
68۔	گھوڑا گاڑیوں کے اڈّے والے بنگلے کی سرگذشت	227
69۔	داراشکوہ کے سُرخ پتّھر	231
70۔	شہر کی قدیم ترین مسجد کی تلاش	235
71۔	لاہور کا اوّلین انگریزی میڈیم سکول	238
72۔	ایک عظیم لائبریری کا انحطاط	241
73۔	کتابوں کے لاہوری کاتبین	245
74۔	کاغذ بنانے والوں کی یاد میں	248
75۔	''کمپنی عہد'' میں لاہور کے اوّلین کاروبار	251
76۔	لاہوری ککّے زئی ___ گھوڑوں کے سوداگر —	254

ادارہ برائے فروغ تعلیم، ساہی (SAHE) کا قیام 1982 میں لاہور میں ہوا۔ ساہی غیر منافع بخش، غیر سرکاری تنظیم ہے جو سائیٹیز ایکٹ 1861 کے تحت رجسٹرڈ ہے۔ ساہی بنیادی طور پر تعلیمی نظام کی بہتری کے لئے کوشاں ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ہم ایسا معاشرہ تشکیل ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں جہاں ایک دوسرے کے لئے رواداری، تحمل کے جذبات فروغ پا سکیں اور متوازن سوچ اور نکتہ نظر پروان چڑھ سکے۔ اس ضمن میں ساہی ماضی میں شہریت کے عنوان پر نامور سکالرز کے لیکچرز کا انعقاد کرواتا رہا ہے۔ زیر نظر طباعت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ "لاہور؛ لامتناہی قصے" کا آغاز 2006 میں ایک جرمن ادارے ایچ بی ایف کی معاونت سے ہوا۔ اپنے موضوع پر یہ ایک نئی کاوش تھی جس میں بیان کیا گیا ہے کہ لاہور کی تاریخی سرزمین پر بسنے والے ہر رنگ، نسل و مذہب اور زبان بولنے والوں نے کس طرح اس شہر کو وہ پہچان دی جس سے ہماری نئی نسل ناآشنا ہوتی جا رہی ہے۔ لاہور شہر کی اس پہچان اور تاریخ کو زندہ رکھنا ضروری ہے۔ اس تصنیف کے آسان اندازِ بیان اور دل موہ لینے والے کرداروں کی وجہ سے اس کی بازگشت سرحد پار جا پہنچی اور 2008 میں اس کی نئی دہلی سے بھی اشاعت ہوئی۔ اسی سال لاہور شہر کے ایک نامور اشاعتی ادارے سنگِ میل نے اس کتاب کی اشاعت کی۔ کافی عرصے سے شائقین کی طرف سے اس کے اردو ترجمے کی فرمائش کی جا رہی تھی تاکہ یہ زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچ سکے۔ ساہی کو خوشی ہے کہ سنگِ میل کے باہمی تعاون سے یہ مشکل مرحلہ بھی بخوبی طے پا گیا اور اس کا اردو ایڈیشن آپ کے ہاتھ میں ہے۔

دیباچہ

قصّہ خوانی کا فن شاید کبھی ختم نہ ہو پائے گا کیونکہ اس شغل میں ہی دوسروں کو خواہ بوڑھے ہوں یا جوان، کہانی آگے سنانے کا جوہر موجود ہوتا ہے۔ جو قصے کہانیاں ہمارے آباؤ اجداد نے پسند کیں غالباً ان میں چاشنی ڈالنے کے لئے زیرِ غور معاملے کی حدّت کے مطابق تھوڑا بہت ردّ و بدل کیا اور آگے دوسروں کو سنائیں۔

میرے والد 'حمید شیخ' یا جیسے وہ ایچ ایس کے مخفف سے اپنے قارئین میں معروف تھے، بڑے جاندار قصہ گو تھے۔ لاہور کے انگریزی روزنامے سول اینڈ ملٹری گزٹ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے وہ اپنے شہر کی سب سے بہتر منظر کشی کرنے والے تسلیم کیے جاتے تھے۔ اپنے بچپن کے برسوں میں ہم ان کے قصے کہانیوں کو ہمہ تن گوش ہو کر سنا کرتے تھے۔ ہمیں واقعی کبھی پتا ہی نہ چلتا کہ وہ کب اور کہاں اُس باریک حدِ فاصل کو پار کر جاتے جو حقیقت کو من گھڑت سے جدا کرتی ہے۔ سارے کا سارا مواد جاذبِ توجہ ہوتا۔ ہم آٹھوں بہن بھائی ان کی کہانیوں کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے ہم سب میں لاہور کے لئے اپنا جذبۂ جنوں منتقل کر دیا۔

لاہور کے بارے میں ہمیں کہانیاں سنانے کے اپنے ہیجانی جذبے میں اضافے کی غرض سے وہ اکثر ہمیں اپنے ہمراہ ''لمبی لمبی پیدل چلنے کی مہمات'' پر اندرونِ شہر لے جاتے، جہاں مقامات دیکھنے کے علاوہ ان لوگوں سے ہماری اتفاقیہ ملاقات بھی کرا دیتے جن کے جسمانی وجودوں کے ساتھ وہ اپنی کہانیوں کا باہمی ربط ضبط پیدا کر لیتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ انہیں ہر گھر، ہر گلی اور ہر محلے کے بارے میں گہرا علم تھا۔ ہر موڑ پر ایک کہانی تھی ایسی کہانی جو شہر کی تاریخ کے حقائق میں گچی ہوتی۔ اس کتاب میں زیادہ تر جو کچھ میں نے تحریر کیا ہے اس کا ربط وہیں سے بحال کیا ہے جہاں انہوں نے چھوڑا تھا___ ہمیں بھی___ 1971ء میں۔

چھ مسرور ترین برسوں تک گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم کی حیثیت سے جن احباب سے دوستی استوار اور پائیدار ہوئی۔ اس میں ہماری میراث، ہمارے آباء و اجداد اور قدیم اندرونِ شہر میں مشترکہ دلچسپی کا عنصر نمایاں تھا۔ وہ آج بھی استادہ ہیں تھپکی دینے کے لئے، ان سے مزید سیکھنے کے لئے اور منزل کی سمت کی بہتر

سمجھداری کے لئے۔ ان دوستوں میں، جو بے شمار ہیں، غضنفر اقبال عرف شیرو اور خالد محمود عرف خالدی ممتاز ہیں۔ دونوں حضرات قدیم اندرون شہر لاہور کے بارے میں بے بہا معلومات کے حامل ہیں۔

اس کتاب کا، لاہور کے متعلق کہانیوں کے مجموعے کا، ماخذ منصفانہ طور پر میرے گرو کے کندھوں پر ڈالا جا سکتا ہے یعنی ظفر اقبال مرزا صاحب جو زِم کے مخفف نام سے پوری صحافی برادری میں معروف ہیں۔ انہوں نے ایک روز مجھے طلب کیا اور حقیقی معنوں میں حکم صادر کیا کہ میں ان کے اخبار، روزنامہ ڈان لاہور، جس کے وہ اُن دنوں ایڈیٹر تھے، کے لیے ہفتہ وار کالم لکھا کروں۔ وہ 1960ء کی دہائی میں میرے والد کے نہایت فرماں بردار زیرِ آموز تھے اور اُن میں والد صاحب کے کسی کام سے انکار کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ اسی روایت نے مجھے بھی لاجواب کر دیا اور میرے ہفتہ وار کالموں نے اپنا قارئین کا حلقہ تلاش کر لیا اور خوش قسمتی سے یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

تقریباً چھ برس تک افراد، مقامات اور اشیاء کے بارے میں کالم لکھنے کے بعد لوگوں کی طرف سے اسے کتابی صورت میں شائع کرنے پر زور دیا جانے لگا۔ مشیت ایزدی کی اعانت کے عجیب طریقے ہیں۔ انجمن برائے ترقی اعلیٰ تعلیم لاہور کی ڈاکٹر فریحہ ظفر اور عباس رشید نے میری اعانت کے لئے پیش قدمی فرمائی۔ انہوں نے اوّلین ایڈیشن کے لیے مالی امداد کا انتظام کر دیا اور یوں اشاعت کے مصارف کا بار تمام ہوا۔ ان دونوں کے لیے خصوصی ممونیت کا اظہار ہے۔

چند الفاظ مندرجات کے بارے میں جو آپ پڑھیں گے، یہ تمام تحریریں اخباری کالموں کے لیے تھیں جن پر ایک ہزار سے زائد الفاظ سے تجاوز نہ کرنے کی پابندی تھی۔ لیکن کہانی تو اس تھوڑی سی وسعت کے اندر رہتے ہوئے بھی گھڑی جا سکتی ہے۔ ان میں بیان کردہ تمام حقائق کی میں نے اپنی استعداد کے مطابق تصدیق کر لی تھی۔ اگر پھر بھی کوئی لغزش رہ گئی ہو، جو یقیناً ہو سکتی ہے تو اس کے لیے معذرت ہی کی جا سکتی ہے۔ لیکن پھر لاہور ایسا شہر ہے جہاں بہترین کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ یہ کتاب ایک عاجزانہ ابتدا ہے اور امیدِ واثق ہے کہ یہ رواداری کی رُوح کو فروغ دے گی جو اس شہر کا طرّۂ امتیاز ہے۔ اس دشت کی سیاحی میں ہم نے بہت سی کتابوں اور افراد سے استفادہ کیا ہے جو سب کے سب ہمیشہ مہربان رہے۔ میں اپنے دوستوں رفیق ڈوگر اور فقیر سیّد اعجاز الدین کا ذکر ضروری خیال کرتا ہوں جن کے تبحّرِ علم سے میں بہرہ مند ہوا۔

لاہور کے مکین ان سینکڑوں افراد کا خصوصی ذکر نہایت ضروری ہے، جن میں سے چند ایک کو تو میں جانتا ہوں لیکن بیشتر اجنبی افراد ہیں جو تمام کے تمام ہمیشہ مدد کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان کے تبصرے، طرزِ عمل اور طور طریقے ہمیشہ مجھے تحریک دیتے رہتے ہیں کہ میں لاہور کے بارے میں مزید لکھتا رہوں کیونکہ ان افراد کے بغیر شہر کبھی ایسا نہیں رہے گا۔

کتاب کا دوسرا ایڈیشن (انگریزی) سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور کی جانب سے 2008ء میں شائع ہوا۔ یہ اشاعتی ادارہ لاہور شہر اور اس کی تاریخ کے بارے میں قابلِ ستائش حیثیت کا حامل ہے اور یقیناً زیادہ قدر شناسی کا مستحق بھی۔ چونکہ ہمارے قارئین کی معتد بہ تعداد انگریزی زبان میں حظ اٹھانے سے قاصر ہے لہٰذا اس کتاب کا اردو ایڈیشن شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا تا کہ عوام الناس کو اپنے شہر لاہور کے بارے میں زیادہ سے زیادہ تحقیقی مواد پر مبنی معلومات میسر ہو سکیں۔ اس کام کے لیے نگہ ٔانتخاب اپنے کلاس فیلو، ''راوی'' گورنمنٹ کالج کے ایڈیٹر (1973ء) اور اب سابق بیوروکریٹ، وحید رضا بھٹی پر پڑی اور انہوں نے کمالِ مہربانی سے ترجمہ کرنے کی ہامی بھر لی اور یوں یہ اردو ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

آخر میں مجھے اپنی زندگی کی تین دلکش خواتین کا اعتراف کرنا ہے۔ اوّل تو میری اہلیہ ریحانہ ہیں جن کی میں اپنے طور طریقوں کو نہایت صبر سے برداشت کرنے کی کوشش کا معترف ہوں اور دوم میری دو بیٹیاں سعدیہ اور سحر ہیں، جن دونوں کی خوبی یہ ہے کہ جب میرا تخیل راہ سے بھٹک جاتا ہے تو وہ اسے راہِ راست پر لے آتی ہیں۔ لیکن اس تخیل کے گرد گھڑی گئی کہانیوں کی بُنت میں ان کی پسندیدگی برقرار رہتی ہے۔ لاہور کے بارے میں ان کے اندر جنوں سرایت ہوتا رہتا ہے جس کی چاشنی سے وہ لطف اندوز ہوتی رہتی ہیں۔

مجید شیخ

لاہور، اکتوبر 2014ء

●○●○●○●

راوی کے دفینے

دریائے راوی پاکستان اور ہندوستان دوملکوں میں واقع ہے۔ یہ اُن پانچ دریاؤں میں سے ایک ہے جس نے پنجاب کواس کا نام دیا ہے۔ راوی ویدی زمانے میں پروشانی یا ایراوتی کے نام سے ہندوستانیوں میں اور قدیم یونانیوں میں ہائیڈرااوٹس کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس کا منبع کوہ ہمالیہ میں ہندوستان کے صوبے ہماچل پردیش کا ضلع چنبہ ہے۔ اس کی گذرگاہ شمال مغربی جانب ہے۔ یہ ڈلہوزی کے نزدیک مغربی جانب مُڑتا ہوا دھاؤلا دھر سلسلہ کوہ میں گھاٹی بناتا ہوا مادھوپور کے نزدیک پنجاب کے میدان میں داخل ہوتا ہے اور پاکستانی ہندوستانی سرحد کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک بہنے کے بعد پاکستانی حدود میں داخل ہو جاتا ہے اور پھر دریائے چناب میں شامل ہو جاتا ہے۔ دریائے راوی کی لمبائی تقریباً سات سو بیس کلومیٹر ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے مابین سندھ طاس معاہدے کی رُو سے راوی کا پانی اب ہندوستان کی ملکیت بن چکا ہے۔ یہ دریائے لاہور بھی کہلاتا ہے، کیونکہ لاہور کا عظیم شہر اس کے کنارے آباد ہے۔

لاہور کی عظیم پُراسرار کہانیوں میں سے ایک دریائے راوی کے بارے میں ہے، جو ایک روایت کے مطابق، بے نظیر حجم کے بیش بہا نہفتہ دفینوں سے مالا مال ہے۔ اور دوسری روایت کے مطابق قلعۂ لاہور سے دریائے راوی تک زیرزمین ایک خفیہ سُرنگ کا وجود ہے۔ ہر بار جب کسی لاہوری کو شہر سے باہر جانا پڑ جاتا ہے تو اسے اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک وہ دوبارہ دریائے راوی کو نہ دیکھ لے۔ آج بھی عملی طور پر یہ بے ساختہ پن قائم دائم ہے۔

آپ حیران ہوں گے کہ آخر دریائے راوی ہی کیوں ''بے نظیر حجم کے بیش بہا دفینوں'' سے بھرا پڑا ہے۔ کہیں موجودہ کثافت بھری ایک چھوٹی سی ندی، جس میں کیچڑ آلود بھینسیں لوٹتی پوٹتی رہتی ہیں، کے بارے میں ذرا زیادہ ہی مبالغے سے تو کام نہیں لیا جا رہا۔ جہاں ایک ٹھاٹھیں مارتے دریا کے بجائے خالی خولی دھول سے اَٹا ایک ریتلا میدان دکھائی دیتا ہے جس پر نظر پڑتے ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اور ہمارا کام محض یہ رہ گیا ہے کہ ہم قدرت

کے انتقام کے بجائے بشری گناہوں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے خود پانی کے معاملے بہت بُرے طریقے سے طے کیے۔ دریائے راوی میں پانی کی دھار کم تر ہو کر انتہائی پتلی ہو چکی ہے، کیونکہ ہندوستان نے ہمارا پانی چھین لیا ہے۔ اور اگر سچ کہیں تو یہ کہ وہ ہماری رضامندی سے ہمارا پانی ہتھیا گئے۔ وہ تو جب موسم برسات میں دریاؤں میں پانی چڑھ جاتا ہے تو پھر وہ بپھرے ہوئے راوی کے ریلے کو ہم پر چھوڑ کر ہماری تباہی کا سامان بنا دیتے ہیں اور ہم اپنے ذریعۂ مواصلات راوی کو پیار کی صورت کے بجائے غصے میں ہی دیکھ پاتے ہیں۔

راوی اور اس کے دفینوں کی داستان ہندومت کی متبرک کتابوں، ویدوں میں تقریباً پانچ ہزار سال پہلے سے شروع ہو جاتی ہے جب رام اور سیتا نے لاہور میں دریائے راوی کے کنارے بیٹھے ہوئے اسے اس وقت تک انسانی علوم کے مطابق عظیم ترین دفینوں کا رکھوالا قرار دیا تھا۔ چنانچہ اس اعتقاد کا بیج بو دِیا گیا جو آج تک قائم چلا آتا ہے۔ تب سے ہمارے آباؤ اجداد پکا یقین رکھتے ہیں کہ دریائے راوی کی تہ میں سونے اور چاندی کے ذخائر بھرے پڑے ہیں، جو صدیوں پر محیط مختلف ادوار میں حملہ آوروں اور فاتحین سے بھاگتے وقت کئی حکمرانوں اور اُمراء نے دریا میں پھینک دیئے تھے۔ جب بھی کبھی افراتفری کا دور دورہ ہوتا تو خزانوں کو ''راوی بُرد'' کرنے کی افواہیں گردش کرنے لگتیں۔ اس سے دیگر کہانیوں نے جنم لیا جن پر آج بھی پکا یقین کیا جاتا ہے کیونکہ یہ نسل در نسل منتقل ہوتی رہی ہیں۔

اسی طرح کی ایک کہانی اور بھی ہے کہ قلعہ لاہور کے اندر سے شروع ہونے والی ایک سُرنگ مقبرۂ جہانگیر تک جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کا تو یہ بھی یقین ہے کہ یہ سرنگ دہلی تک جاتی تھی، چنانچہ شاہی خاندان کے افراد پر جب کبھی حملہ ہوا یا حملے کی دھمکی ملی تو وہ بھاگتے وقت جملہ افراد اور تمام خزانوں سمیت اسی خیالی راستے سے دہلی منتقل ہوتے رہے تھے۔ اکبر اعظم کے دور میں اس عہد کے وقائع کے مطابق دریا میں سے حقیقتاً سونے کے سکّے برآمد ہوئے تھے جنہیں اکبر اعظم کے والد ہمایوں نے، شیر شاہ سوری سے شکست کھانے کے بعد فرار ہوتے ہوئے وہاں دبا دیئے تھے۔ اس واقعہ سے لوگوں کی قوتِ متخیّلہ کو اس حد تک تحریک ہوئی کہ اکبری دور میں موسمِ برسات کے سیلاب آنے سے قبل لوگ واقعی دریا کی خشک تہ کو کھنگالتے رہتے تھے۔

لیکن دو دیگر وجوہات کی بنا پر دفینوں کی تلاش میں دریائے راوی کی خشک گذرگاہ میں از سرِ نو دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے جو واللہ اعلم ہو سکتا ہے دفینے وہاں مل بھی سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سن پچاس کی دہائی میں ایک برطانوی کمپنی نے دریائے راوی کے کناروں کو، ہندوستانی سرحد سے لے کر پاکستانی حدود کے اندر دس میل تک، استرکاری کی پیشکش کی تھی۔ یہ نتیجۂ فکر مرحوم ظفر الاحسن صاحب کا تھا۔ ان کو خواب آیا تھا کہ دریائے راوی کو لاہور شہر کے بیچوں بیچ بہنے دینا چاہیے اور دریا کے دونوں اطراف بہت بڑے بڑے پُشتے تعمیر کر کے لاہور شہر کو

منظّم طریقے سے آباد کرنا چاہیے۔ کمپنی کی ایک شرط کے مطابق اور دستاویز اس امر کی تصدیق کرتے ہیں، دریا میں سے جو کچھ بازیافت ہوتا وہ کمپنی کی ملکیت ہونا تھا۔ اس شرط کو دیکھ کر نوکر شاہی کی تخیلی اُپج کو یہ باور ہوا کہ ہو نہ ہو دریائے راوی میں ضرور دفینے موجود ہیں۔ چنانچہ معاہدہ دھرے کا دھرا رہ گیا اور مرحوم احسن صاحب کے جانے کے ساتھ ہی لاہور کا قدیم شہر اپنی مرضی سے پھلتا پھولتا گیا، حتیٰ کہ موجودہ بے ہنگم صورت اختیار کر گیا۔

حال ہی میں بہت سے لوگ دریا کو کھنگالتے دیکھے گئے ہیں۔ ان میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جنہوں نے دریا سے ریت نکال کر بیچنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ لیکن ایک اخباری اطلاع کے مطابق خزانے کے متلاشی لوگوں نے بھی دریا کی تہ کی کھدائی کا کام شروع کر رکھا ہے۔ لاہور شہر کے ایک علاقے مزنگ کے ایک رہائشی، جو پُراسرار علوم کا ماہر کہلاتا ہے، کا دعویٰ ہے کہ وہ لوگوں کی ایسے نہفتہ دفینے تلاش کرنے میں مدد کر سکتا ہے۔ یہ کہنا ہی کافی ہے کہ بہت سے احمق لوگ جھانسے میں آ جاتے ہیں اور پھر ایسی باتوں سے روایتی قصوں کو مزید تقویت مل جاتی ہے۔

لیکن ان اساطیری قصوں میں سب سے عمدہ یہ ہے کہ ایک سرنگ دہلی تک چلی جاتی ہے۔ ہم نے محکمہ آثارِ قدیمہ سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ کی تو انہوں نے بتایا کہ بلاشبہ ایک سرنگ کا وجود ملتا ہے، لیکن یہ قلعہ لاہور کے ایک کونے میں ختم ہو جاتی ہے۔ بہرحال قلعہ لاہور سے دریائے راوی تک یا دہلی تک جانے والی سرنگ ایک بے سروپا قصہ ہے۔ تاریخ میں بھی اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ چنانچہ ایک خوبصورت قصے پر خطِ تنسیخ پھر گیا۔ میں نے نوجوانی میں اپنے والد سے جب سرنگ کے بارے میں پوچھا تو جواب میں اُنہوں نے جو کچھ کہا وہ اس لائق نہیں کہ یہاں دہرانے کی جسارت کر سکوں۔ لیکن سائنسی حقیقت ایسے معاملات میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اساطیری قصے ایک حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں، جن پر معترض ہونے کو جی نہیں مانتا اور یہی اساطیروں کا مزہ ہے۔ یہ زندگی کی رعنائی میں اضافہ کرتے ہیں۔ لیکن اُن لوگوں کے لئے، جو دہلی تک سرنگ کے وجود میں یقین رکھتے ہیں، اب بھی امید ہے۔ سرنگ کے دہانے کا آغاز جس مقام سے ہوتا ہے وہاں فی واقع ایک کیچڑ آلود زمین دوز قید خانے کا وجود ہے۔ اس زمین دوز قید خانے کو ٹھیک ٹھاک کر کے سیاحوں کے لیے پُرکشش بنانے کی ضرورت ہے۔ اس امر سے یقیناً اساطیری قصے میں بھی اضافہ ہوگا اور لاہور میں رہنے کے مزے میں بھی۔

پھر ایک روز جب میں دریائے راوی کے پار گیا تو یہ دیکھ کر بے حد رنجیدہ ہو گیا کہ ایک زمانے میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا لافانی دریا اب تقریباً ناپید ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ایک کیچڑ اور کثافتوں سے بھری اتھلی ندی بہہ رہی تھی جو خود اس لفظ کی معذرت نظر آتی تھی اور جس میں چند بھینسیں بدقت نہانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

انگریزی شاعر ملٹن (1608-74) نے لاہور کا ذکر اُن معدودے چند شہروں میں کیا ہے جو جنت کی ایک پہاڑی سے حضرت آدمؑ کو نظر آئے تھے۔ آج ہم نے اس عظیم شہر کی تحقیر کر کے اسے جنت کا متضاد مقام بنا

رکھا ہے۔ ہمارے لیے جن کے آبا ؤ اجداد تاریخ کے آغاز سے قبل اندرون شہر میں رہتے آتے ہیں اس سے بڑھ کر کوئی تکلیف دہ بات نہیں ہوسکتی اور جب میں طیش کے عالم میں کھڑا تھا تو مجھے دریائے راوی کے کنارے واقع نور جہاں کے مزار کی لوح پر مرقوم شعر یاد آیا جو موجودہ لاہور کی صورتحال کا عکاس ہے۔

بَر مزارِ ما گریباں نے چراغے نے گُلے
نے پَرِ پروانہ سوزد، نے صدائے بُلبلے

وہاں وہ اپنی گرد آلود بوسیدہ قبر میں آسودۂ خاک ہے۔ برصغیر کی یہ عظیم ملکہ آج بھی بے توجہی کا شکار ہے۔ اس کے نزدیک ہی جہانگیر اپنے شاندار مقبرے میں محوِ خرام ہے۔ اس لبِ مرگ دریا کے کنارے جو ہمارے قدیم شہر لاہور کی علامتِ زیست ہے، مغلیہ سلطنت کا دوسرا سب سے بڑا شہر جس کے بارے میں 1641ء میں فرائیر سیز لک سچیَن نے لکھا تھا:

''ایک خوبصورت اور منظّم شہر، کشادہ آبی گزرگاہیں، اس کی گلیوں کی صفائی دیکھ کر تو میں دنگ رہ گیا۔ اور اس کے بازاروں میں بے پناہ دولت، قیمتی اثاثے اور وافر وسائل کا تقابل یورپ کے کسی بھی امیر ترین تجارتی مرکز سے کیا جاسکتا ہے۔''

لیکن آج ہمیں پانی کی انتہائی قلت کا سامنا ہے اور یہ بنیادی طور پر ہماری منصوبہ بندی اور روز افزوں شہری کثافتوں کے ساتھ آپس میں امن سے رہنے کی نا اہلیت کی مرہونِ منت ہے۔ آج اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ ہم لاہور کے تحفظ کی منصوبہ بندی کریں تا کہ ہماری تاک میں منتظر انہونی سے کماحقہ نبرد آزما ہوسکیں۔ ہمیں شہری انحطاط کی رفتار کو روکنا ہوگا اور ماضی میں جو کچھ وقوع پذیر ہو چکا ہے اس سے سبق حاصل کرنا ہوگا۔

یہ تو ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ قدیم شہر کئی بار تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ تقریباً زمین بوس ہوتا رہا، لیکن ہر مرتبہ بازیاب ہوا اور عوام کی مہربانوں سے پہلے سے کہیں بڑھ کر بڑا شہر بنتا رہا۔ محمود غزنوی نے اس کو لُوٹا۔ منگولوں کے سنہری لشکروں نے شہر کی فی الواقع اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بھاٹی گیٹ کے بہادر بھٹ راجپوتوں سے گھمسان کی جنگ کے بعد بابر نے شہر کو آگ لگا دی تھی۔ جب انگریزوں نے سکھوں سے قبضہ واگزار کرایا تو ایک آفیسر نے اپنے تاثرات میں لکھا۔ ''میں نے لاہور شہر کے کھنڈرات کا معائنہ کیا جو شکست خوردہ عظمت کا نہایت اندوہناک منظر پیش کر رہے تھے۔ چاروں جانب سناٹے، سکوت، اور تاریکیوں کا راج تھا۔''

آج راوی کے کنارے کھڑے ہوئے بعینہٖ ویسے ہی محسوس ہوا اور میں نے دریا کی گزرگاہ کے بیچوں بیچ پیدل چلنے کا فیصلہ کیا، جو اَب ٹھوس ریتلا میدان تھا۔ جہاں سوائے چند بھینسوں کے جو ایک اتھلی ندی میں لوٹنیاں لگا رہی تھیں، جسے کبھی دریائے راوی کہتے تھے، کچھ بھی دیکھنے کو نہ تھا۔ البتہ ریت کھودنے والوں کے، جو دیدوں

کے مطابق ''مقدس دریا'' کی بدنصیبی سے بھی اپنا رزق کمار ہے تھے۔ ہر لاہوری کے لئے یقیناً یہ مقدس ہونے سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہ لاہور کو زندگی مہیا کرنے والا ہے۔ قدرتی طور پر ذہن میں سوال اٹھتا ہے۔ ''کیا کبھی لاہور اپنے قدموں پر دوبارہ کھڑا ہوگا؟'' یہ تحریر اسی سوال کے بارے میں ہے جس پر ہمیں آج فکر مند ہونا چاہیے اور جس کے بارے میں آپ سب کو بھی کہتا ہوں کہ آپ بھی، اپنے آپ سے پوچھیں۔

ازلی امید پرست ہونے کے ناطے میں محسوس کرتا ہوں کہ ایک شہر کی حیثیت سے ہم اس درجہ گہرائیوں میں گر چکے ہیں کہ اب دوبارہ ابھرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں اور یہی ہمارے شہر کی تاریخی روایت رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیسے وقوع پذیر ہوگا؟ کون ایسا کرے گا؟ کون راہنمائی دکھائے گا؟ ان تمام خدشات کا ہمیں کھلے ذہن سے جائزہ لینا ہوگا۔

یہاں یہ بتاتا چلوں، جو موضوع سے ہٹ کر نہیں کہ ایک قدیم روایت چلی آتی ہے کہ ''ہر بار جب دریائے راوی کو شہر کا مرکز بنایا جاتا ہے تو لاہور سربلند ہوتا ہے۔'' یہ عجیب وغریب مقولہ ہے، لیکن اگر ہم اس کا تجزیہ کریں تو آخر سکھوں نے گرتے ہوئے شہر کو کیسے سنبھالا دیا تھا اور انگریزوں تک نے اس کا بندوبست کس طور کیا؟ تو ہم پر آشکار ہوگا کہ دریائے راوی کا اس کھیل میں نہایت اہم کردار رہا تھا کہ شہر کی منصوبہ بندی کس طرح کی گئی۔

لاہور کے ترقیاتی ادارے ایل ڈی اے کی کسی پرانی الماری میں ایک منصوبہ دھرا ہوگا جو انہیں لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ سے حاصل ہوا تھا اور جو انہیں عہدِ برطانیہ سے تفویض ہوا تھا۔ یہ لاہور کے مستقبل کے بارے میں تھا کہ لاہور کو ترقی پذیر ہو کر کس صورت میں اکیسویں صدی میں داخل ہونا تھا۔ اب تو اکیسویں صدی چڑھ چکی ہے تو عقلی تقاضا ہے کہ اس منصوبے کے اساسی نکات کو عوامی بحث کے لئے زیرِغور لایا جائے۔ ہم لاہوریوں کو ان مباحث میں ضرور حصہ لینا چاہیے کہ آئندہ زمانے میں ہمارے شہر کا کیا بننے والا ہے۔ کیونکہ اگر ہم لاہوریوں کو اپنے بچوں اور اُن کے بچوں کو اس شہر میں رہنے کے لیے کوئی معقول جگہ وراثتاً دینی ہے تو ہمیں ان مباحث میں ضرور شرکت کرنا چاہیے جن میں یہ فیصلے ہو رہے ہوں کہ آئندہ برسوں میں لاہور کیسی شکل وصورت دھار لے گا۔ لیکن ایسی صورتِ حال میں ہم کیا کریں جب مقامی حکومت اس شہر کی ایک چھوٹی سی آبادی ''ماڈل ٹاؤن سوسائٹی'' کو کام ہی نہ کرنے دے۔ جہاں سکون برباد کرنے والی، ماحول میں خلل ڈالنے والی بدنما اور یقیناً غیر قانونی دفتری اور کاروباری عمارتیں جابہ جا نمودار ہو رہی ہیں وہ بھی اس آبادی میں جسے شہروں کی توسیع اور منصوبہ بندی کی دنیا میں کبھی ''ماڈل ٹاؤن'' کہا جاتا تھا۔ اس طریقِ کار کو لازماً مخالف سمت میں لے جانا ہوگا اور یہ جس قدر جلد ہو اسی قدر بہتر ہوگا۔

لاہور کی ترقی کے اس منصوبے میں خیالی طور پر دریائے راوی کے دونوں اطراف بہت بڑے بڑے

بند بنتا تھے جو دریا کے نشیبی بہاؤ کے ساتھ ساتھ بیس میل کے بعد ایک بیراج پر ختم ہوتا تھے۔ جہاں موسمِ برسات میں دریائی پانی کا ذخیرہ کرنے کے لئے ایک وسیع وعریض جھیل بنتا تھی۔ یہ بیس میل لمبی اور ایک میل چوڑی جھیل لاہور شہر کا مرکز ہوتا تھی۔ اس سے مشرقی جانب شہر کا پھیلاؤ رک جانا اور اندرونِ شہر کو مرکزی مقام مل جانا تھا اور شہری منصوبہ بندی کے ماہرین کو تجارتی اور رہائشی علاقوں کی واضح اور صحیح منصوبہ بندی کھلے ذہن سے کر سکنے کا ایک مثالی موقع مل جاتا۔ کشادہ شاہراہوں کے ساتھ ساتھ تجارتی اور رہائشی علاقوں کی واضح حدود بندی کو لازماً متعین کرنا ہوگا اور جب یہ منصوبے وسیع پیمانے پر نافذ العمل ہو رہے ہوں تو مقامی منتخب حکام کو چاہیے کہ گھیراؤ میں آئے ہوئے شہر کے بقیہ رہائشی علاقوں میں بھی رہائشی اور تجارتی علاقوں، جیسے گلبرگ، ماڈل ٹاؤن، سمن آباد اور لاہور کے دیگر ہر ایک علاقے کی حد بندی پر سختی سے عمل درآمد کرائیں۔

بلاشبہ قانون کی بالادستی ہر سُو ہونی چاہیے اور ایسا تب ہی ممکن ہے جب ہم ایسے ذمہ دار منصوبہ ساز بن جائیں جن کی نہ صرف تاریخ پر نظر ہو بلکہ جو اس متوازن نقطۂ نظر کو بھی پیشِ نظر رکھیں کہ آخر لاہور کا قدیم شہر کس مقصد کی ترجمانی کرتا ہے، تب ہم اپنی غلطیوں کا ازالہ کر سکتے ہیں۔

●○●○●○●

گم گشتہ پتّن کشتیوں کا معاملہ

ایک وقت تھا، اور یہ زیادہ عرصے کی بات بھی نہیں، جب گرد آلود سڑکوں پر رواں دواں شہر کی حدود سے باہر نکلتی ہوئی گھوڑا گاڑیوں اور بیل گاڑیوں کے علاوہ وسیع پیمانے پر مسافروں اور مال اسباب لانے لے جانے یعنی نقل و حمل کے نظام کا بوجھ سنبھالنے کا ذریعہ دریائے راوی ہی تھا۔ لگتا تو عجیب ہے لیکن جس طرح آج کل لاہور ریلوے سٹیشن اتار چڑھاؤ کا مرکزی مقام ہے، اسی طرح اس زمانے میں خِضری دروازہ یا شیرانوالہ دروازہ اس حیثیت کے حامل تھے، کیونکہ انہی مقامات پر پتّن کشتیاں رُکا کرتی تھیں۔

دریائے راوی سانپ کی طرح بل کھاتا، شہر کی فصیل کے گرداگرد بہتا ہوا، خِضری دروازے کو چھوتا تھا۔ تقریباً ڈھائی سو برس پہلے جب دریا نے بہاؤ کے لئے نئی گزرگاہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تو پتّن کشتیوں کا گھاٹ بیکار ہو گیا۔ دریا کا رخ مغرب کی جانب ہو گیا تقریباً اسی جگہ جہاں اس کی موجودہ گزرگاہ ہے۔ شہر کے گرداگرد واقع خندق کو پانی کے اس دھارے سے بھرا جانے لگا جو بعد ازاں ''بڈھا راوی'' یا ''پرانا راوی'' کہلایا۔ جلد ہی یہ سرچشمہ بھی مزید احسان کرنے سے منکر ہو گیا تو پھر انگریز اس خندق کو پانی سے بھرتے رہے۔ جن وجوہ کی بناء پر اس خندق کو پانی سے بھرا جانا تھا اس کے بارے میں دو روایات بیان کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں نے یہ سبق سیکھا کہ بڑے بڑے شہروں کو ناقابلِ حفاظت کر دیا جائے۔ دوسری یہ کہ خندق خشک ہوتی جا رہی تھی چنانچہ بہتر احساسِ صحت و صفائی کے مدِنظر اسے پانی سے بھر کر بیماریوں کے پھیلاؤ کو روکا جائے۔ انگریزوں نے دوسری ترجیح کی حوصلہ افزائی کی۔

خِضری دروازے کا نام خواجہ خضر سے مشتق ہے جو ماہی گیروں اور ملاحوں کے روحانی پیشوا ہیں۔ جب خندق غائب ہو گئی تو نام بھی جاتا رہا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ فصیلِ شہر اور اس کے اندر رہنے والوں کی معاشرت کے بارے میں، جو صدیوں پر محیط ہے، کچھ زیادہ تحقیقی کام نہیں ہوا۔ عہدِ موجود کے بہت سے لوگ اس بات پر بمشکل یقین کریں گے کہ ماضیٔ قریب میں شہر کے ایک معتدبہ حصے کو کشتی رانی کے ذریعے آنے جانے کی سہولت

حاصل تھی۔ گلیوں کے نام، اُن کے اردگرد مختلف پیشہ ور اہلِ حرفہ کے ٹھکانے، گوداموں کی بھرمار، بڑی بڑی منڈیوں کے محلِ وقوع، بنیادی ڈھانچے وغیرہ، ان سب کی نشوونما، کشتیوں ہی کے طفیل تھی۔

جس طرح تمام عظیم شہر ایک بڑے دریا کے کنارے واقع ہیں، اسی طرح لاہور بھی دریائے راوی اور اس کی ارضی سطح کی بدولت آباد ہوا اور پھر پھیلتا چلا گیا۔ ٹیلہ اور دریا، شہر کے جسم اور روح تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی شاہراہوں اور نقل وحمل کے نت نئے طریقوں نے اُس کی جگہ لے لی۔

لاہور کی اصل عمارتی لکڑی کی مارکیٹ شاہی قلعہ کے مشرقی جانب ایک وسیع وعریض میدان میں واقع تھی۔ آج کل ٹرکوں کے دُھرے اور ٹائروں کے رِم فروخت کرنے والے تاجر اس جگہ پر قابض ہیں۔ کسی زمانے میں زیادہ تر کشتیاں اسی مقام پر بنائی جاتی تھیں۔ آج بھی اس دروازے کے آس پاس کے علاقوں میں نجّاروں، ترکھانوں اور بڑھیوؤں کی بہت بڑی تعداد رہائش پذیر ہے۔ گلیوں کے نام بڑے دلچسپ ہیں جیسے ''لُک والی گلی'' یا ''ٹارلین'' کیونکہ یہاں کشتیوں کو پانی سے محفوظ رکھنے کے سامان کی دکانیں واقع تھیں۔ لندن میں بھی ایک ''ٹارلین'' ہے جس کی تاریخ بھی ایسی ہی ہے۔ ذرا دُور شہر کے اندر جائیں تو ''رسہ منڈی'' ہے، جہاں سے کشتیوں کو رسّے مہیا کیے جاتے تھے۔ شیرانوالہ دروازے کے اندر اکبری کی طرف جاتے ہوئے راستے میں پڑنے والی اس گلی کا، جو بائیں جانب بل کھا جاتی ہے، نام ''سوتر منڈی'' ہے یعنی دھاگے کی مارکیٹ۔ جہاں اُن کھڈیوں کے لیے دھاگا فروخت ہوتا تھا جو بادبانوں کے لیے کپڑا بُنتی تھیں۔ آج بھی بادبانی کپڑے کی جگہ ہمیں کھدر بُنتی ہوئی لکڑی کی کھڈیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ''موجِ دریا'' اور ''محلّہ نیلیاں'' جیسے نام اسی عہدِ گذشتہ کی نشاندہی کرتے ہیں، جب لاہوریوں کی زندگیوں میں کشتیوں کا ایک اہم مقام ہوا کرتا تھا۔

دریا کے پرلے کنارے پر بادامی باغ واقع ہے۔ یہیں کشتیاں بنانے والے رہائش پذیر تھے۔ یہاں سے لے کر مغلپورہ تک، جہاں کبھی دریائے راوی خم کھاتا تھا، چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے جہاں ماہی گیر رہتے تھے۔ شمال کی جانب راوی کے دریائی جنگل تھے، جہاں کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں برصغیر کے سفاک ترین ڈاکو رہا کرتے تھے۔ جب ان کا پیچھا کیا جاتا تھا تو وہ اپنی کشتیوں میں سوار ہو کر دریا کے پار فرار ہو جاتے اور شیخوپورہ کے جنگلوں میں غائب ہو جاتے تھے۔

اِن پتّن کشتیوں کی شکل صورت کیسی تھی؟ اس دور کی کوچک نقاشی اور غیر ملکی سیاحوں کی تصویر کشی میں جن کشتیوں کا بیان ہوا ہے وہ ہُوبہُو ایسی ہیں جیسی موجودہ دور میں بھی۔ مصر میں دریائے نیل میں تیرتی ہیں۔ ان کشتیوں کی دریائے راوی میں آمدورفت جاری رہتی تھی اور یہ گرم مسالے اور دیگر غیر ملکی اشیاء لاتی رہتی تھیں۔ لاہور میں عرصۂ دراز تک ایسی اشیاء کی ایک بہت بڑی منڈی قائم رہی اور یہاں سے دساوری مال اردگرد کے دیگر شہروں کو مہیا کیا جاتا رہا۔

ہماری توجہ اس اہم نکتہ پر مبذول ہوتی ہے کہ پتّن کشتیوں سے ہی راوی کے ماہی گیروں کی زندگی عبارت تھی۔ ان کی پکڑی ہوئی مچھلیوں کو بہترین ذائقے کی وجہ سے اساطیری حیثیت حاصل تھی۔ دیگر قسموں کے علاوہ ان کی ''رہو'' اور ''کھگا'' مچھلیاں مشہورِ عام تھیں۔ یہ تازہ پانی کی مچھلیاں، کثافتوں اور ہندوستان کے ساتھ دریاؤں کے معاہدہ کی بنا پر، اب تقریباً ختم ہو چکی ہیں۔ اس معاہدے نے تو ہمارے مقدس دریا کے مکینوں سے سارا پانی ہی چھین لیا ہے۔ دریا بھی جاتا رہا اور کشتیاں بھی ختم ہو گئیں۔ آج کوئی بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ کبھی ہمارا یہ شہر دریا کے آر پار آباد تھا ___ اور آج ہمیں یہ بھی علم نہیں کہ جو کچھ اس کا بچا کھچا ہے اس کو کیسے کارآمد بنایا جائے۔

●○●○●○●

گمشدہ کشتیوں کا پُل

برطانوی دور میں لاہور سے پشاور تک ریل کی پٹڑی بچھانے کے سلسلے میں دریائے راوی کے آر پار پہلا پُل تعمیر کیا گیا۔ ذرا سوچیے اس سے پیشتر حملہ آور افواج، اپنے گھوڑوں، بار برداری کی گاڑیوں، توپوں اور دیگر متفرق بھاری بھرکم جنگی ساز و سامان دریائے راوی کے آر پار لانے لے جانے کا بندوبست کیسے کرتی تھیں؟ بے شک یہ ایسا سوال ہے جو ہر لاہوری کے ذہن میں ضرور آیا ہوگا۔ چند سال پیشتر فقیر سیّد اعجاز الدین نے ایک فرحت بخش کتاب بعنوان ''لاہور یاد آوردہ'' شائع کی ہے جس میں جے ایچ فرنو کی 1895ء میں شائع شدہ کتاب ''ہندوستان کی جھلکیاں'' میں سے لاہور کے ''کشتیوں کے پُل'' کی ایک تصویر مکرر شائع کی ہے۔ اگر کوئی شے میری تصوراتی جستجو کو، کہ شاہدہ ریلوے پُل کی تعمیر سے پہلے دریا کے پار کیا منظر تھا، بآسانی مطمئن کر سکتی تھی تو وہ یہی تصویر ہے۔ میں نے لاہور شہر کا ایک پرانا نقشہ دیکھا تھا جس میں لاہور کے کشتیوں کے پرانے پُل کا مقام نشان زدہ تھا۔

اس نقشے میں اس مقام کو نقطوں کی ایک لکیر سے ظاہر کیا گیا تھا۔ بہرحال اعجاز الدین کی کتاب میں اسی قدر دلچسپ لاہور کے ایک پرانے نقشے میں کشتیوں کا پرانا پُل اور اس کا بالکل درست مقام دکھایا گیا ہے۔ اس سے مجھے تحریک ہوئی کہ میں اس پرانے پُل کے باقی ماندہ حصے کے سراغ کو تلاش کرنے کی کوشش کروں اور ساتھ ہی ساتھ اس پرانی سڑک کا بھی کھوج لگانے کی کوشش کروں جو راوی کے اصلی پُل تک جاتی تھی۔

اپنی اس چھوٹی سی مہم جوئی کے بیان سے پہلے ناموزوں نہ ہوگا اگر میں ولیم مُور کرافٹ کے وہ الفاظ دہرا دوں جو اس نے 14 مئی 1820ء کے روز دریائے راوی کو عبور کرتے وقت کہے تھے: ''شاہدرہ تک جانے والی سڑک کو دریائے راوی کے تین دھارے قطع کرتے ہیں جو خشک موسم میں آدھے آدھے میل کے درمیانی فاصلے سے بہتے ہیں۔ لیکن موسمِ برسات میں مشرقی جانب والے دونوں دھارے آپس میں مل جاتے ہیں اور ایک وسیع اور تیز ندی کا روپ دھار لیتے ہیں۔ پہلے دو دھارے قابلِ عبور ہیں لیکن تیسرے اور سب سے بڑے

دھارے کو عبور کرنے کے لیے پتّن کشتیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔''

واضح رہے کہ مغربی جانب والے حصے میں ہمیشہ دریا کا بڑا بہاؤ رہا۔ مشرقی جانب والے دونوں حصے موسمِ برسات ہی میں دھارے کا حصہ بن پاتے تھے۔ آج یہ حصے ''بڈھاراوی'' کہلاتے ہیں، جبکہ ایک حصہ اب بھی، اگرچہ بے حد کثافت آلود، دریائے راوی میں گرتا ہے۔ یہ آخری حصہ اس مقام پر ہے جہاں کبھی فصیلِ شہر کے اردگرد دریائے راوی بہا کرتا تھا۔ اس کے بڑے بڑے حصے اب بھی شہرِ قدیم کے گرد دیوار کے ساتھ ساتھ بہتے ہیں۔ اگر آپ جغرافیے کے طالب علم ہیں تو آپ فوراً صاد کریں گے کہ مشرقی جانب والا حصہ دریا کا اصل بہاؤ ہے اور حالیہ گزرگاہ اس کی قدرتی طور پر تبدیل شدہ گزرگاہ ہے۔

1867ء کے ایک برطانوی نقشے میں ''کشتیوں کا پُل'' دکھایا گیا ہے جو راوی کے دونوں کناروں کو ''مرزا کامران کی بارہ دری'' کے مقام پر ملاتا ہے۔ نقشے میں اس مقام کو ''ترگر والی بارہ دری'' بتایا گیا ہے۔ ''ترگر والی'' لفظ ''تارگر والی'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یا تو یہ وہ مقام جہاں انگریزوں نے پہلا ٹیلیگراف آفس قائم کیا تھا یا یہاں کشتیوں کے پُل کے رسّے یا لوہے کے موٹے تار ''وائر'' باندھے جاتے تھے۔

دریائے راوی پر ریلوے کے پُل بننے سے قبل پُلوں کی تعمیر کرنے والے محکمے کے ایک برطانوی سپرنٹنڈنٹ کو بارہ دری میں تعینات کر دیا گیا تھا۔ وہیں اس کی رہائش کا بندوبست بھی تھا۔ بعد ازاں اس جگہ کو، ایچ آر گولڈنگ کے مطابق، ''پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ (پی ڈبلیو ڈی) ریسٹ ہاؤس'' کا درجہ دے دیا گیا۔

پنجاب کو اپنی عملداری میں شامل کرنے کے ساتھ ہی انگریزوں نے فوجیوں اور تجارت کی نقل و حمل بہتر کرنے کے لیے پورے ملک کے تمام دریاؤں پر عارضی طور پر کشتیوں کے ساتھ ساتھ پکے پُل تعمیر کرنے شروع کر دیئے تھے۔ دریائے راوی پر پہلے سے موجود کشتیوں کے پل کو اپنی طرز کا بہترین پُل قرار دیا گیا اور اسے نمونے کے طور پر پُلوں کی آئندہ تعمیر کے لیے منتخب کیا گیا۔ جیسا کہ ایک تحریر میں درج ہے۔ اسی سے قوی امکان پیدا ہوا کہ 1849ء میں پنجاب پر برطانوی تصرّف سے قبل دریائے راوی پر کشتیوں کا پل پہلے سے موجود تھا۔

سکھوں کے دور کے بے شمار حوالے موجود ہیں جن میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کو دریائے راوی کو گھوڑے پر عبور کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔ یہ ذہن میں لاتے ہوئے کہ چونکہ اس کو فرانسیسی انجینئروں کی مدد میسر تھی اس لئے ممکن ہے کہ انہوں نے ہی اپنی افواج کو تیزی کے ساتھ دریا کو عبور کرنے کی سہولت مہیا کرنے کی غرض سے یہ کشتیوں کے پُل تعمیر کیے ہوں۔ بہرحال مُورکرافٹ 1820ء میں پتّن کشتیوں کے وجود کا ذکر کرتا ہے۔ یہ فرض کرنا بالکل درست ہوگا کہ کشتیوں کے جس پُل کا ذکر انگریزوں نے 1854ء میں ''پرانے کشتیوں کے پُل'' کے طور پر کیا ہے، صریحاً یہ واضح کرتا ہے کہ یہ پُل برطانیہ کے لاہور کو اپنی عملداری میں شامل کرنے سے پہلے اپنا وجود رکھتا تھا۔

ان تمام دلچسپ نشانیوں نے مجھے دریا کے دونوں کناروں پر پرانے کشتیوں کے پُل کا سراغ لگانے کے لیے ایک دشوار گذار راستے پر پیادہ پا چلنے پر اکسایا۔ میں راوی پارک اور مومن پورہ کے شمالی حصوں میں پیدل گزرا، تا کہ وہ مقام دیکھ سکوں جہاں کشتیوں کی فرودگاہ ہوا کرتی تھی۔ جس طور سے سڑکیں دریا تک جاتی تھیں اس سے یقیناً ایک حقیقت ضرور سامنے آتی ہے کہ وہ سب راوی پارک کے جنوب میں ایک مقام پر مرتکز ہو جاتی تھیں۔ اس علاقے کے لوگ اب بھی اس جگہ کو ''پُل موڑ'' کے نام سے پکارتے ہیں یعنی پُل پار کرنے کا راستہ۔ اگرچہ ریلوے کا پرانا پُل شمال کی جانب آدھے میل کے فاصلے پر ہے۔ بعدازاں راوی روڈ پر بھی دریا پار کرنے کے راستے کو اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ نشاندہی مجھے مومن پورہ سے ہوتے ہوئے حالیہ بند روڈ کے کنارے تک لے گئی۔ بغیر کسی مناسب منصوبہ بندی کے ایک جنونی انداز میں تعمیرات نے لاہور کو جو موجودہ بے ڈھنگی شکل عطا کر دی ہے، اس کی وجہ سے پرانے کشتیوں کے پُل کے تمام سراغ مٹ چکے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ کشتیوں کے خشکی پر چڑھنے کے لیے وقف میدان موجودہ بند روڈ کے کہیں نیچے دفن ہو چکا ہے۔

راوی کے دوسری جانب شاہدرہ ہے۔ پرانی سڑک یقیناً بل کھا کر کامران کی بارہ دری کے بالمقابل ایک مقام پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ جگہ بھی ''پُل موڑ'' ہی کہلاتی ہے۔ چنانچہ یہ تو واضح ہو گیا کہ ''بارہ دری'' ایک زمانے میں دریائے راوی کے مغربی کنارے کا حصہ تھی۔ اس جزیرے پر کشتیوں کے پُل کے مبینہ نشانات موجود ہیں، جن میں اینٹوں کے بنے ہوئے دو ٹھوس ڈھانچے شامل ہیں جو اب بھی مشرقی کنارے کی سطح پر موجود ہیں۔ ان ڈھانچوں پر غالباً پرانے راوی پُل کے رسّے یا لوہے کے تار باندھے جاتے ہوں گے۔

اِن ڈھانچوں کا موقع نقشے میں بالکل ٹھیک بیٹھتا ہے۔ ریل کی پٹڑی اور شاہراہ سے دُور واقع ہونے کی بنا پر کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اسے ''تار گھر'' کیوں کہا جائے سوائے یہ کہ یہ ڈھانچے لاہور کے پرانے کشتیوں کے پُل کے مقامِ آغاز اور اختتام کی نشاندہی کے لیے استادہ ستون ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پہلی مرتبہ ٹیلیگراف کی لوہے کی تاریں راوی کے پار لے جانے کے لیے کشتیوں کے پُل کے ساتھ ساتھ بچھائی گئی ہوں اور ان کا انتظام پرانے تار گھر سے ہی کیا جاتا ہو۔ لاہور کے گمشدہ کشتیوں کے پُل کی کہانی مزید تفصیل سے سنانے کی ضرورت ہے، کیونکہ یہ قدیم شہر کے ہمیشہ زندہ رہنے والے رازوں میں سے ایک ہے۔

●○●○●○●

کچا کوٹ جو لاہور بن گیا

قدیم ترین اور اصلی لاہور شہر کے نقطۂ آغاز یا ابتدائی مقامِ آفرینش کے بارے میں ہماری تلاش میں بے شمار نشیب و فراز آئے ہیں۔ اس کے زمانے کا تعین 2000 قبل از مسیح کے آغاز سے پیشتر ہو سکتا ہے۔ کم از کم آثارِ قدیمہ سے متعلق قلعہ لاہور کی کاربنی تعینِ زمانہ کی تحقیق سے برآمدی نتائج کے ثبوت، اسی زمانے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ہمیں بہت سے ذرائع سے معلوم ہے کہ لاہور کے کئی نام تھے جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے، لیکن ایک نام ''کچا کوٹ'' ایسا ہے جس کے بارے میں تحقیق واجب بنتی ہے۔ قدیم ترین اصل لاہور شہر کے ابتدائی شہر کے کم از کم دو مقامات ایسے ہیں جو ممکنہ حد تک قدیم ترین اور اصلی لاہور کے مقامِ آفرینش ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک ''محلّہ موہلیاں'' ہے۔ آیئے اس تحریر میں ہم اس علاقے کا تفصیلی جائزہ لیں۔ اگر ہم لوہاری دروازے کے اندر ''سوتر منڈی'' یعنی دھاگے کی مارکیٹ کو مرکزِ نگاہ بنالیں تو ہمیں ایسا محسوس ہوگا کہ ہمیں گوہرِ مقصود مل گیا۔ سوتر منڈی کا نام کبھی ''محلّہ چیلیانوالہ حمام'' ہوا کرتا تھا اور کبھی ''مچھلی ہٹہ گلزار'' کہلانے والے علاقے میں واقع تھا جو چوک چکلّہ، یعنی لاہور کے اصلی پرانے قحبہ خانوں کے علاقے سے تھوڑی دور ہے۔

مفتی تاج الدین، جو مشہور مفتی امام الدین کے بیٹے ہیں، کے ایک معتبر گواہ کے مطابق 1864ء کے سال تک لوہاری منڈی کا علاقہ اندرون شہر کے بزرگ حضرات میں ''کچا کوٹ''، یعنی ''گارے کا قلعہ'' کے نام سے معروف تھا۔ یہ علاقہ ''گارے کا قلعہ'' کیوں کہلاتا تھا جبکہ ہمیں علم ہے کہ قلعہ لاہور کی اصل دیواریں، اکبرِ اعظم کے دور سے بھی پیشتر، گارے ہی کی بنی ہوئی تھیں۔ یہ سوال ہے جس کی تحقیق طلب ہے۔

اس بات کو طے کرنے کے لیے لازم ہے کہ ہمیں پرانے شہرِ حصار کو دیکھنے کے لئے جانا ہوگا۔ افقاً ڈھلوان زمین کو بغور دیکھنا ہوگا۔ پانی کے بہاؤ (نالیاں، نالے ڈھلوان اور سمت تعین کرنے میں بہترین راہنمائی کرتے ہیں) کو دیکھنا ہوگا اور یہ مشاہدہ کرنا ہوگا کہ ''محلے''، ''کوچے''، ''کٹڑے'' کس طرح تعمیر کئے گئے ہیں۔

ہر اتوار کے روز یہ میرا من پسند تفریحی مشغلہ ہے۔ چوک سوتر منڈی پر کھڑے ہو کر اگر آپ گلی پیر بولا کے اس موڑ کو غور سے دیکھیں جہاں یہ وچھووالی بازار میں ضم ہو جاتی ہے اور پھر لوہاری بازار کو بھی جب وہ چوک لوہاری منڈی میں اور بالآخر چوک متی میں جہاں یہ پاپڑ منڈی میں ضم ہو جاتی ہے۔ آپ آنکھیں بند کریں اور اپنے آپ کو 3500 برس پیچھے لے جائیں تو آپ کے تصور میں ایک چھوٹا سا گارے کا قلعہ اور اس کی تھوڑی سی آبادی اُبھر آئے گی۔ موقع اور محل بہترین ہے۔ جب آپ آنکھیں کھول لیں تو یہ وقت ہے مشاہدہ کرنے کا، یا یہ تلاش کرنے کا کہ مٹی گارے کے قلعہ کی کوئی مصدّقہ نشانی مل جائے۔

اگر آپ لوہاری بازار کے کنارے کنارے پیدل چلتے جائیں تو چکلّہ چوک (ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ اس خوبصورت جگہ کے نام کو ایک متضاد پاکیزہ نام ''چوک بخاری'' سے موسوم کر دیا گیا ہے) سے تھوڑے سے فاصلے پر دائیں ہاتھ آپ دیکھیں گے کہ گلی کچھ کشادہ ہو گئی ہے۔ کیونکہ داہنے جانب گارے اور پکی اینٹوں کی بنی ہوئی ایک محرابی ڈیوڑھی آدھی زمین میں دھنسی ہوئی دکھائی پڑتی ہے۔ کیا یہ ان وقتوں سے چلی آ رہی ہے جب لاہور گارے کا قلعہ ہوا کرتا تھا؟ بہرحال یہ ثبوت اس جانب دھیان ضرور دلاتا ہے کہ ہو سکتا ہے اس زمانے میں چھوٹے سے قدیمی ''کچے کوٹ'' میں داخلے کے لیے یہ ایک محرابی ڈیوڑھی رہی ہو یا پھر رات کو قفل سے بند کرنے والا صدر پھاٹک۔ بہرحال یہ ایک ایسی جگہ تھی جو بعد ازاں کشادہ ہوتے ہوتے ایک روز لاہور شہر کا روپ دھار گئی۔

یہ بھی ممکن ہے اور ہمیں کسی بھی ممکنہ امکان کو خارج نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ وہ مشہور گارے کا قلعہ تھا، جو لاہور کے پہلے مسلمان گورنر ملک ایاز نے تعمیر کیا تھا۔ یہ بالکل ممکن ہے کیونکہ تاریخ میں رقم ہے کہ لاہوری دروازہ، ایاز کے گارے کے قلعے میں داخلے کا سب سے بڑا راستہ تھا۔ چنانچہ اس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ مرقوم تاریخ کا تجزیہ کس طرح کرتے ہیں۔ ایک امر طے ہے کہ چوک سوتر منڈی ''کچے کوٹ'' کا ایک اہم مرکز تھا۔ گلیوں کی بچھاوٹ بھی سرحدوں کا تعین کرتی ہے۔

ایک سابقہ تحریر میں بھی ہم اسی طرح کے ایک اصولی مسئلے کو عقلی دلائل کی رُو سے حل کر چکے ہیں کہ مغل بادشاہ اکبر کے زمانے میں اندرون شہر، لاہور کی اصل دیوار، مغربی جانب، بھاٹی دروازے کے بازار حکیماں کے دائیں جانب اور مشرقی جانب شاہ عالمی دروازے کے بائیں جانب واقع تھی، جو پھر مشرقی جانب بل کھاتی ہوئی دریائے راوی کے بہاؤ کی وجہ سے شہر کی شکل ایک گُردے کے مشابہ بناتی تھی۔ چنانچہ ''کچا کوٹ'' کے زمانے سے لاہور شہر، تین بار، چار چار سو برسوں کے وقفوں سے اپنے حجم میں کشادگی کے عمل سے گزرتا رہا ہے۔ یہ بڑی نمایاں کشادگیاں، راجہ جے پال، اکبرِ اعظم اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ادوارِ حکومت میں ہوئیں۔

لیکن یہ بے پایاں کشادگی یقیناً تین حقائق پر مبنی تھی۔ یعنی (الف) جس طرف راوی کا بہاؤ رہا اور وہ

کب اور کیسے اپنی گزرگاہ بدلتا رہا۔ (ب) لاہور کے قلعہ کا وجود اور اقتدار حکمرانوں میں کس طرح منتقل ہوتا رہا اور (ج) جس طور سے لاہور کی اصل اندرون شہر کی آبادی اور معیشت، جوار دگرد کے دیہات میں بیرونی حملوں، غذائی قلت اور قحط پر منحصر تھی، وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہی۔ کبھی یہ پھیل جاتی اور کبھی سکڑ جاتی۔ ''کچا کوٹ'' کی کہانی ان ہی حقائق سے تشکیل پائی ہے۔

ان گلیوں میں سے گزرتے ہوئے ہمیں پختہ یقین ہو جاتا ہے کہ پورے اندرون شہر میں سب سے قدیم عمارات اسی علاقے میں واقع ہیں۔ جب ہم قدیم شاندار مسجد کے، جو آج بھی مسجد کہنہ حمام چیلیانوالہ کہلاتی ہے، قریب سے گزرتے ہیں تو ہمیں یاد آتا ہے کہ کبھی اس پورے علاقے کا یہی نام تھا۔ یہاں کبھی ایک بہت بڑا ''حمام'' ہوتا ہوگا۔ پیر بولا کا مزار یہیں واقع ہے جس کو ''گلی'' کہتے ہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ ہم علاقوں، گلیوں حتیٰ کہ شہروں تک کے نام تبدیل کرنے کے خواہاں رہتے ہیں۔ جیسے ایک لمحے میں ہم نے وقت پر اخلاقی اقتدار کی مہر ثبت کرنی ہو۔ ہر قسم کے حکمران ہماری تاریخ میں دخیل ہونا چاہتے ہیں۔ لہٰذا بہترین حل یہی ہے کہ تاریخ کو آرام کرنے دیا جائے اور یہ اسی وقت اُٹھ پائے جب مناسب وقت حکم دے۔ یہ غلط تصور نہ ہوگا اگر پورے اندرون شہر کو ''حفاظتی حصار کا علاقہ'' قرار دے دیا جائے۔ ''کچا کوٹ'' کا جو کچھ پسماندہ ہے اسے مستقبل کے لیے رکھ چھوڑیں۔ گارے کا قلعہ جو بالآخر لاہور کا اندرون شہر بن گیا۔

●○●○●○●

سیتا اور اشوک کے بارے میں

بہت سے پکے لاہوریوں کے لیے یہ حیرت کی بات ہوگی کہ اندرونِ شہر ان کی سوچ سے کہیں زیادہ قدیم تر ہے۔ اس نے بہت سی تخلیقی تحریکات کو جنم دیا ہے۔ چند عظیم مذہبی تحریکات کی یہ جائے آفرینش رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے اصل باشندے عقیدے کے معاملات میں خاصے مطمئن واقع ہوئے ہیں۔

لاہور کا نقطۂ آغاز اسی قدر پرانا ہے جس قدر دائمی وقت کا آغاز۔ پانچ ہزار برس سے بھی قبل مشہور شاعر والمکی نے مشہور ہندو رزمیہ ''رامائن'' لاہور ہی میں نظم کی تھی۔ اس رزمیہ میں حاملہ سیتا کو دوسری مرتبہ دیس نکالے جانے کے دوران راوی کے کنارے علاقے میں رہائش پذیر بتایا گیا ہے جہاں دریائے راوی ایک ٹیلے کے گرد بل کھاتا ہوا بہتا ہے، جو صدیوں سے آباد چلا آتا ہے۔ تحقیق سے ظاہر ہوا کہ سیتا کے بیٹے ''لوہ'' یا لاہو'' نے اسی ٹیلے پر پرورش پائی جو بعد ازاں اسی کے نام ''لاہور'' سے موسوم ہوا۔ اس بارے میں ہمیشہ سے اختلافِ رائے رہا ہے کہ سیتا اس ٹیلے پر یا لاہور شہر میں، قطعی طور پر کس مقام پر رہائش پذیر رہی؟ ایک نقطۂ نظر کے مطابق جو عملی حلقوں میں خاصا مقبول ہے، یہ مقام قلعہ لاہور کے ہاتھی دروازے میں سے گزرتی سڑک پر جب وہ چڑھائی کا موڑ کاٹتی ہے اس سے عین آگے بنتا ہے۔

اس بیان پر یقین اس حقیقت سے آجاتا ہے کہ لاہور کا مندر آج بھی قلعہ کے اندر وجود رکھتا ہے۔ ایک اور نقطۂ نظر، جو اندرون شہر کے رہائشی دانشوروں میں ہر دلعزیز ہے، کے مطابق یہ مقام پانی والا تالاب کے نزدیک بنتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں مقامات کے مابین فقط پانچ سو گز کا فاصلہ ہے۔ دونوں مقام نمایاں ہیں اور باقی شہر سے اونچائی پر واقع ہیں۔

جہاں تک رگ وید کے معتد بہ حصے کے لکھے جانے کے مقام کا تعلق ہے تو ہندوؤں کے یہ مقدس شاستر لاہور ہی میں دریائے راوی کے کناروں پر ہی نظم ہوئے تھے۔ لہٰذا ہم نہایت اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندو مذہب کے زیادہ تر حصے کی نشوونما اسی عظیم شہر لاہور میں ہوئی اور یہاں کے لوگوں نے ہی اسے پروان

چڑھایا۔

لیکن پھر یہ بات بھی حیرت انگیز ہے کہ لاہور نے خصوصاً اور پنجاب نے عموماً برصغیر میں بُدھ مت کی اشاعت میں بھی بہت بڑا کردار ادا کیا۔ ایسا نہیں ہے کہ مہاتما بُدھ خود یہاں آ گیا تھا مگر چندر گپت موریہ اور اس کا دادا اشوک بادشاہ دونوں نے، جو لاہور کے رہائشی تھے، بُدھ مذہب کی ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور 318 قبل مسیح میں جب یونانی افسروں نے، جو قبل ازیں سکندرِ اعظم کی مسلح افواج میں خدمات سرانجام دے چکے تھے، حسد کی بناء پر اپنے حکمران راجہ پورس کو، جو اس وقت یونانیوں کا حلیف تھا، قتل کر دیا اور یوں ملک گیر بغاوت اُٹھ کھڑی ہوئی تو دونوں دادا پوتا نے اس میں بڑھ چڑھ کر کردار ادا کیا۔ راجہ پورس کا اصل نام پوراوا تھا (پورس یونانی زبان میں بگڑا ہوا نام تھا) دریائے جہلم کے کنارے یونانیوں کی افواج سے 327 قبل مسیح میں شکست کھانے کے بعد پورس سکندرِ اعظم کا حلیف بن گیا تھا۔ جب سات فُٹ لمبے تڑنگے سیاہ فام پورس کو زخمی ہونے پر گرفتار کر لیا گیا تھا تو اس نے وہیں تاریخی کلمات کہے تھے کہ ''اس کے ساتھ بادشاہ جیسا سلوک ہونا چاہیے'' تو سکندرِ اعظم اس قدر متاثر ہوا، بلکہ چند ایک آراء کے مطابق وہ حقیقتاً خوفزدہ ہو گیا تھا، کہ اس نے حکم دیا کہ وہی اپنے علاقے کا بادشاہ رہے گا۔ نو برس کے بعد اس کے قتل کی وجہ سے یونانی سلطنت ڈھے گئی۔

دارالحکومت لاہور سمیت پورے پنجاب کا سرکاری مذہب بُدھ مت تھا۔ طالبان کی جانب سے بُدھ مت کے مجسموں کو مسمار کرنے کے حالیہ فتویٰ کا اِجرا اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ اشوک کی سلطنت میں، مغربی جانب کا شہر، قندہار شامل تھا جسے مقدس ویدوں میں ''کوروکشتریا'' کہا گیا ہے اور اس کے عہد میں اس کے حکم کے موجب بھاری بھرکم مجسمے تعمیر کیے گئے تھے جو آج کل دھمکیوں کی زد میں ہیں۔

سکھ مذہب کا نقطۂ آغاز بھی پنجاب میں ہوا اگرچہ محض لاہور ہی میں نہیں۔ اس کے بانی گرو نانک دریائے راوی کے کنارے لاہور کے نزدیک شرقپور کے علاقے تلونڈی میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن اُن کی تاریخ میں سکھ مت کو عروج اس وقت ملا جب گرو گوبند سنگھ نے اسلام اور ہندو مذہب کے پُرامن پیروکاروں کو ایک جنگجو نسل میں بدل کر رکھ دیا۔ خالصہ راج کا دارالحکومت بھی لاہور ہی تھا اور آج بھی روحانی طور پر ان کے شعور میں رستا بستا ہے۔

پھر دیگر مذاہب کے پیروکار بھی لاہور آئے۔ یوریشائی، تاتاری اور ھُن جو اپنے اپنے دیوتاؤں پر ایمان رکھتے تھے، یہاں آئے اور لاہور پر حملہ آور ہوئے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جٹ برادری، جو غالباً پنجاب کا سب سے زیادہ کثیر تعداد نسلی گروہ ہے، اصلاً ھُن تھی۔

کوئی حیرت کی بات نہیں اس قسم کی تاریخ کے حامل لاہور میں ہی وہ جگہ ہے جہاں 977 سن ہجری میں، 1023 برس قبل، پنجاب کی اوّلین مسجد تعمیر کی گئی تھی جب سلطان محمود غزنوی کے والد سبکتگین نے راجہ جے

پال کو لاہور میں شکست دی تھی۔ اس مسجد کا مقام شاہی قلعہ کے اندر واقع سنہری مسجد بتایا جاتا ہے۔ یہ مسجد کئی بار ازسرِنو تعمیر ہو چکی ہے، لیکن ماہرین کا کہنا ہے کہ یہی وہ مسجد ہے جو سب سے پہلے پنجاب میں تعمیر ہوئی تھی۔ چنانچہ سب سے اوّلین مسجد اور مندر دونوں ایک ہی مقام قلعہ لاہور میں وجود پذیر ہیں۔

بے شمار مذاہب کی باہمی تعلق داری کی بنا پر لاہور کے رہائشیوں کو ان کی بے حد مخصوص اور حساس طریقے سے ترجمانی کرنے کا ملکہ حاصل ہے جو انسانیت اور رواداری پر مبنی ہے۔ اسلام میں صوفیاء کرام نے ہمیشہ عوام کے دلوں اور دماغوں پر راج کیا ہے۔ ان کا دائرہ اثر مسلسل اور مکمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اندرون شہر کے لوگ دلی طور پر آزاد خیال اور درباری چاپلوسی سے متنفر ہوتے ہیں۔ آج بھی جب مذہبی جنونی حضرات بہت سے دیگر چھوٹے شہروں اور قصبوں کو یرغمال بنا سکتے ہیں تو لاہور کے اندرونِ شہر کے باسی ہر قسم کے تشدد کو رد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ قدیم تہذیبیں خود پرسکون ہوتی ہیں کیونکہ ان میں فوری دھمکی سے متجاوز دیکھنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

●○●○●○●

لاہور اور اس کے نیل کی صنعت

جب آپ لوہاری دروازے کے ذریعہ راستے اندرونِ شہر میں داخل ہوتے ہیں، جو غالباً ٹکسالی دروازے کے مسمار ہونے کے بعد اب قدیم ترین دروازہ ہے، تو یہ سڑک چار سو گز دُور جا کر ایک کھلی جگہ پہنچتی ہے جسے کبھی چوک چکلّہ کہا جاتا تھا جو لاہور کا اصلی قحبہ خانوں کا علاقہ تھا۔ ٹکسالی ان دنوں ثقافتی لحاظ سے بالائی طبقے کا علاقہ تھا۔ بائیں جانب یا شمال مغرب کو یہ تحصیل بازار کے سرے سے جا ملتی ہے اور دائیں جانب شمال مشرق کے رخ یہ سُوتر منڈی، دھاگے کی پرانی منڈی، کے ساتھ بل کھاتی چلی جاتی ہے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں تو ہمیں اس منڈی سے نکلتی ہوئی دو گلیاں ''نیل گلی'' اور ''رنگ والی گلی'' دکھائی پڑتی ہیں۔ یہی دو گلیاں ہماری توجہ کا مرکز ہیں۔ آیئے ہم اپنی کہانی سن 1633ء سے شروع کرتے ہیں۔ مغل بادشاہ شاہ جہاں نے ایک شاہی فرمان جاری کیا جس کی رُو سے نیل کی صنعت ریاستی اجارہ داری میں لے لی گئی۔ لاہوری دروازے کے بالکل پاس لاہور کی نیل منڈی میں ڈھنڈورچی نے بادشاہ سلامت کے فیصلے کا اعلان کیا، جسے کم ہی علم تھا کہ اس فیصلے نے برصغیر میں یورپی آبادکاری کی بنیادیں رکھ دی تھیں۔

اس شاہی فرمان کی رُو سے پوری سلطنت میں اگلے تین برسوں تک ایک ہندو تاجر منوہر داس، جس کی لوہاری دروازے میں بہت بڑی دکان تھی اور جو اپنا کاروبار آگرہ اور سُورت میں بھی چلاتا تھا، نیل کے فروخت کے حق کی توثیق کی گئی تھی۔ اُسے شاہی خزانے سے ایک قرض کے ذریعے مالی امداد فراہم کی جانی تھی اور منافع کی صورت میں تو حصہ داری کا حق بھی حاصل ہو گیا تھا۔ سرکاری تخمینے کے مطابق یہ پوری سلطنت میں سب سے زیادہ دولت کمانے کی سکیم تھی۔

اس عہد میں برصغیر میں نیل کی دو بڑی منڈیاں لاہور اور آگرہ میں تھیں۔ دیگر قابلِ ذکر منڈیاں ملتان، الٰہ آباد، سورت اور دلّی میں تھیں۔ لیکن لاہور کی منڈی ان میں سب سے بڑی اور آگرہ کی معیار کے لحاظ سے دیگر منڈیوں پر سبقت رکھتی تھی۔ برصغیرِ ہند پرانے زمانوں میں نیل کی رنگائی کا قدیم ترین مرکز تھا اور لاطینی و

یونانی ادوار سے یورپ کی نیل کی اساسی ضرورت پوری کرتا چلا آ رہا تھا۔ برصغیر کا مغربی دنیا سے نیل کے تعلق کا پتہ رنگ کے نام ''انڈیگو'' سے لگایا جا سکتا ہے۔ یونانی زبان میں اسے ''اِنڈیکون'' اور لاطینی زبان میں ''اِنڈیکم'' کے لفظ سے پکارا جاتا تھا جو بعد ازاں اطالوی زبان اور بالآخر انگریزی کے لفظ ''اندیگو'' میں ڈھل گیا۔

یونانی دانشور پریپلس اپنی 81-80 قبل مسیح کی ایک تحریر میں نیل اور اس کا دریائے راوی کے ساتھ تعلق کا ذکر کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے: ''اس دریا (سندھس یعنی انڈس/دریائے سندھ کے سات دہانے ہیں اور ماسوائے درمیانی کے باقی تمام کے تمام ناقابلِ جہاز رانی ہیں اور درمیانی حصے پر ایک ساحلی کاروباری مرکز ''باربریکون'' (لہار یا لاہور) واقع ہے جہاں سے اس منڈی میں بے شمار اشیاء درآمد کی جاتی ہیں۔ دوسری جانب یہاں سے کوسٹس، بڈیلیئم (گوگل) اور انڈین بلیک (اِنڈیگو/نیل) برآمد کیا جاتا ہے۔''

طاقتور ولندیزی اور انگریز تاجروں کی برادری کی نیل کے کاروبار میں روز افزوں دلچسپی کے پیشِ نظر شہنشاہ کو اپنی آمد میں اضافے کا قدم اُٹھانا پڑا۔ چار سو برس قبل قدر و قیمت کے لحاظ سے یہ برصغیر کا سب سے بڑا برآمدی شعبہ تھا۔ اس شاہی فرمان نے نیل کی عالمی تجارت پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ چنانچہ ولندیزی اور انگریزی تجارتی کمپنیوں نے، جو برصغیر کے ساحلوں کے ساتھ ساتھ جہاز رانی کیا کرتی تھیں، 19 نومبر 1633ء کو اس اجارہ داری کو توڑنے کے لیے ایک حلفیہ معاہدہ کر لیا۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کوئی یورپی ملک ایک سال تک نیل کی خریداری نہیں کرے گا اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے من مانے ارزاں ترین نرخوں پر کرے گا اور یہ کہ آئندہ نیل کی خریداری مشترکہ طور پر کی جایا کرے گی۔ ولندیزی اور برطانوی تاجروں نے یہ بھی قسمیہ وعدہ کیا کہ آئندہ نیل کو بطور مال برداری قبول نہیں کیا جائے گا۔ پرتگالیوں نے بھی اس عہد کی پاسداری کی۔ نیل کی تجارت پر سخت قسم کی پابندی لگ چکی تھی۔

یورپی اقوام میں سب سے اوّلین نیل درآمد کرنے والے پرتگالی تھے، جن کے کارندے پورے برصغیر میں خصوصاً لاہور، آگرہ، احمد آباد اور ملتان میں سرگرمِ عمل رہتے تھے۔ جوان شہروں سے پیداوار اکٹھی کر کے سُورت کی بندرگاہ پر لے جاتے جہاں سے پرتگالی اپنے بحری جہازوں میں اپنے دارالحکومت لزبن لے جاتے تھے، جہاں سے وہ اسے ہالینڈ کے رنگ ریزوں کو فروخت کر دیتے تھے، لیکن بعد ازاں ولندیزی اور برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنیوں کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد نیل کی تاجرانہ اجارہ داری پر باہمی رقابت شروع ہو گئی۔

اس یورپی اتحاد نے شہنشاہ شاہ جہاں کو مجبور کر دیا کہ وہ 14 اپریل 1635ء کو منوہر داس تاجر کے ساتھ اپنی شراکت کو منسوخ کر دے۔ مغلیہ سلطنت پہلی بار کسی یورپی دباؤ کے تحت ہمت ہار بیٹھی تھی۔ اس کے بعد سے یہ دباؤ کبھی کم نہیں ہوا۔ نیل کے بعد پنجاب کی رُوئی پر قبضہ جمایا گیا۔ جنوب میں انہوں نے گرم مسالے کی تجارت ہتھیالی چنانچہ پرتگالیوں کے ساتھ ولندیزیوں، فرانسیسیوں اور بالآخر برطانوی تاجروں نے اپنے اپنے

کردارادا کیے، لیکن مغلیہ عہد میں نیل نے لاہور میں ایک خاص کردارادا کیا تھا۔

مارکوپولو تیرہویں صدی کی ایک تحریر میں بیان کرتا ہے۔ ''۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں یہ بہت مقدار میں نہایت عمدہ نیل بناتے ہیں۔ یہ ایک خاص قسم کی جڑی بوٹی سے بنتا ہے جو گردونواح سے اکٹھی کی جاتی ہے اور جڑیں الگ کرنے کے بعد اسے بڑے بڑے برتنوں میں ڈال کر اس کے اوپر پانی انڈیلتے ہیں اور پھر اسے اسی طرح چھوڑ دیتے ہیں حتیٰ کہ پورا پودا سڑ جاتا ہے۔'' ایک انگریز ''ولیم فنچ'' نے 30 ر اگست 1609ء میں اپنی ڈائری میں لکھا کہ نیل کی تین قسم کی پیداوار اس دور میں ہوتی تھی۔ اس کی سب سے بڑی اور بہترین قسم ''بیانہ'' کہلاتی تھی، جو آگرہ کے قریب ایک گاؤں کا نام بھی تھا اور اس کی قیمتِ فروخت چار سو برس قبل پچیس روپے فی من تھی۔

ولیم فنچ نے بیانہ نیل کی مزید تین اقسام بیان کی ہیں۔ پہلے سال کی فصل نوٹ (نوڈا یعنی چھوٹا پودا) کہلاتی تھی۔ دوسرے سال کی فصل کو جڑی کہتے تھے، جو جڑ سے نکلتی تھی اور بہترین تسلیم کی جاتی تھی۔ تیسرے سال کی فصل کو کُھنٹی کہتے تھے جو تینوں میں سے گھٹیا ترین تھی۔ ہندوستان میں تجارت کے بارے میں ایک اور نیل کا تاجر لکھتا ہے۔ ''میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ فی الواقع مشاہدہ کیا ہے کہ اگر ایک انڈہ صبح کے وقت نیل چھاننے والوں کے پاس رکھ دیا جائے تو شام ہونے تک اگر کوئی اس انڈے کو توڑے تو اندر سے سراسر نیلے رنگ کا نکلے گا، نیل کی دُھول اس قدر جاذب ہوتی ہے۔''

ولندیزیوں اور انگریزوں کے مابین نیل کی تجارت کا ایک خاص وصف اس کی اجارہ داری میں ایک دوسرے پر بازی لے جانا تھا۔ 1637ء میں ولندیزیوں نے انگریزوں کو ان کے مقصد میں ناکام بنانے کی خاطر احمد آباد میں نیل کی ادائیگی میں اضافہ کر دیا۔

ایک اور خط میں، جو کمپنی کو انگریزی گماشتوں کے بارے میں 29 رمئی 1619ء کو لکھا گیا یہ درج ہے کہ نیل کی قیمت میں اضافہ سراسر انگریزوں اور ولندیزیوں کی باہمی مسابقت اور دیسی تاجروں کو نیل کی مال برداری کے لیے اپنے جہازوں کو استعمال کرنے کی اجازت دینا تھی۔ اگرچہ بیانہ نیل کو لاہور کے زمینی راستے سے ایران برآمد کرنا زیادہ سُودمند نہ تھا اور نہ ہی ایسا سوچا جاسکتا تھا۔

یہ بھی بہت سے لوگوں کے لیے حیرت کا باعث ہوگا کہ کرسٹوفر کولمبس کے جہازوں کے بادبانوں کے کینوس نیل میں رنگے ہوتے تھے۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ لاہور اور آگرہ کا نیل نئی دنیا کی دریافت کا چشم دید گواہ تھا۔ اسکاٹ لینڈ میں نیل سے ملتا جلتا ایک پودا ''وڈ'' پایا جاتا ہے جو آج بھی اسکاٹ لینڈ کے روایتی چار خانے دار اور رنگین دھاری دار اونی کپڑے ٹویڈ میں استعمال کیا جاتا ہے۔

بُنتی والے کپڑوں میں نیل کا استعمال 600 برس قبل سے بھی زیادہ عرصے سے ہو رہا ہے۔ مثال کے

طور پر ہندوستانی ملاح جو کینوس کی پتلونیں پہنتے تھے وہ نیل میں رنگی ہوتی تھیں۔ یہ احمد آباد کے قریب ایک شہر ''ڈنگہ'' میں تیار کی جاتی تھیں اسی سے لفظ ''ڈنگری'' نکلا ہے۔ فرانسیسی میں جو ہمیشہ سے بہترین کپڑا بنانے والے تسلیم کیے جاتے ہیں وہ سرج کی طرح کا ایک خاص کپڑا بنایا کرتے تھے۔ نیمز کا شہر آج بھی فرانس کی ٹیکسٹائل صنعت کا مرکز گردانا جاتا ہے۔ نیمز کی سرج یا ''سرج دونیمز'' ہی بعد ازاں (موٹا پائیدار سوتی کپڑا) ڈینم کہلایا جس سے جینز پتلونیں تیار کی جاتی ہیں۔

فرانسیسی سپاہی، جو براعظم امریکہ میں انگریزوں سے جنگیں لڑ رہے تھے، ڈینم کپڑے کی پتلونیں ہی استعمال کرتے تھے۔ ڈینم اطالوی ملاحوں اور اہلِ حرفہ کا بھی لباس تھا، خاص طور پر ان کی سب سے بڑی بندرگاہ جنیوا میں۔ ڈینم کی پتلونیں جنیوا کی نسبت سے جینز کہلانے لگیں۔ یہ حیرت کی بات ہی تو ہے کہ ایک ایسی پیداوار جو زیادہ تر مغربی ہندوستان یا لاہور، آگرہ، احمد آباد اور ملتان میں تیار کی جاتی تھی، ساری دنیا کا سفر کرتی ہوئی دنیا میں سب سے زیادہ پہنے جانے والے کپڑے میں ارتقاء پذیر ہوئی۔

جب انیسویں صدی میں جرمنی کے ایک سائنسدان نے، جس کا نام ''بائیر'' تھا، مصنوعی عمل سے نیل تیار کر لیا تو قدرتی نیل کی مانگ گر گئی۔ جس وقت سے انگریزوں نے نیل کے کاروبار پر اپنا قبضہ جما لیا تو نیل کی مانگ کم ہونا شروع ہو گئی۔ خصوصاً اس وجہ سے بھی جب لوگوں نے نیل کے پودے دیگر ممالک میں بھی اُگانے شروع کر دیئے۔ دنیا بھر میں اب واحد جگہ جہاں قدرتی نیل کی پیداوار کی جاتی اور اس کا استعمال کیا جاتا ہے وہ پاکستان میں ہے، جہاں سندھ اور ملتان میں روایتی ''اجرک'' کو نیل میں رنگا جاتا ہے۔

لاہور میں نیل کا کاروبار ختم ہو چکا ہے۔ اندرون شہر میں گلیوں کے نام صرف بوڑھے لوگوں کو یاد ہیں اور اب تو گلیوں کے نام بھی تبدیل کیے جا رہے ہیں۔ چوک چکلہ کا نام اب چوک بخاری ہے، لیکن چونکہ پاکستان میں دنیا کی بہترین درمیانے ریشے کی رُوئی پائی جاتی ہے اور ڈینم کپڑے تیار کرنے کے کارخانے لگائے جا رہے ہیں، نیل کی رنگائی کا کام دوبارہ شروع ہو رہا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اب یہ رنگ دوسرے ممالک سے درآمد کیا جاتا ہے۔ ایک ایسے ملک اور شہر کے لیے یہ ایک اداس کر دینے والے حالات کی تبدیلی کا نام ہے جو دنیا بھر کو بے تحاشا نیل کا رنگ فراہم کرتا رہا ہے۔

●○●○●○●

لاہور کی کُہنہ سالی پردے میں پوشیدہ

ہم سب جانتے ہیں کہ لاہور کی تاریخ کہنہ سالی میں پوشیدہ ہے۔ آخر وہ اوّلیں مقام کونسا تھا جسے لاہور کے نام سے پکارا گیا؟ اس سوال کے جواب کی تلاش میں تحقیق کا ایک دائمی تعاقب شروع ہو جائے گا۔ چند ایک حتمی سراغ ضرور ملتے ہیں جن کے بارے میں مزید عُمیق تحقیق کرنے کی ضرورت ہے خصوصاً آثارِ قدیمہ سے متعلق تحقیق!

1959ء میں آثارِ قدیمہ کے محکمے نے قلعہ لاہور کے اندرون ایک جگہ پر ''آثارِ قدیمہ کی تہ دار مادے کی تفصیلی جانچ'' کا کام سرانجام دیا تھا۔ 52 فٹ گہرائی سے نمونہ حاصل کیا گیا اور ہر فٹ کا ''کاربنی تعیّنِ زمان'' کیا گیا۔ اس کے نتائج نہایت حیران کن نکلے۔ اس نمونے میں سائنسدانوں کو تین خصوصی تہیں دریافت ہوئیں جو حتمی رہائش کا بعینہ ثبوت تھیں۔ ہر تہہ اوپر والی تہہ سے تقریباً 700 سے 800 برس پرانی تھی۔

سب سے نچلی تہہ، جو تقریباً 45 فٹ گہرائی پر تھی، میں ملنے والی نفیس اینٹ پہلے زمانے کے رہائش پذیر لوگوں نے مٹی کو ٹھوس شکل دے کر تیار کی تھی۔ ایک تخمینے کے مطابق یہ آبادی تین ہزار سال پرانی تھی۔ ماہرین نے تب تجویز کیا تھا کہ دیگر جگہوں سے اس سے بھی زیادہ گہرائی سے نمونہ حاصل کرنے کی ضرورت ہے خصوصاً اُن ٹیلوں سے جو اس ٹیلے سے اونچے تھے جس پر قلعۂ لاہور تعمیر کیا گیا تھا۔

ایک عمومی مقبول نظریہ ہے کہ پہلی آبادی، جسے ہم لاہور کہہ سکتے ہیں، اس جگہ سے شروع ہوئی تھی جہاں قلعہ کھڑا ہے۔ قلعے کے اندر لاہو کے مندر کی موجودگی اور یہ حقیقت کہ وہ رام اور سیتا کا بیٹا تھا، سے اس نظریے کو تقویت ملتی ہے۔ لیکن اس کی تصدیق، اسلامی دور سے قبل کی کسی بھی تحریری متن سے نہیں ہوتی۔ اس حقیقت کا سب سے اوّلیں ذکر مشہور ہندو مؤرخ سجن رائے بھنڈاری نے 96-1695ء میں اپنے مشہور مقالے ''خلاصۃ التواریخ'' میں کیا ہے۔ اگرچہ اس نے عوامی روایات اور دیگر ذرائع کے حوالے دیئے ہیں، لیکن روایتی راجہ رام چندر کے حیاتی دور کا تعین کرنا مشکل ہے۔ ایک ذریعے کے مطابق یہ دور 5300 قبل مسیح بتایا گیا ہے تو دوسرے میں 2200 قبل مسیح۔ اس بارے میں کہنہ سالی صرف خیالی معاملہ ہو کر رہ گیا ہے۔ ہماری دلچسپی

صرف سائنسی ثبوت کی فراہمی میں ہے۔

ایک اور ''آثارِ قدیمہ کی تہ داری تحقیق'' راجہ دھیان سنگھ کی حویلی میں کی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ یہ مقام قلعہ لاہور کے ٹیلے سے ذرا زیادہ بلندی پر ہے۔ اس کاربنی تعینِ زمان تحقیق نے مزید واضح طور پر لاہور کی کہنہ سالی کو آشکار کیا۔ اس میں انسانی آبادی کی چار سطحیں پائی گئیں۔ لیکن پھر ایسی تحقیق کو بڑھانے کی بجائے وہیں چھوڑ دیا گیا۔

اس تحقیق کی مزید چھان بین 1988ء میں پی پیک نامی ادارے نے کی، جس میں بہت سے پاکستانی اور غیر ملکی ماہرین شامل تھے۔ اندرون شہر کی مقامی جغرافیائی نقشہ کاری کے مساحتی مطالعے سے معلوم ہوا کہ لاہور کے دو بلند ترین مقامات چونا منڈی میں پانی والا تالاب اور پاپڑ منڈی کے شمال میں واقع محلّہ موہلیاں ہیں۔

یہ نتائج اس تاریخی دستاویز کے عین مطابق ہیں جو لاہور کے بارے میں 'قبل از عہدِ اسلام' قدیم ترین تحریر میں بیان کیے گئے ہیں۔ جو 982 قبل مسیح کے ایک نامعلوم مصنف نے اپنی کتاب ''حدود العالم''، جو برطانوی عجائب گھر میں موجود ہے، میں تحریر کر رکھے ہیں۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ مینورسکی نے کیا تھا، جو 1927ء میں لندن سے چھپا تھا۔

اس نایاب کتاب میں لاہور کا حوالہ بطور ایک چھوٹا شہر دیا گیا ہے جہاں مرعوب کن مندر، بڑی بڑی منڈیاں اور وسیع باغات ہیں۔ وہ دو بڑے کاروباری مراکز کا ذکر کرتا ہے، جس کے گرداگرد مکانات واقع ہیں۔ مصنف گارے کی دیواروں کا بھی ذکر کرتا ہے جو ان دونوں آبادیوں کو، باہم یکجا رکھنے کی خاطر، حصار میں لیے ہوئے ہیں۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کا شہرِ حصار اس کے قلعے سے بھی کہیں زیادہ قدیم ہو سکتا ہے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اندرون شہر اور بیرون شہر دونوں کی نہ صرف مختلف جگہوں سے آثارِ قدیمہ کی تحقیق کی ضرورت ہے بلکہ کہیں زیادہ گہرائی سے نمونے حاصل کرنے کی بھی ہے۔ اس مختلف سائنسی ریکارڈ کو باہم جوڑ کر لاہور کی شاندار اور وہ بھی سائنسی بنیادوں پر مبنی تاریخ رقم کی جا سکتی ہے۔ تب ہی یہ اس شہر کے مختلف حصوں کی تعمیر کی اصلی مصدقہ تاریخ ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ نہایت اہمیت کی بات ہے کہ ہمیں اندازہ ہو کہ اس شہر میں اسلامی حملہ آوروں کی آمد سے قبل اس کی شکل وصورت کیسی تھی؟ ''حدود العالم'' کی تحریر میں واضح طور پر شہر کی بیرونی دیواروں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ایک طرف مغربی دیوار تھی جو موجودہ بازار حکیماں کے ساتھ ساتھ چلی جاتی تھی۔ اگر آپ اندرون شہر گئے ہیں تو آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ وہ تمام گلیاں جو مشرقی جانب مڑتی ہیں سب کی سب ڈھلوان پر ہیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں پر، اور دلیل بھی اسی جانب اشارہ کرتی ہے اور 19ویں صدی کے مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی اپنی تحقیق میں اس کا ذکر کیا ہے، اصل مغربی دیوار ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ موجودہ بازار حکیماں اس مقام سے بیرون واقع ہے جہاں کبھی قدیم دیواریں ہوا کرتی تھیں۔

جنوب کی جانب قدیم گارے کی دیوار، موجودہ دیوار کے وجود سے کہیں اندر کی جانب واقع تھی۔ شمال کی جانب دیوار ''ٹبے'' کی چوٹی سے شروع ہوتی تھی جسے اب ٹبی چوک کہا جاتا ہے۔ لفظ ''ٹبی''، ''ٹبہ'' سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے ٹیلہ یا چھوٹی سی پہاڑی۔ دیوار اس اونچے ٹیلے کے ساتھ ساتھ اترتی تھی اور جہاں آج کل گمٹی بازار کا رنگ محل چوک ہے وہاں سے جنوبی طرف چلی جاتی تھی۔ لفظ گمٹی کا مطلب ہے ایک مدوّر ٹیلہ۔ مشرقی دیوار، جیسا کہ دستاویز ہمیں واضح کرتی ہیں، سیدھی شاہ عالمی بازار کے مغربی جانب سے ہوتی ہوئی سید مٹھا بازار تک چلی جاتی ہے۔

اگر آپ شاہ عالمی دروازے سے شروع ہونے والی سڑک کے کنارے کنارے چلتے چلے جائیں تو آپ کے مشاہدے میں آئے گا کہ مغربی جانب کی تمام گلیاں ڈھلوان پر ہیں۔ اسی ڈھلوان پر قدیمی گارے کی دیوار تھی۔ چنانچہ قدیم حصاری شہر لاہور اسی علاقائی حد بندی میں واقع تھا۔ دریائے آرودا (راوی) اس شہر کے گرداگرد بہتا تھا۔ جیسا کہ سجن رائے بھنڈاری کی کتاب میں مذکور ہے۔

قارئین کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ''حدود العالم'' میں شاہ عالمی کے علاقے کو ''رڑا میدان'' یعنی ویران جگہ کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ قدیمی لاہور اُس لاہور کا ایک تہائی تھا جسے ہم آج کل اندرونِ شہر کہتے ہیں۔ صرف تصدیق کی خاطر، قارئین کو یہ جان کر بھی حیرانی ہوگی کہ اوّلیں مسلمانوں کی قبریں قدیم لاہور سے بیرون واقع تھیں۔ مسلمان ہمیشہ سے اپنے مُردگان کو شہروں سے بیرون دفنایا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ملک ایاز کی قبر، سیّد علی ہجویریؒ کا مزار، سیّد زنجانی، صدر دیوان وغیرہ کے مرقد تمام کے تمام شہر سے بیرون علاقوں میں واقع ہیں۔ بھاٹی، لوہاری اور موری موجودہ 13 دروازوں میں قدیم ترین ہیں۔ باقی دروازے بعد میں معرضِ وجود میں آئے۔ موری دروازہ خاص طور پر شہر کی ہندو آبادی کے لیے تعمیر کیا گیا تھا تاکہ وہ اپنے مُردوں کو باہر بہتے ہوئے دریا کے کنارے کریا کرم کر سکیں۔

چنانچہ ایک موہوم سا خاکہ بن گیا ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں کسی وقت لاہور کے کس مقام پر قدیم ترین جائے سکونت اور آبادی اُبھر آئی تھی۔ شہر حصار کے اندر آثار قدیمہ کی اصلی تحقیق کی ضرورت ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ہمارا ماضی تھا کیا؟ جب انسان خلاء میں جا کر علم حاصل کرتا پھرتا ہے کہ اس دنیا کا ماضی کتنے کروڑ سال پرانا ہے تو یقیناً یہ بات قابلِ فہم ہے کہ ہمیں بھی اپنے ماضی کے متعلق جاننے کا حق حاصل ہے، جو قرونِ وسطیٰ سے صرف چند ہزار سال کے فاصلے پر ہے۔

●○●○●○●

لاہور میں قحط سالی

گذشتہ 2 ہزار برس کے عرصے میں لاہور اور پنجاب بھر میں تقریباً بیس عظیم قحط آتے رہے۔ عظیم قحط سے مراد وہ قحط ہے جو مسلسل تین برس یا اس سے زیادہ عرصے تک جاری رہے۔ لاہور کے اناج کے ذخائر زیادہ تر حوصلہ بڑھائے رکھتے تھے لیکن ماضی میں ایسے خوفناک زمانے بھی آتے رہے، اتنے ڈراؤنے کہ ہم آج ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اگر ہم سرکاری ریکارڈ دیکھیں اور تاریخ کی مختلف کتابیں پڑھیں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ اوسطاً ہر سو برس بعد لاہور کو کسی نہ کسی عظیم قحط کا سامنا رہا ہے۔ سب سے بدترین قحط چھ برس تک جاری رہا اور حالات اس قدر خراب ہو گئے تھے کہ شہر میں داخل ہونے کے خواہشمند لوگوں پر شہر کے پھاٹک بند کر دیئے گئے تھے اور فاقہ کشی اس مقام پر پہنچ گئی تھی کہ لوگ زندہ رہنے کے لیے آدم خوری پر مجبور ہو گئے تھے۔ موجودہ دور میں ایسی بھیانک صورتِ حال کا تصور بھی محال ہے، لیکن ہماری تاریخ میں ایسا تین بار ہو چکا ہے۔ ہر مرتبہ قحط کی طوالت نے چار برس کی حد عبور کر لی تھی اور آدم خوری کی اطلاعات ملنے لگی تھیں۔

ہمیں ان دلخراش واقعات کی تحقیق کر کے ضابطۂ تحریر میں لانا چاہیے تا کہ ہم جان سکیں کہ ہم کون ہیں اور ہمیں کن کن مصائب کا سامنا رہا ہے؟ ایک طرح سے یہ بھی ایک اساسی وجہ ہے کہ ہم آج بھی اجتماعی طور پر ہی سلوک روا رکھتے ہیں۔ لاہور یقیناً شاندار عمارات سے عبارت ہے اور ایک ایسی تاریخ کا حامل ہے جس کی مماثل کرۂ ارض پر بہت کم شہر کر سکتے ہیں۔ یہ باغات، شعراء اور یونیورسٹیوں کی وجہ سے بھی مشہور ہے لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ لاہور عوام الناس سے بھی متعلق ہے۔ یہ شہر جو کچھ بھی ہے یہاں کے لوگوں کی وجہ ہی سے ہے، جو یہاں رہتے رہے ہیں اور اب بھی یہاں رہ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو کچھ افتاد اِن پر پڑی ہے اُنہیں بیان کرنے کی ضرورت ہے، تا کہ آئندہ کبھی ایسا نہ ہو۔ ہمیں اپنی اجتماعی زندگیوں میں زخموں کے داغوں کو ذہنوں سے محو کر دینے کی عادت ہے۔ ہمیں خوفناک قحطوں کے داغوں کو بار بار دیکھنے کی ضرورت ہے تا کہ ہم انہیں محسوس

کرسکیں اور آج ان پر یقین رکھ سکیں۔

یہ قحط یقیناً ہماری تاریخ کے، جو کئی ہزار برس پر محیط ہے، عارضی لمحات نہیں رہے ہیں۔ ہمارے بہت سے لوک گیت، ہمارے اجتماعی برتاؤ کی طرح، سب اِن جیسے خوفناک واقعات سے جنم لیتے ہیں۔ ضبطِ تحریر میں آنے والا پہلا قحط جس نے لاہور کو زد کیا وہ 650ء میں آیا تھا۔ اگرچہ اس وقت کے قحط نے پورے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ پنجاب کے دور دراز کے علاقوں سے لوگ لاہور آ گئے اور اس کو گھیرے میں لے لیا یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کے اناج کے ذخائر میں ان کے حصے کی خوراک موجود ہے۔ ہندو راجپوت راجہ کے پاس یقیناً اچھے خاصے ذخائر تھے اور اس نے اپنی رعایا کی ممکنہ حد تک مدد بھی کی، لیکن لوگ گلیوں میں محض بھوک کی وجہ سے مر رہے تھے۔ 879ء میں ایک اور عظیم قحط نے لاہور پر کاری وار کیا۔ اس وقت اندرون شہر واقع اناج کے گوداموں پر حملہ کر دیا گیا اور امن عامہ کی صورتِ حال کے انہدام کی وجہ سے قحط طول پکڑتا گیا۔ اس عمل میں بھٹ راجہ کی جانب سے رعایا کی بغاوت کو بزورِ طاقت کچلنا پڑا تھا اور جب دوبارہ امن عامہ بحال ہو گیا تو خوراک مہیا کر دی گئی۔

لیکن بدترین قحط، جو لاہور پر حملہ آور ہوا وہ 1941ء میں آیا اور یہ 1022ء تک جاری رہا۔ اس قحط نے نہ صرف پورے پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا بلکہ سارے برصغیر کے بھی لاکھوں لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ ایک تخمینے کے مطابق اس قحط میں پنجاب کی 35 فیصد آبادی ختم ہو گئی تھی۔ آبادی اس بُری طرح کم ہوئی کہ ہر روز بیسیوں لاشیں گلیوں میں پڑی پائی جاتی تھیں، جو محض بھوک اور تھکن سے لقمۂ اجل بن گئی تھیں۔ ہمارے حالات کی خرابی میں مزید اضافہ کرنے کے لیے ہمارے افغانی بھائیوں نے اپنی اوّلیں عظیم لشکر کشی کا آغاز کر دیا اور جو کوئی بھی ان کے راستے میں آیا اسے بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ وہ ہماری کمیاب گندم اور چاول کی فصلوں کے معتدبہ حصے لوٹ کر اپنے ساتھ افغانستان لے گئے، اگرچہ ہماری نصابی کتب میں یہی لکھا گیا ہے کہ وہ اسلام پھیلانے آئے تھے۔

آخر کار کچھ سکون میسر ہوا اور بڑے بڑے سیلاب شہر اور اس کے نواحی علاقوں میں آنے کے بعد زمین زرخیز ہو گئی اور کئی برس تک غیر معمولی اچھی فصلیں ہونے کی اطلاعات آتی رہیں۔ اس دور کی بات ہے کہ لاہوری یا لوہاری دروازے کی تعمیر کی گئی۔

اناج کے گودام بھرے رہے اور زندگی معمول پر آ گئی۔ ایک لحاظ سے یہ خوشحالی کے زمانے ہی لاہور کو ایک عظیم شہر بنا گئے۔ لاہور کی اٹھان اس خوشحالی کی بدولت ہوئی، جو بھرپور فصلوں کی وجہ سے ہوئی۔ آج بھی یہی راہِ منزل ہے۔

لیکن 1148ء میں ایک اور قحط نے لاہور کو آ لیا جو 1159ء تک جاری رہا۔ اگرچہ یہ پورے ہندوستان میں پھیل چکا تھا جہاں اس کا اثر بھی زیادہ تھا، لیکن لاہور بھی متاثر ہوا اور ہزاروں لوگ اس کی گلیوں میں

مر گئے۔اس کے بعد دو اچھے برس آئے اور اس سے قبل کہ اعتماد بحال ہو پاتا 1162ء میں ایک اور قحط آ گیا۔ بیرونی حملے اور قحط ہاتھوں میں ہاتھ دیئے اکٹھے چلے آئے تھے۔45-1344ء میں ہندوستان میں عظیم قحط آیا اور اس وقت مغل شہنشاہ اپنی گھر داری کے لیے ضروری اشیاء حاصل کرنے کے قابل نہ رہا۔ یہ قحط کئی برس تک جاری رہا اور لاکھوں افراد موت کے منہ میں چلے گئے۔ 1396ء سے 1407ء تک، درگا دیوی قحط، بارہ برس تک ہندوستان میں جاری رہا۔لاہور تو تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔

لیکن پھر عظیم ترین سیلاب آ گئے اور زندگی معمول پر آ گئی۔ لاہور کے وسیع اناج کے ذخائر پورے ہندوستان میں مشہور تھے۔ اسی وجہ سے مغلیہ خاندان لاہور میں خاصی دلچسپی لیتا تھا، پھر بنگال کا عظیم قحط 70-1769ء میں آ گیا اور ایک تہائی آبادی، ایک کروڑ، ختم ہو گئی۔ یہ المیہ سمجھ سے یکسر باہر تھا۔اس زمانے میں لاہور نے اچھے انتظامات کیے اگرچہ 1798ء میں یہاں کال پڑا۔لیکن 1783ء میں ''چالیسہ قحط'' آ گیا جس نے لاہور اور جموں کو متاثر کیا اور سینکڑوں افراد لقمۂ اجل ہو گئے۔ اگرچہ شہر لاہور نے اس زمانے میں اپنی گندم کا آزوقہ مقرر کر دیا تھا اور امن عامہ کو برقرار رکھا تھا اسی قحط کے دوران کشمیری آبادی لاہور منتقل ہوئی تھی۔ آج ہمارے ہاں جو اتنی کشمیری آبادی نظر آتی ہے وہ اسی قحط کے سبّب ہے۔

1790ء میں دو جی بار ایا کھوپڑی قحط نے ہندوستان پر حملہ کیا۔اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ اتنے زیادہ افراد لقمۂ اجل ہوئے کہ ان کو دفنایا نہ جا سکا۔ راویت کے مطابق یہ اب تک آنے والے قحطوں میں شدید ترین تھا۔ یہ قحط چار برس تک جاری رہا اور اس میں آدم خوری کے واقعات کی بھی اطلاع ملی۔ اسی زمانے میں لاہور کے موری دروازے کی تعمیر ہوئی تا کہ رعایا اپنے ہزاروں مُردوں کو دریائے راوی پر، جو شہر کی چار دیواری سے بیرون بہتا تھا، کریا کرم کے لیے لے جا سکے۔

''کھوپڑی قحط'' کے بعد بھی بڑے بڑے قحطوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جس کا سبب ہماری تحقیق کے بعد ہمیں اب پتہ چلا ہے کہ کیوں قحطوں کا دور دورہ رہا۔ اس کی وجہ تھی کہ انگریز ہمارے اناج کے بڑے بڑے ذخیروں پر قبضہ کر رہے تھے۔ برطانوی سامراجی طرزِ حکومت کے اس پہلو کو پہلے کبھی زیرِ بحث نہیں لایا گیا۔ 1838ء میں ایک شدید قحط نے ہندوستان کے شمال مغربی صوبہ جات، متحدہ صوبہ جات، کو آلیا جس میں آٹھ لاکھ افراد لقمۂ اجل بن گئے۔

1861ء میں ایک اور عظیم قحط ہندوستان کے شمال مغرب پر حملہ آور ہوا جس میں پانچ لاکھ افراد راہیٔ عدم ہوئے۔ 1866ء میں ایک اور قحطِ عظیم نے بنگال اور اڑیسہ کو لپیٹ میں لے لیا جس میں دس لاکھ افراد مارے گئے۔1869ء میں ایک قحطِ عظیم نے راجپوتانہ کو متاثر کیا جس میں پندرہ لاکھ افراد مر گئے۔1876ء میں ایک اور قحطِ عظیم مرکزی اور مغربی ہندوستان پر حملہ آور ہوا جس میں پچاس لاکھ افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

لوگوں نے بہت خوفناک زمانے دیکھے ہیں۔ قحطوں نے ان طریقوں کو رواج دیا جنہیں ہم برت رہے ہیں۔ ہمارے تحفظات کسی اور نسبت کی بجائے قحط سے زیادہ متعلق ہیں۔ جدید ذرائع نقل وحمل کے مرہونِ منت ہیں کہ اب قحط، کم از کم پاکستان میں، قصہ پارینہ بن چکے ہیں تاوقتیکہ ہم سکھا شاہی افراتفری نہ مچا دیں، جس طرح ہم نے اپنے کمیاب پانی کے ذرائع کے انتظام میں کر رکھی ہے۔ لیکن وہ تو سیاست کی بات ہے۔ ذرا سوچئے!

●○●○●○●

بسنت اور صوفی بزرگ

بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ موسمِ بہار کا قدیم بسنت پنچمی میلہ جو لاہور میں دھوم دھام سے منایا جاتا ہے، بعینہٖ ہر سال برصغیر کے مسلمان دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ پر بھی مناتے ہیں۔ یہ سات سو برس قدیمی رنگا رنگ روایت چشتیہ سلسلے کے صوفی بزرگ اور ان کے مرید حضرت امیر خسروؒ سے تعبیر کی جاتی ہے، جو غالباً اوّلین مسلمان تھے جو بسنت منانے پر خوشنودی کا اظہار فرماتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ سلسلۂ چشتیہ کے یہ صوفی بزرگ ایک مرتبہ حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر آئے ہوئے تھے کہ بسنت کے تہوار کے رنگ دیکھنے کا اتفاق ہوا تو وصیت فرمائی کہ ان کے مریدان بہار کا موسم دہلی میں بھی اتنی ہی دھوم دھام سے منایا کریں۔ لیکن ہوا یوں کہ پورے شہر میں تو نہیں، لیکن بسنت میلہ صرف ان صوفی بزرگ کی درگاہ پر ہی منایا جاتا رہا اور آج تک بسنت تہوار پتنگیں اُڑانے، میلہ لگانے، کلاسیکی موسیقی کی نغمہ سرائی، خاص طور پر ''بسنت راگ'' الاپنے اور دیگر دھیمے راگوں کے ساتھ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ بعدازاں درگاہ والوں نے اس میلے میں ''قوالیاں' بھی شامل کر دیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب سے قدامت پسندوں نے درگاہ کا انتظام سنبھالا ہے جشنِ بہار کے جوش و جذبے والی رونقوں پر پژمردگی چھا گئی ہے۔

پچھلے دس برسوں میں لاہور اور دہلی میں دو دلچسپ تبدیلیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ لاہور میں انتہائی مذہبی قدامت پسند حضرات نے عوام کی اخلاقیات پر قبضہ جما لیا ہے (اس کی زیادہ سے زیادہ مذمت کرنی چاہیے) اور میلے ٹھیلے والی مسرت کے عنصر کو ہی کچل کر رکھ دیا ہے۔ ادھر دہلی میں صدیوں کے بیتنے کے ساتھ ساتھ قدامت پسندوں کے غلبے کی وجہ سے رونقوں کو ختم کر کے اسی لاہوری تہوار کو چندہ اکٹھا کرنے کا وطیرہ بنا لیا ہے۔

میرا اندازہ ہے اگلے چند برسوں تک بھارت کا بسنت پنچمی سیاحوں کی توجہ مرکوز کر لے گا اور یہ ویسے ہی ہوگا جیسے بھارت نے اپنے ہاں ایک جعلی شہر سیالکوٹ بنا کر ہمارے اصلی شہر سیالکوٹ کی کھیلوں کے سامان کی صنعت کو اُچک لیا ہے۔ بسنت کے معاملے میں میرا یقینِ محکم ہے کہ اس موقع کو ہتھیانا ناممکن ہے۔ بسنت کی

خوبصورتی اس حقیقت میں ہے کہ یہ خالصتاً عوام کا میلہ ہے خواہ وہ کلیدی عہدے پر ہوں، نچلے یا وسطی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں، کالے ہوں یا گورے ہوں یا کسی بھی مذہبی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ موسمِ بہار میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ہمارے بھیتر سے رجائیت باہر کھینچ لاتا ہے۔ عملی طور پر یہ بے ساختہ پن آج بھی موجود ہے جسے روکا نہیں جا سکتا۔ متشدد حملہ آوروں کے برعکس جو زندگی کو آر یا پار کے معنوں میں ہی لیتے ہیں۔ یہ برصغیر کے عظیم صوفی حضرات تھے، جنہوں نے لوگوں کو صحیح طور پر سمجھا خاص طور پر غریب لوگوں کو ان کے رنگ برنگے انداز میں جانچا۔ داتا گنج بخشؒ سے نظام الدین اولیاؒ اور بلھے شاہ تک سب نے بہار کی بدلتی ہوتی رُت میں اندرونی روح کی خوبصورتی کو دیکھا۔ سرسوں کے کھیتوں میں پیلے پھولوں کو کھلتے دیکھا۔

بنیادی حقیقت یہی ہے، اس سے قطع نظر کہ کوئی کس کی اور کیسی عبادت کرتا ہے کہ ہماری تقدیریں اپنی سرزمین سے نہایت مضبوطی کے ساتھ جُڑی ہوئی ہیں۔ نقطۂ آغاز کے طور پر حقیقت یہ ہے کہ بہار کا مطلب ہے کہ سورج کی تمازت جلد ہی ہماری گندم کی فصل کو پکا دے گی اور ہمارا اگلے برس کا اناج یقینی ہو جائے گا۔ قدیم مذاہب، جین مت، ہندو مت اور بُدھ مت، جو اپنے اپنے ادوار میں لاہور میں بامِ عروج پر تھے، کو الگ رکھیں، مسلمان صوفیاء کرام نے اس کو نئے معنی عطا کیے۔ سکھ اسے قمری سال کے مہینے بیساکھ کی پانچویں تاریخ کو ''بیساکھی'' کے نام سے مناتے ہیں۔ سال کے زیادہ تر عرصے میں پتنگ بازی پر پابندی نے اس قدیم میلے کو بُری طرح نقصان پہنچایا ہے۔ وجہ صرف اور صرف دھاتی تار کا استعمال ہے جو یقیناً محض خوشی منانے کے اس کھیل میں سراسر غیر حکمت عملی ہے۔ کوئی بھی شخص بیک وقت ناجائز کام کرتے ہوئے خوشی نہیں حاصل کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہم صرف دھاتی تار استعمال کرنے والوں کو اچانک چھاپہ مار کر پکڑنے پر پوری توجہ دیں اور اچھے طریقے سے سزا دینا چاہیں تو ان کے چہروں کو کالا کر کے گدھوں پر سوار کرایا جائے، تب شاید ''قانون'' کو نافذ کیا جا سکے۔

ہمیں سمجھداری سے کام لیتے ہوئے دھاتی تار والے پتنگ بازوں کو اچانک پکڑوانے میں عوام کو شرکت کی دعوت دینا ہوگی تاکہ مجرموں کو حوالۂ پولیس کیا جا سکے۔ اس ضمن میں حکام کو ہر کس و ناکس کی مدد کی ضرورت ہے۔ لیکن حکام کے پتنگ اڑانے پر پابندی لگانے کے فیصلے کی کوئی حمایت نہیں کرے گا۔ یہ حماقت ہے کہ چند بے ایمانی کرنے والوں کی وجہ سے پتنگ بازی پر ہی پابندی لگا دی جائے۔ اگر اس دلیل پر جائیں تو پھر تو ہر کھیل پر، بہترین تفریحی کھیلوں سمیت، پابندی لگ جائے گی۔

ہمارے بچپن کے دنوں میں، پتنگ بازی رات ہوتے ہی شروع ہو جاتی تھی۔ ہم کاغذ کے لالٹینی غبارے بنایا کرتے تھے۔ رات کو پورے اندرون شہر کے آسمان پر کاغذی لالٹین ہوا کے دوش پر تیر رہی ہوتی تھیں۔ بسنت پر ہم لوگ لاہور کو جس قدر چاہیں خوبصورت یا بدصورت بنا سکتے ہیں۔ بھارتیوں کو بسنت پر پیسہ

کمانے کے حربے مبارک ہوں۔ ہم لاہوریوں کو ضرورت ہے تو محض یہ کہ اس موقع پر لوگوں کی آمد پر پابندی نہ لگائیں اور کسی تقریب کا رنگ پھیکا نہ پڑنے دیں بلکہ اس جشن کو نئی بلندیوں تک لے جائیں کم از کم میں تو اپنے تئیں خوشی سے نہال ہو جاؤں گا۔

●○●○●○●

داتا دربار: جہاں سب کو کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے

جب کوئی لاہور کے بارے میں بات کرے تو کسی نہ کسی مقام پر داتا گنج بخشؒ کا ذکر ضرور آجاتا ہے۔ ان کا انتقال 465ھ میں ہوا اور آج کل 1435ھ ہے 970 قمری یا 900 سے زائد عیسوی برس قبل۔ اتنی طویل مدت کے گذرنے کے باوجود اس مزار کے اردگرد زندگی ہمیشہ رواں دواں رہی ہے، لیکن اس مزار کے اردگرد کی حقیقی زندگی ہے کیا؟

ہم سب ان کے بارے میں جانتے ہیں اور ہم میں سے بیشتر کسی نہ کسی مرحلے پر تجسس کی بناء پر یا تعظیماً وہاں جاچکے ہیں۔ پچھلے برس سے بطور ایک صحافی، جو مزار کے پڑوس میں رہائش پذیر رہا ہو، مَیں بادشاہان، صدور، وزراءاعظم، گورنروں، وزراءاور بے شمار دیگر درخشاں ہستیوں کو وہاں آتے جاتے دیکھتا رہا ہوں۔

لیکن پھر یہاں بھوکے اور پریشان حال افراد تو ایک طرف، فقیروں اور جیب کتروں کی بھی بہتات ہے۔ یہاں پارسا لوگ بھی پائے جاتے ہیں اور دھوکے باز بھی اور غالباً مؤخر الذکر کی تعداد اوّل الذکر سے کہیں زیادہ ہے۔ جو اس مزار کے اردگرد ہوتا ہے وہی اس شہر کی تاریخ بھی ہے۔ پہلے زمانے میں داتا گنج علی مخدوم گنج بخش ہجویری لاہوری کہلاتے تھے۔ کیونکہ اسی نام گرامی سے وہ دیگر ملکوں میں جانے جاتے ہیں۔ وہ کون تھے؟ بایں ہمہ اور کیا وجہ ہے کہ اپنی وفات کے تقریباً ایک ہزار برس بعد بھی ان کی اس قدر تعظیم کی جاتی ہے؟

داتا گنج بخش 431ھ میں افغانستان کے شہر غزنی سے لاہور تشریف لائے تھے اور سلطان محمود غزنوی کے بیٹے سلطان مسعود کے ہمراہ آئے تھے۔ ان کا اصل وطن ہجویر تھا، اِسی لئے یہ کے نام کا حصہ بن گیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ابتدائی کوائف میں وہ شیخ علی مخدوم غزنوی کہلاتے تھے۔ ہجویری نہیں، کیونکہ وہ محمود غزنوی کے بیٹے کے ہمراہ غزنی سے آئے تھے۔ مغرب سے مسلمان فاتحین کی پہلی کھیپ نے برصغیر کی دولت کو افغانی لشکر کے ہاتھوں لٹتے ہوئے دیکھا، محمود غزنوی کے بعد اس کا بیٹا برصغیر آیا، تو فتوحات کی دوسری لہر آئی لیکن اس کے ہمراہ بہت سے صوفیاء کرام بھی آئے تھے جن کا واحد مقصد صرف اللہ کا پیغام پھیلانا تھا۔ ان صوفیاء کرام میں سب سے

پہلے آنے والوں میں داتا گنج تھے۔ کسی عقیدت مند لاہوری کے لیے، جو یہ سمجھتا ہو کہ داتا صاحب صرف اُسی کے ہیں، یہ اَمر دلچسپی کا باعث ہوگا کہ ان کے مزار پر ان کا سلسلۂ نسب واضح طور پر نصب ہے۔ جو یوں پڑھا جا سکتا ہے۔ یہاں مدفون ہیں شیخ علی بن سیّد عثمان، بن سیّد علی، بن سیّد عبدالرحمٰن، بن سیّد عبداللہ، بن سیّد ابوالحسن علی، بن سیّد حسن، بن سیّد زید شہید، بن امام حسین، بن علی مرتضٰی۔ جس کا مطلب ہے کہ شیخ علی مخدوم گنج بخش ہجویری لاہوری، رسول پاکؐ سے صرف آٹھ پشت پر ہیں۔

شجرۂ طریقت میں شیخ علی ہجویریؒ، خواجہ ابوالفضلؒ کے مرید تھے جو شیخ حُصریؒ کے مرید تھے جنہوں نے شیخ ابوبکر شبلیؒ سے تربیت پائی جو جنید بغدادیؒ کے مرید تھے، جو سیّد سری سقطیؒ کے مرید تھے جو معروف کرخیؒ کے مرید تھے۔ جنہوں نے داؤد طائیؒ سے فیض حاصل کیا جنہوں نے حبیب عجمیؒ سے فیض پایا جو حضرت حسن بصریؒ کے شاگردِ رشید تھے جو حضرت علی مرتضٰیؓ کے شاگرد تھے۔ یہ سلسلۂ نسب جو خاصا پیچیدہ ہے بالآخر شیخ علی مخدوم کی پیدائش تک پہنچتا ہے جو اب دنیا میں داتا گنج بخش کے لقب سے مشہور ہیں۔

یوں علی ہجویریؒ 431 سن ہجری میں لاہور تشریف لائے اور بھاٹی دروازے کے عین بیرون مٹی گارے سے بنے ہوئے ایک گھر میں رہنے لگے۔ ان دنوں، جیسا کہ اساطیر میں بیان ہوا ہے، ایک طاقتور ہندو جادوگر لاہور کی آبادی کا مذہبی رہنما بنا بیٹھا تھا۔ یہ آبادی تقریباً ساری کی ساری ہندوؤں اور جین مت مذہب کے پیروکاروں پر مشتمل تھی۔ اس جادوگر نے نوجوان صوفی عالم کو مقابے پر للکارا۔ کہا جاتا ہے، اگرچہ میری میلان طبع ایسے دعوؤں پر یقین نہ کرنے کی ہے، اس جادوگر نے فی الواقعہ علی ہجویریؒ کی جھونپڑی پر ہوا میں اڑنا شروع کر دیا۔ برگزیدہ ہستی نے اس مظاہرے کو ''دکھاوا'' قرار دیتے ہوئے یکسر رَد کر دیا اور آخری دو قُل پڑھ کر جادوگر کی طرف پھونک ماری تو وہ زمین پر آن رہا اور بھاگ گیا۔ اس واقعے کا چرچا شہر بھر میں ہو گیا جو اُن دنوں گارے کی فصیل کے اندر آباد تھا۔ جلد ہی بے شمار لوگ، جو زیادہ تر ہندو تھے، علی ہجویری کی خدمت میں حاضر ہونا شروع ہو گئے اور ان کی دعاؤں کے طالب ہوئے۔ تب علی ہجویری نے فیصلہ کیا کہ وہ اسی شہر میں مستقل قیام کریں گے اور اپنے علم اور نفسِ انسانی کے عمیق ادراک سے لوگوں کی خدمت کریں گے۔ ایک طرح سے لاہور خود چل کر ان کے پاس آیا تھا اور انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ تب ہی عوام نے کہا تھا۔ ''بادشاہ اور فقیر صوفیوں کے نزدیک ایک جیسی حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔'' تقریباً 900 برس بعد بھی یہ سچ قائم دائم ہے۔

سب سے احسن بات یہ ہے کہ ہر مذہب کے لوگ یہاں حاضری دیتے ہیں۔ ذرا تصور کریں کہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ (1141-1230ء) اور پاکپتن والے خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ (1188-1280ء) جیسے جیّد علماء اور اولیاء اللہ نے اس مزار پر عبادت کرنے اور چِلّے کاٹنے میں خاصا وقت صرف کیا ہے۔ صرف مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں مزار کے بیرونی مدرسے کے خوشنما سنگِ مرمر اور نقش کندہ کی

وجہ سے دانستہ غارت گری ہوئی۔ لیکن سکھوں نے یہ سلوک تو لاہور کے ہر مقبرے اور مزار کے ساتھ کیا۔ ایک بیان کے مطابق، سنگِ مرمر اکھیڑنے کے اگلے ہی روز مہاراجہ کو قے آنا شروع ہو گئیں۔ اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ بیرونی عمارت کو نقصان پہنچانے پر ازالے کے طور پر برگزیدہ ہستی کو راضی کرے۔ چنانچہ مہاراجہ نے مزار کے لیے سالانہ آمدن مقرر کر دی اور اس دن کے بعد جب بھی اس کا گزر اس راستے سے ہوا، اس نے ہمیشہ مزار پر حاضری دی۔

ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں مزار کی شاندار بیرونی عمارت تعمیر کی گئی اور شہنشاہ ایران نے سونے اور فیروزے کا منقش ایک نہایت خوشنما دروازہ بھیجا جو وہاں نصب ہے اور آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ نواز شریف تو پوری مسجد کی از سرِ نو تعمیر کر کے بازی لے گیا اور پھر مسجد بھی نہایت خوبصورت!

اگر آپ اس شاندار عمارت کے اردگرد دیکھیں تو آپ کو انتہائی غربت نظر آئے گی۔ یہ علاقہ جیب کتروں اور اغوا کنندوں کی جنت ہے۔ نوجوان جرائم رپورٹر کی حیثیت سے اپنے ایام میں ہماری ٹیم نے جیب کتروں کے ایک سکول کا کھوج لگایا تھا جہاں ابتدائی نصابی کتب میں جیب کترنے کے طریقے اور آپس میں استعمال کی جانے والی مخصوص زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس وقت ہم نے الزام لگایا تھا کہ یہ سکول مبینہ طور پر پولیس چلاتی تھی لیکن یہ تقریباً تیس برس پہلے کی بات ہے۔ اس انکشافی خبر کے چھپنے کا کچھ بھی نتیجہ نہیں نکلا۔ میرے علم میں ہے کہ یہ علاقہ اب بھی یونہی بدمعاشوں (ملکہ وکٹوریہ کے دور کی اصطلاح) کو نیلام ہوتا ہے اور پھر یہاں بہت سے پکوان خانے ہیں جہاں سے آپ میٹھے چاولوں، گوشت یا پلاؤ کی سالم دیگیں خرید کر غرباء میں لنگر تقسیم کر سکتے ہیں۔ غریب لوگ اس علاقے میں بہت بڑی تعداد میں گھومتے رہتے ہیں۔ بھوکے لوگوں کے لیے ایسا کھانا شرطیہ ہوتا ہے یہاں ہر ایک کو کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے اور یہ فیض نو سو برس سے بھی زائد مدت سے یونہی جاری و ساری ہے۔ داتا گنج بخشؒ کا مزار ہر کس و ناکس کے لیے اہمیت کا حامل ہے اور یہ سدا یوں ہی اہم رہے گا۔

●○●○●○●

اگر مُرادیں گھوڑے ہوتیں

ہماری نوعمری میں میرے والد ہمیں سالانہ میلے پر، خواہ چند گھنٹوں کے لیے ہی سہی، بڑی رغبت سے لے جایا کرتے تھے، جو حضرت مادھولعل حسین کے عرس کے ساتھ ساتھ، شالامار باغ میں لگتا تھا۔ ان کے نزدیک یہ انہیں ان مسرت انگیز دنوں کی یاد دلاتا تھا جو انہوں نے ایک اعلیٰ مقام پر بسر کیے تھے۔ ان کے واقف کاروں میں یہ طے ہے کہ وہ دن یقیناً روحانی قسم کے نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ اس سے کہیں زیادہ عاقل اور سمجھدار تھے۔

میلے سے لوٹتے ہوئے وہ ہمارے لیے آوے کے پکے ہوئے مٹی کے چند گھوڑے لایا کرتے تھے اور ہر بار ان کا کہنا ہوتا تھا۔ ''تم مراد مانگو اور یہ گھوڑے اس کو پوری کر دیں گے۔'' یہ آوے کے پکے ہوئے گھوڑے، ''گگو گھوڑے''، گھوڑے شاہ کے مزار سے لائے گئے تھے جو لاہور کا طفل برگزیدہ تھا۔ مقبول عوامی روایت کے مطابق اگر اس طفلِ برگزیدہ کے پسندیدہ مشغلے کے لیے کوئی شخص گھوڑا لے کر جائے، خواہ وہ اصلی ہو یا محض مٹی کا بنا ہوا ہو، تو اس کے مزار پر جو بھی مراد مانگی جائے وہ پوری ہو جاتی ہے۔ لاکھوں نہ سہی، ہزارہا لوگ ہیں جن کا یقین ہے کہ طفلِ برگزیدہ وہ مراد پوری کرتا ہے کیونکہ وہ پاکیزہ دل ہے۔ لاہور کے سرپرست طفلِ برگزیدہ کے سالانہ عرس کی تقریب کے موقع پر لوگ ہزارہا ''گگو گھوڑے'' چڑھا جاتے ہیں۔ چند ایک خوبصورتی سے پینٹ کیے ہوتے ہیں اور باقی محض سرخ مٹی کے سادہ آوے کے پکے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر شخص اپنی اپنی مراد مانگ کر جاتا ہے۔ یہ طفلِ برگزیدہ کون تھا؟ اس بچے کا دادا ایک مقدس برگزیدہ ہستی تھی جو سندھ کے مقام اُچ سے تقریباً چار سو برس قبل لاہور آئے تھے۔ ان کا نام سیّد عثمان شاہ تھا اور ان کا شمار اس زمانے کے لاہور کے جیّد مذہبی علماء میں ہوتا تھا۔ وہ پارکنسن بیماری کا شکار تھے جو مقامی زبان میں چُولے یا لرزش کہلاتی ہے۔ پنجابی اور اردو میں اِسے رعشہ کہا جاتا ہے۔ اس بیماری کی وجہ سے انہیں لاہور میں چولے شاہ، یا زیادہ مؤدبانہ لحاظ سے، چولے شاہ بخاری کہا جانا لگا۔ ان بزرگ کی شہرت اتنی تھی اور وہ اس قدر مؤثر تھے کہ وفات پر انہیں قلعہ لاہور کے اندر دفن کیا گیا۔ اس بزرگ ہستی اور عالمِ دین سے بہت سے معجزات منسوب ہیں۔ چولے شاہ کے بیٹے، جن کا نام سیّد شاہ محمد تھا، اپنے

والد کے گدی نشین ہوئے۔ وہ بھی اپنے علمی کارناموں کی بنا پر شہر میں ایک مقدس ہستی کے طور پر جانے جاتے تھے۔ ان کے بیٹے کا، جو 997ھ میں پیدا ہوا، نام سیّد بہاؤالدین رکھا گیا لیکن جلد ہی پیار سے انہیں چولن شاہ کہا جانے لگا۔ جس کا مطلب ہے وہ شاہ جو جھولوں پر کھیلتا ہو۔ یہ نام ان کے دادا چولے شاہ سے مشتق تھا۔ لاہور کے لوگ کسی نہ کسی وصف کی بناء پر نام رکھنے میں مہارت رکھتے ہیں اس میں ہمیشہ مزاح کا عنصر موجود ہوتا ہے اس کے باوجود سوانگ واضح اور حساس ہوتا ہے۔

جونہی چولن شاہ نے بولنا اور چلنا پھرنا شروع کیا تو واضح ہو گیا کہ وہ خاص تحفۂ قدرت ہے۔ حتیٰ کہ اس کی والدہ نے اپنے خاوند کو بتانا شروع کر دیا کہ بچہ جو کچھ کہتا ہے یا جو خواہش کرتا ہے وہ فوراً پوری ہو جاتی ہے۔ والد نے جو خود بھی ایک عالمِ دین تھے اور ان کے مریدین کی اچھی خاصی تعداد تھی ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوتے تھے کہ وہ بچے کی حفاظت فرمائے اور جو کچھ اس کے حق میں بہتر ہے وہی فرمائے۔ پانچ سال کی عمر میں بہاؤالدین شاہ کو گھوڑوں سے اُنس ہو گیا اور ان پر بڑی مہارت سے سواری کرنا سیکھ گیا۔ لیکن چونکہ اس کے پاس ذاتی گھوڑا نہیں تھا اس لیے وہ لوگوں سے کہتا کہ وہ اسے ان کے گھوڑوں پر سواری کرنے دیں۔ لاہور کے عوام بزرگ عالمِ دین کے بیٹے کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اکثر اسے اپنے گھوڑے پر سواری کی اجازت دے دیتے تھے۔ سواری کے بعد وہ انہیں کہا کرتا کہ اگر ان کی کوئی مراد ہے تو وہ اسے بتائیں جو اسے بتاتے تو وہ اسی وقت ان کو بتا دیتا کہ ان کی مراد پوری ہو گئی ہے اور حقیقتاً وہ پوری ہو جاتی تھی۔

غریب لوگ جن کے پاس گھوڑے نہیں ہوتے تھے وہ طفلِ برگزیدہ کو مٹی کے بنے ہوئے گھوڑے، جنہیں لگّو گھوڑے کہا جاتا تھا، ہی پیش کر دیتے تھے۔ ان کی بھی خواہش پوری ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اس کی شہرت شہر اور گرد و نواح میں پھیل گئی اور جلد ہی اس کے والد کو بھی اطلاع مل گئی کہ ان کا برخوردار لوگوں کو گھڑ سواری کے عوض ان کی خواہشیں پوری کر رہا ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کو بلا بھیجا اور اس کی سخت سرزنش کی۔ کہا جاتا ہے کہ روایت کے مطابق اس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اس چھوٹی سی عمر میں لوگوں کی مرادیں پوری کرنے کے بجائے اسے موت ہی آ جائے تو بہتر ہوتا۔ کہتے ہیں کہ دل شکستہ بیٹے نے آسمان کی جانب دیکھا اور روتے ہوئے اپنے گھٹنوں پر گر گیا اور وہیں ترنت جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ ناراض باپ سکتے میں رہ گیا۔ روایتی کہانی کے مطابق باپ اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواستگار ہوا اور اسے ہدایت ملی کہ جہاں یہ بچہ فوت ہوا ہے اسی جگہ اسے دفن کر دیا جائے کیونکہ بچے نے اللہ تعالیٰ سے زندگی واپس لینے کی التجا کی تھی اور اس کی خواہش کبھی رَد نہ ہوتی تھی۔ مختصر یہ کہ یہ بہت ہی مؤثر کہانی ہے۔

چنانچہ سیّد بہاؤالدین شاہ عرف چولن شاہ عرف گھوڑے شاہ لاہور کا طفلِ برگزیدہ 1003ھ میں اسی مقام پر دفن ہوا جہاں اس نے جان جانِ آفریں کے سپرد کی تھی۔ اس کا مزار انجینئرنگ یونیورسٹی سے شالامار باغ

کی طرف جانے والی سڑک کے بائیں جانب ایک گلی میں واقع ہے۔ گلی کا نام گھوڑے شاہ ہے۔ آج کل وہاں ایک عظیم الشان مزار موجود ہے جہاں سینکڑوں افراد ہر روز اس طفلِ برگزیدہ کو مٹی کے بنے ہوئے گھوڑا کھلونے چڑھاوا چڑھانے آتے ہیں۔ ہزارہا مٹی کے گھوڑا کھلونوں کا اس طفلِ برگزیدہ کے مزار کے چاروں طرف ڈھیر لگا رہتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک، خصوصاً بچوں کے لیے، یہ جذبات کے اظہار کا ایک طریقہ ہے جو وہ زندگی میں ایک بار ضرور کرتے ہیں۔ عقیدہ یہ ہے کہ وہ اب بھی گھوڑا ملنے پر لوگوں کی مرادیں پوری کرتا ہے۔

●○●○●○●

چھ پاکدامن خواتین کی پُراسراریت

پنجاب بھر کے سارے مزاروں اور مقبروں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو لاہور کی چھ مقدس خواتین کی پُراسراریت اور بھید کا مقابلہ کر سکے۔ مقبولِ عام بی بی پاکدامن کی قبریں ہمیشہ سے ہی ایک معمّا رہی ہیں۔ اس گورکھ دھندے کی خوبصورتی یہ ہے کہ لاہور میں یہ واحد مقام ہے جہاں ہر فرقے کے مابین اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔ تاریک دور میں یہ ایک امید کی تصویر ہے۔

گڑھی شاہو میں ڈیورنڈ روڈ کی محاذی سڑک پر کوئین میری کالج کے بالمقابل واقع قبرستان میں ایک چھوٹا سا مقبرہ ہے اور دیگر قبروں کے علاوہ چھ نمایاں قبریں اِن چھ بیبیوں کی ہیں۔ اس قبرستان کی رسائی ایمپریس روڈ سے بھی ہے لیکن ایک تنگ سی گلی میں پیدل چل کر ایک چھوٹی سی مسجد تک پہنچا جا سکتا ہے اور مقبرے تک جو گلی جاتی ہے اس میں دکانوں کی ایک قطار بنی ہوئی ہے جن میں مختلف عقیدوں کے لوگوں کے لیے اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔

اس بارے میں کہ یہ چھ خواتین کون تھیں؟ دو طرح کی روایات مشہور ہیں۔ ایک مقبولِ عام ہے اور دوسری عالم حضرات کی تحقیق شدہ روایت ہے۔ دونوں روایتوں میں خامیاں بھی ہیں اور کشش بھی ہے، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ دونوں کو جتنی سادگی سے ممکن ہو سکے بیان کر دیا جائے اور یہ قاری پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ خود فیصلہ کرے۔

مقبولِ عام روایت کچھ یوں ہے کہ ان چھ قبروں کی تعمیر تقریباً ایک ہزار برس قبل کی گئی تھی اور عوامی روایت کے مطابق یہ مقبرہ حضرت رقیہؓ، کی قبر پر افغانی حملہ آور محمود غزنوی اور اس کے حواریوں نے تعمیر کرایا تھا، جو اسلام کے چوتھے خلیفہ، رسولِ پاکؐ کے چچیرے اور داماد حضرت علی ابنِ ابی طالب کی بیٹی تھیں اور حضرت امام حسینؓ کے کوفے میں ایلچی حضرت مسلم ابنِ عقیل کی زوجہ تھیں۔ ایک اور روایت کے مطابق مقبرہ فی الواقعہ رسولِ پاکؐ کے خانوادے کی چھ خواتین کی قبروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے، جن میں حضرت رقیہؓ بھی شامل ہیں۔ جس کا

مطلب ہوا باقی خواتین حضرت ابنِ عقیلؓ کی بہن اور بیٹیاں ہیں۔

روایت کے مطابق اور یہی اس کی سب سے نمایاں قبر کی لوح پر لکھا ہوا ہے کہ یہاں بی بی حجّ مدفن ہیں۔عوام کا عقیدہ ہے کہ بی بی حجّ حضرت رقیہؓ کا نام تھا اور وہ اپنی چند سہیلیوں کے ہمراہ سانحہ کربلا کے بعد لاہور آئی تھیں۔کہا جاتا ہے کہ ہندو راجہ نے جو اِن دنوں لاہور کا حاکم تھا، ان کی آمد کی خبر پا کر انہیں اپنے دربار میں طلب کیا۔چونکہ یہ خواتین پردہ کرتی تھیں اس لئے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ انہیں موت آجائے۔

چنانچہ زمین شق ہوگئی اور مقدس خاتون اور اس کی ہمراہی دیگر خواتین زندہ دفن ہوگئیں۔اس عوامی روایت میں اختلافی پہلو نکلتے ہیں کیونکہ یہ تو طے ہے کہ حضرت علیؓ کے خانوادے میں بی بی حجّ نام کی کوئی خاتون نہیں تھی۔مزید برآں یہ بھی دلیل دی جاتی ہے کہ سانحہ کربلا کے بعد کسی مسلمان خاتون کا لاہور چلے آنا، کوئی تُک نہیں بنتا جہاں ہندوؤں کی حکومت تھی۔

بہرحال کنہیالال نے لاہور کے بارے میں اپنی کتاب میں ان کا ذکر چھ بہنوں کی حیثیت سے کیا ہے، جن کے نام بی بی حجّ، بی بی تاج، بی بی نور، بی بی حُرّ، بی بی گوہر اور بی بی شہناز تھے۔جو سب عوامی روایت کے مطابق کربلا کے قتلِ عام جو 10 محرم 61ھ بمطابق 10 اکتوبر 680ء کو ہوا، کے بعد مکہ معظّمہ سے روانہ ہو گئی تھیں۔یہی نام اُن چھ قبروں پر لکھے ہوئے ہیں۔کسی ایک کتبے پر رقیہؓ کا نام نہیں ہے حالانکہ جو بھی وہاں حاضری دیتا ہے اسے بی بی حجّ کی قبر رقیہؓ کے نام کی بتائی جاتی ہے۔

ایک جانب ایک لوح پر درج ہے کہ حضرت گنج بخشؒ ہر ہفتے چھ بیبیوں کی فاتحہ پڑھنے کے لیے اس مقام پر کھڑے ہوتے تھے۔اس تحریر سے اس مبینہ حقیقت کو تقویت ملتی ہے کہ قبریں ہزار سال سے پرانی ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو یہ لاہور میں اوّلیں مسلمانوں کی قبریں ہوئیں اور غالباً برصغیر بھر میں قدیم ترین مسلمان قبروں کی نمائندہ قبریں ٹھہرتی ہیں۔

اس بات کا کوئی تحریری ثبوت موجود نہیں ہے اور نہ ہی قتلِ عام کے نتیجے کے طور پر رسولِ پاکؐ کے خانوادے کی خواتین کی کسی ایسی روانگی کا ذکر ملتا ہے۔اسی وجہ سے چند ایک صاحب علم حضرات رقیہؓ کو سیّد احمد توختہ کی بیٹی شمار کرتے ہیں جو بارہویں صدی عیسوی میں لاہور میں رہائش پذیر تھے۔اس کا ذکر کنہیالال کے ہاں ملتا ہے جس کے مطابق بارہویں صدی عیسوی میں ایک عرب، جس کا نام سیّد عابد زاہد ولی اللہ توختہ تھا، لاہور میں آباد ہوگیا تھا۔604ھ میں وفات پر اُسے اندرون شہر میں اکبری دروازے میں واقع محلّہ چہل بیبیاں میں دفن کر دیا گیا۔

اس کی قبر آج بھی موجود ہے جہاں کتبے پر اس کی تاریخِ وفات 604ھ مرقوم ہے۔اس کی تصدیق کے لیے میں قبر پر حاضر ہوا تو اس کی حالت دیکھ کر اس کی قدامت کا اندازہ ہوا۔قبر پر کبھی ایک نہایت نفیس مقبرہ

ہوا کرتا تھا، جسے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے وسیع پیمانے پر نقصان پہنچایا تھا۔ اس قبرستان کو سکھ حکمران نے ہموار کرا دیا اور اس پر غلام محی الدین شاہ پیرزادہ نے اپنی حویلی تعمیر کر لی۔ بہرحال اس نے کمال مہربانی سے سیّد توختہ شاہ کی قبر کو جوں کا توں رہنے دیا۔

آج بھی منہدم شدہ حویلی پیرزادہ کی جگہ پر ایک ذیلی گلی میں تعمیر ایک چھوٹے سے گھر کے ایک جانب سیّد توختہ کی قبر موجود ہے۔ چند ایک صاحبِ علم حضرات اس بات پر بھی قائم ہیں کہ سیّد احمد توختہ کی بیٹی کیچ مکران کے حکمران سے بیاہی ہوئی تھی اور وہیں اس کا انتقال ہوا تھا اور وہ کبھی واپس لاہور نہیں آئی تھی۔ ہم یہ ملاحظہ کرتے ہیں کہ حضرت اسماعیلؒ جن کا مزار ہال روڈ پر ہے، مسلمانوں کے لاہور کو فتح کرنے سے پہلے لاہور آ چکے تھے۔ چنانچہ اغلب ہے کہ چند ایک مسلمان خواتین بھی اُسی زمانے میں لاہور آئی ہوں اور اگرچہ حضرت علیؓ کی حقیقی رشتے دار نہ ہونے کے باوجود سیّد ہوں۔

سیّد توختہ کی چھ بیٹیاں اندرونِ شہر منتقل ہو گئیں اور بی بی پاکدامن کے قبرستان کے نزدیک ایک حویلی میں آباد ہو گئیں۔ وہ اپنی پاکیزگی کی بناء پر مشہور تھیں اور جیسا کہ کہا جاتا ہے وہ ساری کنواری رہیں، اس لیے ان سب کو صیغہ واحد میں بی بی پاکدامن کہا جاتا ہے۔ 615ھ میں جب افغانی حملہ آور سلطان جلال الدین خراسانی نے لاہور کو غارت گری کا نشانہ بنایا تو اردگرد کے علاقوں میں بھی لوٹ مار اور زنا بالجبر کا بازار گرم کر دیا۔ جیسا کہ جنگ جیتنے کے بعد تیمور یہ روایت ہے۔ بدترین حالات سے خائف ہو کر، روایت کے مطابق، چھ کی چھ بہنوں نے اکٹھے مل کر اپنی عصمت کی حفاظت کی دعا کی۔

عین اسی لمحے ایک زلزلہ آیا اور زمین شق ہو گئی اور چھ بہنیں اور ان کی خادمائیں بے حرمتی سے بچنے کی خاطر زندہ درگور ہو گئیں۔ بعدازاں جب مقامی لوگوں نے بہنوں کے کپڑے زمین سے باہر نکلے ہوئے دیکھے تو پھر ان کی مناسب تدفین کر دی گئی۔ یہ قبریں آج بھی دو حصوں میں موجود ہیں۔ ایک طرف حج، تاج اور نور ہیں۔ جبکہ ایک اور احاطے میں حُرّ، گوہر اور شہناز کی قبریں ہیں۔ خادماؤں کی قبریں بھی ان قبروں کی حدود سے باہر موجود ہیں۔

●○●○●○●

بزرگ یا گنہگار۔ مقبرے کی گہری پُراسراریت

یہاں کون آسودۂ خاک ہے؟ کوئی بزرگ یا گنہگار۔ تقریباً ساڑھے تین سو برس سے ایک ایسا سربستہ راز ہے جس کا حل نہیں مل پایا۔ لاہور کے خوبصورت گورنر ہاؤس کے کھانے کے ہال کے نیچے ایک مرقد ہے جس میں یا تو محمد قاسم خان محوخرام ہے، جو مغل شہنشاہ کا ممیرا تھا اور جس نے کشمیریوں کے قتلِ عام کی سربراہی کی تھی۔ یا پھر وہ بزرگ ہستی، سیّد بدرالدین گیلانی مدفون ہیں، جو شہنشاہ شاہ جہان کے پیر باصفا تھے۔

شاید کسی اور شخص نے لاہور کے بارے میں اتنی تفصیل سے نہیں لکھا، جتنا کنہیالال نے لکھا ہے۔ اس کے ادبی فن پارے ''تاریخِ لاہور'' کو مجلسِ ترقیٔ ادب نے دوبارہ شائع کر دیا ہے اور وہ گورنر ہاؤس کے مقبرے کو سیّد بدرالدین گیلانی سے منسوب کرتا ہے جن کا انتقال 1661ء میں ہوا۔ کنہیالال کا کہنا ہے کہ ''مقبرہ'' ان کے انتقال کے چند برس بعد ان کے لواحقین نے تعمیر کرایا پھر بھی ایک تشویش لاحق ہے کیونکہ اس کا دعویٰ ہے کہ مقبرہ شاہ جہان کے عہد میں تعمیر ہوا جبکہ وہ وقت شہنشاہ اورنگ زیب کا بنتا ہے۔

اس نقطۂ نظر کی حمایت معروف محقق محمد طفیل نے اپنے رسالے نقوش کے لاہور نمبر میں کی ہے، جو 1961ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ ایک مصدقہ تحقیقی تحریر ہے۔ کنہیالال نے اپنے نقطۂ نظر میں یہ بیان کیا ہے کہ بزرگ ہستی نے اپنے مقبرے سے عین مغرب میں ایک ''محلّہ'' کی بنیاد رکھی تھی جہاں انہوں نے ایک مسجد بھی تعمیر کی تھی۔ ان کے سراغ پنجاب گزٹیئر کے لارنس گارڈز کی توسیع کے باب میں ڈونلڈ ٹاؤن کی تحریر میں مذکور ہیں۔ چنانچہ معتدبہ مواد موجود ہے کہ اس مقبرے کو تقیّن کے ساتھ سیّد بدرالدین گیلانی کا کہا جا سکتا ہے۔

لیکن پھر دیگر تحقیقات بھی ہیں جیسے ٹی ایچ تھارنٹن، جے ایل کپلنگ، سیّد محمد لطیف اور کرنل ایچ آر گولڈنگ، جو بڑے واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ یہ مقبرہ محمد قاسم خان کا ہے جو شہنشاہ اکبر کا ممیرا تھا جو اسی زمانے میں فوت ہو گیا تھا یا قتل کر دیا گیا تھا۔ قاسم خان کی کوئی مزید تفصیلات یا اس شریف آدمی کی کم از کم معقول تفصیل یا ثبوت ملا ہی نہیں۔

بہر حال مولوی نور احمد چشتی اپنی مشہور تصنیف ''تحقیقاتِ چشتی'' میں دعویٰ کرتے ہیں اور گنجلک میں مزید اضافہ کر دیتے ہیں کہ ایک شخص کا نام قاسم خان میر بحر تھا، جو اکبر کے مغلیہ دربار میں چمن آرا خراساں اجلہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جو بے حد عزت و توقیر کا حامل تھا اور کشمیر کی خونیں فتح کا ذمہ دار تھا۔ شہنشاہ اس سے اس قدر خوش ہوا کہ اسے کابل کا صوبیدار (گورنر) مقرر کر دیا، لیکن پھر خوفناک قبائلی رقابتوں کی وجہ سے اسے لاہور طلب کر لیا گیا۔ یہاں معروف چمن آراء خراساں کو، چشتی صاحب کے مطابق، ایک اور شخص زمان خان ولد شاہ رخ مرزا نے قتل کر دیا۔ ایک ذریعہ کا دعویٰ ہے کہ اس کی لاہور واپسی اور قتل کا منصوبہ مغلیہ دربار کا ہی شاخسانہ تھا۔ قتل کی تاریخ 1660ء تھی۔ بلوچ مان نے ''آئینِ اکبری'' کے ترجمے میں چمن آرا خراسان کو کابل کا گورنر لکھا ہے۔ ''اجلہ'' کا مطلب ''بیڑا بنانے والا'' (کشتی بنانے والوں کی طرح)۔

تاہم چشتی، قاسم خان کے گنبد کی تفصیل بتاتے ہوئے اسے اسلحہ خانے کے مغرب میں، انارکلی اور ساندہ کے درمیان بتاتا ہے۔ انہوں نے مقبرے کی تفصیل شرح سے بیان کی ہے جن میں سے کوئی ایک بھی گورنر ہاؤس کے مقبرے سے نہیں ملتی۔ ان تقیّنہ احوال سے پُراسرایت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ مقام اور تفصیلات سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نابھہ روڈ پر حضرت موج دریاؒ کی خانقاہ کا ذکر کر رہے ہیں۔ مولوی نور احمد چشتی اپنی صحتِ تحقیق کے لیے مشہور ہیں اور اسی لیے مقبرے کے قاسم خان کی ملکیت کے نقطۂ نظر کے بارے میں معقول شکوک موجود ہیں۔

یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ سیّد محمد لطیف نے اپنی کتاب اور محمد باقر نے اپنی کتاب ''لاہور ___ ماضی اور حال'' جو 1952ء میں شائع ہوئی تھی، دونوں نے مہدی قاسم خان کے باغ کا ذکر کیا ہے جو کربلا گامے شاہ کے نزدیک چھوٹے راوی کے کنارے پر واقع تھا۔ لطیف اس کا محلِ وقوع حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار سے جنوب مغرب میں بتاتا ہے لیکن پھر وہ یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ مہدی قاسم خان 1590ء میں قتل ہوا تھا اور اکبر نے اس کی یاد میں ایک مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ اس تحریری معتبر بیان کے پیشِ نظر اور مولوی نور احمد چشتی کی تفصیلات کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص بھی آسانی سے قیاس کر سکتا ہے کہ گورنر ہاؤس میں موجودہ مقبرہ قاسم خان کا نہیں ہے اور کچھ ثبوت یہ بھی ہیں کہ یہ مہدی قاسم خان کا بھی نہیں ہے۔ لیکن پھر چشتی کی تفصیلات بے ربطیوں کا شکار رہی ہیں یہی وجہ ہے کہ دیگر محققین یہ یقین رکھتے ہیں کہ اس مقبرے کے قاسم خان کے ہونے کا امکان زیادہ معتبر ہے۔

لیکن کنہیا لال کی تفصیلات اس معاملے میں زیادہ مدلل نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیّد بدر الدین گیلانی کا دعویٰ بھی کبھی جھٹلایا نہیں گیا ہے لیکن پھر یہ بھی تو سوچیے کہ اس مقبرے پر قاسم خان کے حق کو بھی تو جھٹلایا نہیں گیا۔ تکلیف اس بات کی ہوتی ہے کہ مغلیہ دور کی مشہور اور مستند تاریخ کی کتابوں اور وقائع نگاروں کی تفصیلی رودادوں میں اس بارے میں کوئی شہادت نہیں ملتی۔ اکبر کے دربار لاہور میں 29 قاسم خان موجود تھے،

جن میں چند ایک ہماری موجودہ افسر شاہی کی طرح تین سے زیادہ شہنشاہوں کی خدمت بجالاتے رہے۔ سب سے مضبوط صورت حال ایک قاسم کی ہے جو مراد بیگم، جو مغلانی بیگم کے نام سے بھی مشہور تھی، کی خدمت پر معمور تھا۔ اس کو جمعدار کا خطاب ملا ہوا تھا یہاں یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ ان میں سے کسی ایک کا بھی اس مقام پر مقبرے میں مدفون ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

بہت سے ذرائع سے سیّد بدرالدین گیلانی کا دعویٰ مضبوط ترین ہے اور جیسا کہ تمام مقدس ہستیوں کے ساتھ ہوتا ہے ان کے لواحقین ان کے مقبرے تعمیر کر دیتے ہیں تا کہ معاشرے میں معاشی اور معاشرتی فائدے اٹھا سکیں قاسم خان کا معاملہ بھی بہت مضبوط ہے اور اس پر خاصی حد تک یقین بھی کیا جاتا ہے۔ معاشرتی سائنسدان ہونے کے ناطے ہم گورنر ہاؤس کے کھانے کے ہال کمرے کے نیچے مدفون شخص کے بارے میں حتمی نشاندہی نہیں کر سکتے۔ یہ ہمیشہ ہمیشہ یونہی پراسرار رہے گا جب تک کوئی محقق نہایت اشد ضروری شہادت نہ فراہم کر دے۔

●○●○●○●

لاہور کی تین مؤثر ہستیوں سے محرومی

لاہور لوگوں سے عبارت ہے، فی الواقعی غیر معمولی لوگوں سے۔ سادہ لوح، غیر معروف لاہوری، سب کے سب اندرونِ شہر کے کسی نہ کسی محلے سے ہوتے ہیں۔ چند ایک نام پیدا کر جاتے ہیں دیگر گمنامی میں فوت ہو جاتے ہیں، لیکن ہوتے سب کے سب غیر معمولی ہی ہیں۔ غیر ضروری افراتفری کے موجودہ ایام میں اطمینان کی مثال بن کر۔

عبداللہ ملک کے جنازے پر ہر عمر کے صحافیوں سے ملاقات ہوئی۔ مختلف میلانِ طبع کے حامل، ہر رنگ و روپ کے ایسے احباب جن سے پچھلے پچیس برس میں ملاقات نہ ہو پائی تھی۔ جب پاکستان ٹائمز ہی واحد انگریزی اخبار ہوا کرتا تھا۔ اسی ادارے کا اردو روزنامہ ''امروز'' تھا جو معاشرے کے ایسے عمدہ طبقے کی ذہنی بالیدگی کیا کرتے تھے جن کا آج چند لوگ ہی تصور کر سکتے ہیں۔ عبداللہ ملک ان دونوں اخباروں میں لکھا کرتے تھے جو دونوں ہی ہر لحاظ سے لفظ ''ترقی پسند'' پر کاربند تھے۔ ایک بار پھر لاہور کے صحافیوں کی وہ پوری برادری اکٹھی ہو گئی تھی جیسا کہ وہ اُن دنوں میں ہوا کرتی تھی جب رواداری ایک متوقع وصف سمجھا جاتا تھا۔ نمازِ جنازہ پڑھانے والے امام صاحب نے طویل ترین دعا پڑھی جو میرا پہلا اتفاق تھا۔ ہر شخص اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہتا پایا گیا۔ عبداللہ ملک کے خاندان میں اختلافِ رائے ایک متوقع طرزِ عمل تھا اور مذہب نہایت ذاتی معاملہ تھا اور اس پر بطور مسئلہ کبھی بحث نہیں ہوئی تھی کم از کم کھلے بندوں کبھی نہیں۔ یہ بداخلاقی گردانی جاتی تھی۔

کسی اور موقع کی نسبت جنازے پر لوگ مدت مدید کے بعد بھی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ہر بات معاف کر دی جاتی ہے۔ ہمارے معاشرتی دستور میں یہ ایک غیر معمولی ناگزیر عمرانی زنجیر ہے۔ کوچہ چابک سواراں کا یہ شخص، اصل گھڑ سواروں کا نواحی علاقہ، وہ ککے زئی علاقہ، جہاں لوگ پیدا ہی بحث کرنے کے لیے ہوتے ہیں لیکن بالآخر ہر بحث کو نہایت رکھ رکھاؤ کے ساتھ سمیٹ لیتے ہیں۔ بعینہٖ ملک عبداللہ پوری زندگی کو نہایت سلیقے سے سمیٹنے میں کامیاب رہے جو معدودے چند لوگ ہی کر پاتے ہیں۔ اس لحاظ سے انہوں نے ہمیشہ نہایت وقار

سے زندگی بسر کی اور ان کی یکسر لاہوری پرورش نے انہیں ایسا مامون کیا کہ انہیں کوئی گرہَ احساس لاحق نہ رہا۔ اعجاز بٹالوی جو خاصے کمزور دکھائی دے رہے تھے۔ سابق صدر رفیق تارڑ کو بتا رہے تھے کہ وہ ایسے عہد اور طبقے سے تعلق رکھتے تھے جہاں حدود واضح طور پر متعین تھیں۔ آغاز ہی سے یا تو آپ برطانیہ کے طرفدار تھے یا پھر مخالف اور آزادی کے حمایتی۔ بعدازاں یا تو آپ آزادی اور جمہوریت کے حامی تھے یا اس کے برخلاف۔ وہ نہایت بیدار مغز تھے اور سادہ منش۔ باریش سابق صدر نے رضامندی کے طور پر سر کو جنبش دی۔ اگر جلال کی وجہ سے نہیں تو شاید پاکستان کے سب سے قابلِ احترام وکیل اور استاد کی تائید میں ایسا کیا ہو۔

مجھے بچپن ہی سے عبداللہ ملک کو دیکھنے اور ملنے کا موقع مل گیا تھا کیونکہ وہ میرے والد کے دوست تھے اور ماڈل ٹاؤن کے جے بلاک میں میرے دادا کے گھر والی سڑک کے عین پار رہا کرتے تھے۔ میری دادی نے انہیں اندرون شہر بطور استاد سکول میں پڑھایا تھا اور ملک صاحب ہمیشہ ان سے تعظیم سے پیش آتے تھے حتیٰ کہ جب وہ بہت ضعیف ہوگئی تھیں اور لڑکھڑاتی چال سے ڈاکٹر کے پاس ٹیکا لگوانے جاتی تھیں تو جب تک وہ روانہ نہ ہو جاتیں وہ ساکت کھڑے رہتے تھے اور ان کا سر نہایت تعظیم سے جھکا ہوتا تھا۔ وہ یکسر دل کی گہرائیوں تک ایک غیر معمولی لاہوری تھے۔

لیکن پھر ان کے جنازے نے ایک اور جنازے کی یاد دلا دی جس میں مَیں نے نومبر 1984ء میں ماڈل ٹاؤن کے اسی جی بلاک کے قبرستان میں شرکت کی تھی اور وہ جنازہ فیض احمد فیض کا تھا۔ جو بات مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کس طرح ایک اور عظیم پنجابی شاعر اپنے بچھڑنے والے دوست کے جنازے میں شرکت کے لیے پہنچا تھا اور میں عظیم لاہوری شاعر استاد دامن کی بات کر رہا ہوں۔ یہ عظیم شخص شدید بیمار تھا اور تقریباً چلنے پھرنے سے قاصر، لیکن وہ کسی نہ کسی طرح جنازے میں شرکت کے لیے ایک رکشہ میں پہنچ گیا تھا۔ جن لوگوں نے اچھے دنوں میں ان کا پہلوانوں والا جُثہ دیکھ رکھا تھا ان کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا کہ استخوانی پنجر کی طرح دامن دو افراد کی مدد سے چل رہا تھا۔ فیض اور دامن کی باہمی دوستی بہت گہری تھی اور فیض کے انتقال سے چند روز قبل دونوں نے اکٹھے منو بھائی کے ہاں عشائیے میں شرکت کی تھی۔ فیض کے جنازے پر استاد دامن بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ اب ان کی باری ہے۔ چنانچہ فیض کے انتقال کے فقط 13 روز بعد 3 ردسمبر کو دامن اپنے دوست سے جا ملا۔

استاد دامن کا اصل نام چراغ دین تھا اور وہ اندرون شہر کے لوہاری دروازے کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے اپنے صلاح کار ''استاد ہمدم'' کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے پہلے پہل ''دمدم'' تخلص اختیار کیا لیکن پھر کچھ ہی عرصے بعد ''دامن'' رکھ لیا۔ اپنی پہلی نظم دامن نے آل انڈیا کانگریس کے جلسے میں، جو موچی دروازے میں منعقد ہوا تھا، پہلی بار سٹیج سے عوام کے پنڈال میں سنائی۔ اس جلسے کے نمایاں مقرر جواہر لال نہرو تھے جنہوں نے

فوراً دامن کے ساتھ ذاتی تعلق قائم کرلیا۔ بہت برسوں بعد جب دامن ایک پاک و ہند مشاعرے میں شرکت کے لیے دہلی گیا تو اس نے اپنے اشعار سے مشاعرہ لوٹ لیا اور حاضرین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''لالی اکھیاں دی پئی دَسدی اے، رُوئے تسی وی او، روئے اَسی وی آں'' (آنکھوں کی سرخی بتا رہی ہے کہ ہم دونوں روئے ہیں۔)

پنجاب کی تقسیم سے دامن کو بُری طرح صدمہ پہنچا تھا۔ وہ دوستوں اور شاگردوں، جن میں زیادہ تر ہندو اور سکھ تھے، کے بچھڑنے پر ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ ان کی مصیبتوں میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب لاہور میں لوٹ مار کے اس دور میں ان کی شریکِ حیات کا انتقال ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ قبرستان تک جنازہ لے جانے کے لیے دامن کو مزدوروں کو کرائے پر حاصل کرنا پڑا تھا۔ اس حادثے نے انہیں ایک درون بین شخص بنا کر رکھ دیا اور وہ شہر کی ایک کوٹھڑی میں منتقل ہو گئے۔ دہلی میں نہرو نے فی الواقعی استاد دامن سے التجائیں کیں، حتیٰ کہ پاؤں کو بھی چھوا کہ وہ ہندوستان میں قیام کرلیں۔ انہیں معقول پنشن اور بے حد عزت مندانہ زندگی بسر کرانے کا بھی وعدہ وعید کیا گیا، لیکن دامن دل کی اتھاہ گہرائیوں تک لاہوری تھے اور ہر غیور لاہوری کی طرح وہ شہر کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ مکمل غربت اور جبر کی زندگی کی جانب لوٹ آئے۔ باقی ماندہ زندگی انہوں نے مجرد تارک الدنیا کی حیثیت سے بسر کی۔

عبداللہ ملک کے جنازے پر میں کھڑا ہوا اس جگہ کو بغور دیکھ رہا تھا جہاں استادِ کلاں رکشے سے اترا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک بار عبداللہ ملک نے مجھے اس واقعہ کے حوالے سے کہا تھا۔ ''ایک دن ایسا آئے گا جب ہم نہیں ہوں گے، جب لاہور کے عوام ماتم کناں ہوں گے کہ ہمارے جاہل اونچے طبقے کے حکمران اس شہر کے نفیس ترین خواتین و حضرات کے ساتھ کیسا ناروا سلوک کرتے رہے ہیں۔''

اینان آزادیاں ہتھوں برباد یارو
ہوئے تسی وی او، ہوئے اسی وی آں

●○●○●○●

کپلنگ اور کِم کے بارے میں

برطانوی دور کی دیرپا میراث میں سے ایک جسے بڑے اشتیاق سے یاد کیا جاتا ہے وہ رڈیارڈ کپلنگ اور اس کا مشہور کردار کِم ہے، جو اس کی کتابوں میں سے ایک کا عنوان بھی ہے۔ لاہور کی مال روڈ پر کِم توپ نصب ہے جسے اُس کے عرفی نام "بھنگیوں والی توپ" سے بھی پکارا جاتا ہے، یعنی بھنگی قبیلے کی توپ۔

رڈیارڈ کپلنگ، جیسا کہ ہمیں علم ہے، سابقہ لاہور سکول آف آرٹس اور موجودہ نیشنل کالج آف آرٹس کے پرنسپل، لاک وڈ کپلنگ کا بیٹا تھا۔ درمیانی وقفے میں لارڈ میوؔ کے نام پر میو سکول آف آرٹس بھی کہلاتا رہا ہے۔ اسی کے نام پر میوؔ ہسپتال لاہور بھی قائم کیا گیا تھا۔ پہلے پہل رڈیارڈ کپلنگ کو رضا کار دستے میں بھرتی کرا دیا گیا، جہاں وہ پنجاب اوّل رضا کاروں کی کمپنی "بی" میں تھا۔ لیکن جب نوعمر رڈیارڈ کپلنگ کبھی پریڈ میں حاضر ہی نہ ہوا تو کمانڈنٹ کرنل گولڈنگ نے، مقررہ وظیفے کی رقم، جس کا وہ حقدار نہ تھا، ادا کرتے وقت ایک بے تکلف خط میں فرض ادا نہ کرنے پر برملا افسوس کا اظہار کیا تھا۔

وہ فوجی بننے کے لیے پیدا ہی نہ ہوا تھا۔ اس نے دیگر پیشوں کی بھی کوشش کی لیکن چونکہ وہ اپنی خراب بینائی کی وجہ سے کسی بھی سرکاری نوکری کے قابل نہ تھا اس لیے اس کے والد نے سرڈیوڈ میسن کی سفارش ڈھونڈی جو اس وقت لاہور کے روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کا مالک تھا، تاکہ وہ لڑکے کو صحافت کے شعبے میں قسمت آزمائی کا موقع دے کیونکہ وہ "عجیب اور طویل کہانیاں" لکھنے کا بڑا شوقین تھا۔

اسے سو روپے ماہانہ پر ملازم رکھ لیا گیا اور وہ فوراً ایک مختصر افسانہ لکھنے پر لگ گیا۔ کرسمس کا زمانہ تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ روزنامے کے "کرسمس نمبر" میں کپلنگ خاندان کے چار افراد، باپ، ماں، بیٹا اور بیٹی کی الگ الگ قلمی معاونت شاملِ اشاعت تھی۔ ایچ آر گولڈنگ کے مطابق "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کا وہ خاص شمارہ لندن کے سَدوبیز نیلام گھر میں ایک گراں رقم میں فروخت ہوا۔ اگرچہ رڈیارڈ کپلنگ نے اپنی ملازمت کا ذکر مایوسانہ الفاظ میں کیا تھا۔ اس کی اوّلین تحریر کو پڑھ کر ایک کہنہ انگریز صحافی نے اسے بتایا کہ "صحافت کا آغاز ٹیلی

گرام کے تراشے چپکانے اور خبروں کی کاٹ پیٹ سے کیا جاتا ہے۔'' لاہور سے منصۂ شہود پر آنے والے انگریزی ادب کے عظیم مصنف کے لیے یہ کوئی سہل بپتسمہ نہ تھا۔

رڈیارڈ کپلنگ کی صحافت میں وقفہ اس وقت آیا جب 1885ء میں امیرِ افغانستان ہندوستان کے دورے پر آیا۔ رڈیارڈ کپلنگ اس کے وفد میں پشاور ہی سے شامل ہو گیا اور روالپنڈی تک ان کے پابہ رکاب رہا۔ افغان بادشاہ کے بارے میں اپنی شگفتہ اور خیالی رودادوں کی وجہ سے لوگوں کی حیطۂ نظر میں آ گیا اور پھر اس نے پیچھے مُڑ کر نہ دیکھا۔ وہیں سے اُس نے ''گریٹ گیم'' کے بارے میں لکھنا شروع کیا۔ افغانستان کے بارے میں برطانوی اور روسی رقابت اور گرم پانیوں تک رسائی کی چٹیک، ان کی باہمی رقابت کے بارے میں اس کی ترسیمی لفاظی کی وجہ سے آج تک یہ خطے اہلِ یورپ کی نظر میں ہیں۔

ناول ''کِم'' (KIM) اس کی بہترین تخلیق تسلیم کی جاتی ہے۔ کِم کے کردار نے لوگوں کو ہمیشہ مسحور کیا ہے۔ حقیقت میں یہ کِم کون تھا؟ ایک اچھی خاصی تحقیق انگریز لڑکے کِم کے کردار کے بارے میں ہو چکی ہے جو انارکلی میں گھومتا پھرتا تھا اور دیوہیکل بھنگیوں والی توپ پر، جو عجائب گھر لاہور کے باہر نصب ہے، کھیلا کرتا تھا۔ ایک نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ یہ ایک صاحب ایف بیٹّی کے حقیقی کردار پر مبنی ہے جو بطور پولیس آفیسر 1922ء میں کوئٹہ سے ریٹائر ہوا تھا۔ بیٹّی صاحب کا والد اُن اولیں انگریزوں میں سے تھا، جو 1849ء میں سکھوں کی شکست کے بعد لاہور آئے تھے۔

وہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں کلرک تھا اور ان بارکوں میں مقیم تھا، جنہیں بعد ازاں مسمار کر کے وہاں پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس کی عمارت تعمیر کی گئی۔ نوعمر بیٹّی ہندوستانی لڑکوں کے ساتھ، جنہیں ایک تحریر میں ''چھوکرے'' کے لفظ سے موسوم کیا گیا ہے، کھیلتا تھا اور انہی کی طرح اٹھتا بیٹھتا اور گالیاں دیتا تھا۔ اسے اکثر پرانی توپ کے اوپر بیٹھے دیکھا گیا تھا اور چونکہ اس کے عین مقابل کوارٹروں میں رڈیارڈ کپلنگ خاندان رہتا تھا، اس لیے وہ ضرور اس بیٹّی سے واقف رہا ہو گا۔ اگر بالفرضِ محال وہ اسے ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا تو اس ننھے شیطان کو (جیسا کہ اس کے بارے میں ایک تحریر میں درج ہے) نظر انداز کرنا بہت مشکل تھا۔

جب ایف بیٹّی نے پولیس میں ملازمت کر لی تو اس کی تعیناتی بلوچستان میں ہو گئی تو بلوچوں کو دوست بنانے اور اس وقت کے اُجاڑ کوئٹہ میں امن قائم کرنے میں اس کے صریحاً بے خطر انداز کی وجہ سے بڑی مدد ملی۔ اس کے ''ہندوستانی طریقوں'' نے یقیناً اس خطے کے لوگوں کو سمجھنے میں اس کی بے حد مدد کی۔ بیٹّی کی مہم جوئی کی وارداتیں یقیناً رڈیارڈ کپلنگ تک پہنچی ہوں گی اور اس کے لیے یہ خاصا مواد تھا کہ وہ ایک قابلِ بیان کہانی کی تخلیق کر سکے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک اخباری تحریر میں بیٹّی کو ''بلوچستان کا حسن'' کہا گیا ہے۔

ایک اور کردار کا بیان خارج از دلچسپ نہ ہو گا جس کا نام برائن تھا۔ افواہ تھی کہ برائن انگریز باپ اور

لاہوری ماں کی اولاد تھا۔ باپ ایسٹ انڈیا میں کلرک تھا اور اس جگہ کے قریب مقیم تھا جہاں آج کل کپورتھلہ ہاؤس ہے۔ اینگلو انڈین بچہ بہت گورے رنگ کا تھا اور اس کے بال بھورے تھے۔ وہ سڑکوں پر ننگے پاؤں پھرتا رہتا تھا اور شستہ انگریزی اور ٹھیٹھ پنجابی بول لیتا تھا۔

دن کے وقت وہ ''ٹکہ گاڑی'' چلایا کرتا تھا جو اس کی بیوہ ماں کی ملکیت تھی۔ چنانچہ نوعمر یتیم برائن مشہور توپ پر بیٹی کی طرح کھیلا کرتا تھا۔ اس لیے اس بارے میں کہ ان دونوں میں سے کون سا کِم اصلی تھا، محض قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔ برائن کے ساتھ کیا پیش آیا؟ زیادہ علم نہیں ہو سکا کیونکہ عین ممکن ہے کہ اسے کوئی سرکاری نوکری مل گئی ہو اور اس کی ہر قسم کی نسلوں اور زبانوں سے وابستگی کی صلاحیت کا بھرپور استعمال کر لیا گیا ہو۔ یہ ضرور علم میں آیا ہے کہ اس کی ایک بہن کی کمپنی کے کلرک سے شادی ہو گئی تھی۔

یہاں یہ یاد رکھنا بے حد ضروری ہے کہ انگریز، جب تک ایسٹ انڈیا کمپنی اقتدار میں رہی، مقامی آبادی سے خوب گھل مل کر رہتے تھے۔ یہ تو 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد جب تاج برطانیہ نے انتظامی امور اپنے ہاتھ میں لیے تو مقامی آبادی سے علیحدگی کی سرکاری حکمت عملی اپنائی گئی۔ چنانچہ کِم، باہمی روابط کے دنوں کی پیداوار تھا۔ ایک ایسی پیداوار جس نے آنے والے ایام میں انگریزوں کی بہت مدد کی۔

کِپلنگ کی کہانیوں اور کِم میں اپنا سحر ہے۔ اس سحر کی نوعیت سمجھنے کے لیے لاہور آنا لازمی ہے۔ کِم ناول میں مذکورہ تمام مقامات اور اشیاء یہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ بہت خالص میراث ہے۔ ایسی میراث جسے بہتر طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔

●○●○●○●

سول اینڈ ملٹری گزٹ نے چرچل کی زندگی کو کیسے سنوارا؟

بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ ایسے افراد کی ایک وسیع قطار ہے جو لاہور آئے بعد ازاں اپنی حیات ہی میں تاریخ میں نام پیدا کر گئے۔ انگریز راج میں جو افراد زیادہ معروف ہوئے ان میں رکپلنگ خاندان کے باپ اور بیٹا، سر ونسٹن لیونارڈ سپنسر چرچل ہیں، جو جنگِ عظیم دوم کے دوران مشہور برطانوی وزیراعظم اور اپنے دور کے اعلیٰ ترین معیار کے مقرر رہے ہیں۔

لاہور کے بارے میں تحقیق کے دوران جن دلچسپ ترین ذرائع نے مجھے خاصا لبھایا، ایک تو رکپلنگ کی وہ دستاویز جو بنیادی طور پر لاہور پر مرتکز ہیں اور دوسرے چرچل کے ہندوستان میں قیام کے دوران اس کی مکمل دستاویز۔ میری بیٹی نے، جو کیمرج میں رہتی ہے، مجھے اچھا خاصا مواد بھیجا ہے جو سر ونسٹن چرچل اور ان کی صحافت اور لاہور کے سرکردہ روزنامہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' میں ان کی یورشوں سے متعلق ہیں۔ یہ لاہور کی روزمرہ زندگی کا نہایت اہم پہلو ہے جس کے بارے میں کوئی خاص تحقیق نہیں کی گئی ہے۔ اگر اس پہلو پر بھی دو وجوہات کی بناء پر سرسری جائزہ لیں تو یہ ہمارے قدیم شہر سے انصاف ہوگا۔ اوّل تو ہمارے شہر کے اس اہم پہلو پر مزید تحقیق پر آمادہ کیا جائے اور دوم اُن ماہرین کے علم میں اضافہ کیا جائے جو اس موضوع پر اخباروں میں تحریر کرتے رہتے ہیں۔

برطانوی ہندوستان میں حاصل کردہ تجربے کی بناء پر ہی اس نے اپنا عالمی نقطۂ نظر استوار کیا۔ روس سے متعلق ہر معاملے پر اس کی پیدائشی نفرت کی تصدیق اس کے شمال مغربی سرحد میں تجربات اور روسیوں سے بھرے افغانستان میں ان کی جاسوسی کی مہمات سے ہوتی ہے۔ اس قسم کا مواد جسے رکپلنگ نے اپنی تحریروں میں استعمال کیا۔ چنانچہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نامہ نگار کی حیثیت سے انہیں ''عظیم کھیل'' کا تجربہ ہوا۔ یعنی عالمی تسلط اور بحرالہند کے گرم پانیوں تک رسائی کے مقابلے کی دوڑ۔ باقی ماندہ زندگی انہوں نے اس ''عظیم کھیل'' کو جیتنے کی کوششوں میں بسر کی، اگرچہ یہ جنگیں اس مقام سے بہت دور دراز کے علاقوں میں لڑی گئیں۔

جنگ واٹر لُو نے برطانوی خانہ جنگی کے واقعات کے بعد سے راندۂ درگاہ ڈیوک آف مارلبرو کے

خاندان کو ایک بار پھر امتیازی حیثیت عطا کر دی۔ وہ برطانوی خانہ جنگی میں پارلیمانی پارٹی کے رکن تو نہ تھے لیکن سرتاپا بادشاہی خاندان کے ایک فرد تھے۔ وہ 1874ء میں پیدا ہوئے۔ مشہور فوجی تربیت گاہ سینڈھرسٹ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1894ء میں گھڑسوار فوج کے دستے حصار چہارم میں تعینات ہو گئے۔ انہیں جنگ کا اوّلیں مختصر تجربہ ہسپانوی افواج کے ہمراہ لڑتے ہوئے ہوا جو کیوبا کے گوریلوں کے خلاف جنگ آزما تھیں۔ تھوڑے عرصے کے بعد وہ گھر لوٹ آئے اور پھر اُنہیں ہندوستان بھیج دیا گیا۔ وہاں جاتے ہی ہندوستانی فوج کے ہمراہ شمال مغربی صوبہ سرحد میں مشہور مالاکنڈ مہم میں بپھرے ہوئے قبائلیوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ انہی ایام کا واقعہ ہے کہ نوجوان ونسٹن چرچل لاہور آئے اور ایک روز روزنامہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے دفتر گئے اور انہیں شمال مغربی صوبہ سرحد میں جنگی نامہ نگار کی حیثیت سے کام سونپ دیا گیا۔ یعنی وہ فوجی اور صحافی کے دہرے پیشے سے منسلک ہو گئے۔ یہ بطور صحافی ان کے شاندار پیشے سے وابستگی کا آغاز تھا۔ چنانچہ دیگر اشیاء کے علاوہ انہیں ہندوستان، افغانستان، سوڈان اور آخر میں جنوبی افریقہ کے ممالک سے خبریں ارسال کرتے ہوئے پایا گیا۔

پہلی نمایاں سلسلہ وار خبریں مالاکنڈ کی میدانی فوجوں کے بارے میں تھیں۔ اس کے فوراً بعد تیرہ مہماتی فوج کے قابلِ ذکر کارناموں کے بارے میں نہایت شاندار سلسلہ وار خبروں کی ترسیل تھی۔ اس کے علاوہ الگ الگ صحافتی فن پاروں پر مبنی سلسلہ وار تحریریں بھی قابلِ ذکر ہیں جو افغانستان کے اندر دور دراز علاقوں سے لے کر سمرقند تک، ان کی جاسوسی مہمات کے بارے میں تھیں۔ یہ صحافتی فن پارے 21 فوجی مراسلات پر مشتمل تھے جو بعد ازاں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ ان فوجی مراسلات کے معیار کا ذکر، کپلنگ کی دستاویزات میں ملتا ہے جو برطانوی عجائب گھر میں موجود ہیں۔ یہ اُن دنوں کی برطانوی سوچ کو سمجھنے میں خاصی مدد دیتے ہیں۔ لیکن ونسٹن چرچل کی کہانی میں لاہور کی گنجائش کہاں نکلتی ہے؟ اس کی وضاحت، کپلنگ کی ڈائری میں کی گئی ہے۔

''آج مجھے لارڈ رینڈولف چرچل کا بیٹا ملنے آیا جو ڈیوک آف مارلبرو ہفتم کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔ وہ گھڑسوار دستے میں بہادر آفیسر ہے۔ خوبصورت ہے، خوش طبع، پُرجوش اور ہر دل عزیز ہے۔ وہ ایک نہایت شاندار جنگی نامہ نگار بنے گا کیونکہ وہ مہم جوئی کے علاقے کے عین بیچوں بیچ تعینات ہے۔'' چنانچہ ایک اور عظیم انگریز کے صحافیانہ پیشے کا آغاز لاہور ہی سے ہوا۔ مجھے یاد ہے میرے والد نے، جو خود ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے ایڈیٹر تھے، مجھے بتایا تھا کہ جس کرسی پر میں بیٹھا تھا وہاں کبھی سر ونسٹن چرچل بیٹھا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی کہانی میرے لیے ہمیشہ دلکش رہی ہے۔

سول اینڈ ملٹری گزٹ کے جنگی نامہ نگار کی حیثیت سے چرچل کے تجربات اس عظیم شخص کی پہلی کتاب کی شکل میں منتج ہوئے۔ اس کتاب نے، جس کا عنوان تھا ''مالاکنڈ کی میدانی فوج کی کہانی'' فوراً کامیابی کو چوم لیا اور اس پیشے کی بنیاد رکھ دی جس کی بلندیوں کو چھونا بہت کم لوگوں کو اپنی زندگی میں نصیب ہوتا ہے۔ اس سے

چرچل کے ادبی پیشے کا بھی آغاز ہو گیا۔ اوّلیں اشاعت میں اس کتاب کے لکھے جانے میں سول اینڈ ملٹری گزٹ کے کردار کا ذکر موجود ہے۔ اُن کی دوسری کتاب کا عنوان ہے ''دریا کی جنگ'' جو سوڈان میں اُن کے مشاہدات پر مبنی ہے، جہاں وہ جنرل کچنر کی مہماتی فوج میں شامل تھے۔ آخری روایتی جنگوں میں سے ایک میں وہ ''جنونی درویشوں'' سے نبرد آزما ہوئے، جس میں گھڑ سوار دستوں کے حملوں کا بندوبست تھا۔ اس جنگ سے اُن کے ذہن میں مسلمانوں کے متعلق گہرے شکوک وشبہات جاگزیں ہو گئے جس کا بیج شمال مغربی صوبہ سرحد اور افغانستان میں ان کے مشاہدات کے دوران بویا جا چکا تھا اور جس نے بعد ازاں زندگی میں اُنہیں اسرائیل کے مؤقف کی حمایت پر مائل کیا۔ ستم ظریفی کی بات ہے کہ اس دوسری کتاب پر، کپلنگ نے لاہور میں نظر ثانی کی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ایک ناول لکھا۔ پھر چرچل لندن کے روزنامہ ''مارننگ پوسٹ'' کی جانب سے جنگ بوئیر کی وقائع نگاری کے لیے جنوبی افریقہ چلے گئے۔ ان کے مراسلات کو چرچل کی اجازت سے مارننگ پوسٹ سے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں مکرر شائع کیا جاتا تھا۔ ایک مہینے کے اندر اندر وہ قید بھی ہوئے اور پھر قید سے فرار بھی ہو گئے۔ اپنے فرار کی داستان بیان کرنے پر وہ پوری دنیا میں مشہور ہو گئے۔ یہ ان کے سیاسی پیشے کا آغاز تھا باقی کہانی تاریخ ہے۔

سر ونسٹن چرچل نے اپنی کتابوں اور خطوط میں لاہور کے بارے میں ڈھیروں لکھا ہے۔ انہوں نے توجیح کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ ایک روح پرور شہر ہے، جس کا اپنا دماغ ہے۔ اس کا حسن دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ یہ آپ کو اپنے حسن کی طرف مائل کرتا ہے۔'' لاہور میں اپنے ایک دوست کو خط میں تحریر کرتے ہیں۔ ''مجھے تم پر رشک آتا ہے کیونکہ تم لاہور کی راحتوں کے مزے لیتے ہو۔'' لیکن نوجوان چرچل کا حقیقی شوق اس کی پولو کے کھیل سے محبت تھی۔ لاہور پولو کلب کے سرکاری اعداد وشمار کی دستاویزات میں اس میدان میں ان کی مہمات کا خصوصی اندراج ہے۔ بعد ازاں زندگی میں جب پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے موقع پر انہوں نے ذکر کیا کہ ہندوستان میں دیگر مشاہدات میں انہیں ہمیشہ یاد آتا ہے کہ وہ لاہور میں پولو کھیل سے کس قدر لطف اندوز ہوتے تھے۔

نوجوان ونسٹن چرچل کو تیز گھڑ سواری کی عادت تھی، لیکن جب لاہور چھاؤنی کے مقام میاں میر سے نمائش گاہ تک نئی سڑک بن رہی تھی تو وہ اس کے کنارے کنارے سبک خرامی سے گھڑ سواری کرتے تھے۔ ان کی ابتدائی ڈائریوں میں ان مشاہدات کا خاص طور پر ذکر ہے۔ ''ٹھنڈی سڑک'' نے یقیناً دنیا کے ایک عظیم ترین اور منجھے ہوئے سیاسی مدبّر کی صورت گری میں ایک تشکیلی کردار ادا کیا تھا۔

●○●○●○●

لاہور کی عکس بندی

جب لاہور کی فوٹو گرافی کے بارے میں سوچا جائے تو ''چاچا'' ایف۔ای چودھری کا نام ذہن میں اُبھر آتا ہے۔ جب پاکستان معرضِ وجود میں آ رہا تھا تو اس وقت ان کی عمر چالیس سال کے قریب تھی اور وہ بہترین فوٹو گرافر تسلیم کیے جاتے تھے۔

جب میں ایک بچہ تھا تو مجھے یاد ہے کہ میں اور میرا بڑا بھائی ''چوری'' کرتے تھے جسے ہم ادھار کہتے تھے۔ جب بھی وہ ہمارے گھر آتے تو ہم اُن کی ہلکی موپڈ کوئیکلی موٹر سائیکل اُڑا لیتے۔ چنانچہ ہم نے موٹر سائیکل چلانا ان کے خرچ پر سیکھا۔ جب میرے والد کو دل کا شدید دورہ پڑا تو دو دن بعد ہی انہیں سول اینڈ ملٹری گزٹ کی ایڈیٹری سے برطرف کر دیا گیا تو وہ (چاچا) والد صاحب کے تکیے کے نیچے ایک اچھی خاصی بڑی رقم رکھ گئے اور اس کے بعد اخبار کے مالک کے خلاف اس کی بے حسی پر، ایک بہت بڑی احتجاجی مہم چلائی جس میں وہ خود پیش پیش تھے۔ لیکن مالک تو کاروباری شخص ٹھہرا، ایک بیمار ایڈیٹر اس کے کس کام کا۔ اُن دنوں دل کے دورے کا مطلب جاری پیشے کا خاتمہ سمجھا جاتا تھا چنانچہ میرے والد کو کام پر واپس آنے میں دو برس کا عرصہ لگ گیا۔

لیکن ایف ای چودھری کے فوٹو گرافی کے پیشے کی کہانی اور ہے۔ وہ یقیناً پاکستانی فوٹو صحافت کے پہل کاروں میں سے تھے۔ وہ اپنے فن میں اس قدر ماہر تھے کہ سرکاری تقریبات میں وہ بیٹھے رہتے اور صرف ایک بار اٹھ کر تصویر بناتے صرف ایک تصویر سے ان کا کام ختم ہو جاتا تھا۔ دوسرے فوٹو گرافر پوری پوری ریل کھینچتے تا کہ ان میں سے بہترین فوٹو کا انتخاب کر سکیں، لیکن ایف ای چودھری کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ صرف ایک تصویر کافی ہوتی۔ انہوں نے یہ فن ''استادوں'' سے سیکھا تھا کیونکہ ان سے پہلے نمایاں فوٹو گرافروں کی ایک لمبی قطار تھی جو آئے اور چلے گئے تھے۔ لاہور میں فوٹو گرافی کا آغاز 1840ء میں ہوا۔ اس دور کا کوئی ریکارڈ آج دستیاب نہیں ہے، لیکن چند ایک ماہرِ تعمیرات تھے اور پنجاب کی سرزمین کے افقی نقشے تیار کرنے والے لوگ تھے۔ فیلیس بیٹو ایک اطالوی نژاد فوٹو گرافر، جس نے 1857ء سے 1888ء کے دوران ہندوستان بھر میں طویل سفر کیے، نے

سکھوں کی حکومت کے خاتمے پر گولڈن ٹمپل اور لاہور کی بہت خوبصورت اور تفصیلی تصویریں کھینچیں۔ یہ لاہور کی اوّلیں تصاویر تھیں جواب بھی موجود ہیں۔

چند برس بعد 1864ء میں سموئیل بُورن نے، جو اس وقت ہندوستان میں بہت معروف کاروباری فوٹوگرافر تھا، بھی امرتسر اور لاہور کی تصویریں کھینچیں جن میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ''مڑھی''، اس کی سنگِ مرمر کی تفریحی خیمہ نما عمارت اور شاہی قلعہ لاہور کی تصاویر شامل ہیں۔ سرینگر میں اس نے کرنل ایگزینڈر گارڈنر کی، جو 1831ء میں رنجیت سنگھ کے دربار میں ہوا کرتا تھا۔ اونی چارخانہ کی پوشاک اور اس سے ہم آہنگ پگڑی کے ساتھ، ایک نہایت مسحور کن تصویر کھینچی۔ پنجاب کے عوام، جن میں سکھ فوجی، مہاراجے اور اکالی شامل تھے، نے بھی کثرت سے تصویریں کھنچوائیں۔ بُورن کا کام اس کی خوبصورتی اور توازن کی وجہ سے مشہور ہے کیونکہ سیاہ وسفید فوٹوگرافی کا اپنا فنکارانہ معیار ہوتا ہے۔

لیکن لاہور میں سب سے اوّلیں کاروبار قائم کرنے والا فوٹوگرافر ولیئم بارتھولومیوٗ تھا، جو دواساز تھا۔ اس نے 1849ء میں اپنا کاروبار قلعہ لاہور کے اندر قائم کیا۔ بعدازاں وہ اس جگہ منتقل ہوگیا جسے اب لوئر مال کہتے ہیں۔ ولیئم بارتھولومیوٗ کی وفات کے بعد اس کا نائب جیمز کریڈوک لاہور کا سب سے بڑا فوٹوگرافر بن گیا۔ اس نے مال روڈ پر سب سے پہلی فوٹوگرافی کی دکان قائم کی۔ وہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے سرکاری فوٹوگرافر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ بعدازاں یہی حیثیت برطانوی حکومت کے دور میں بھی قائم رہی۔

لیکن پھر آئرلینڈ کا مشہور فوٹوگرافر ولیئم ہنری برک آ گیا۔ 1861ء میں پشاور میں پیدا ہونے والا اپنے فوٹوگرافر باپ کے نمایاں شاگرد کی حیثیت سے جوان ہوا۔ ولیئم نے 1887ء میں شادی کر لی اور جلد ہی لاہور میں جیمز کریڈوک فوٹوگرافر کا برانچ مینجر تعینات ہوگیا۔ ولیئم برک نے اپنا کاروبار 1911ء میں پہاڑی مقام اُوٹی اور اس کے بعد مدراس میں قائم کیا۔ انڈیا آفس کے ذخیرے میں اس کی کھینچی ہوئی تصویریں 1910ء سے 1935ء کے درمیانی عرصے سے متعلق ہیں۔

ایک زیادہ اہمیت کی حامل سرکاری تقریب جس میں برک نے تصویر کشی کی وہ مارچ 1885ء میں راولپنڈی دربار کی تھی، جس میں افغانستان کے فرمان روا امیر عبدالرحمان کی ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ڈفرین کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی۔ اس تقریب کے دوران اس کی نوجوان صحافی کپلنگ سے ملاقات ہوئی تھی جو ان دنوں لاہور کے روزنامہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' میں کام کرتا تھا۔ کپلنگ، برک کی تصویر کشی سے خاصا متاثر ہوا۔ وہی اس کو لاہور میں آ کر آباد ہونے پر آمادہ کرنے کا ذمہ دار تھا۔ کپلنگ چھ ماہ کے لیے کام کرنے کے لیے شملہ چلا گیا جہاں اس کی مزید ملاقاتیں برک سے ہوئی ہوں گی۔ اُس وقت تک وائسرائے نے موسمِ گرما کے عرصے کے لیے مری کے بجائے فیشن زدہ پہاڑی مقام شملہ کو حکومت کا عارضی صدر دفتر قرار دے دیا تھا۔ اس

تبدیلیٔ مقام کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان دنوں مری میں ہیضے کی وبا، اکثر پھیل جایا کرتی تھی۔

جولائی 1885ء میں برک نے لاہور میں سٹوڈیو برانچ کھول دی اور پھر یہ بتدریج اس کے کاروبار کا مرکز بنتی چلی گئی۔ وہ لاہور میں آباد ہوگیا تا کہ بچوں کی پرورش کر سکے۔ اگرچہ اس نے راولپنڈی اور مری میں اپنے سٹوڈیو بھی قائم رکھے، اس کے علاوہ وہ سرحدی علاقوں میں بھی فوٹوگرافی کی مہمات پر جاتا رہا اور مردان میں قائم ملکہ کے ذاتی گائیڈوں کی کور کی پنجاب فرنٹیئر فورس کی تصویر کشی کرتا رہا۔ 1879ء میں جنگ افغان دوم کے دوران کیپلنگ اور برک دونوں نے جنگی محاذ پر خبر رسانی کا کام کیا اور وہاں کے براہِ راست واقعات و حالات برطانوی اور ہندوستانی قارئین کو پڑھنے کو ملے۔ برک 1899ء میں لاہور میں انتقال کر گیا۔

پھر لاہور میں غیر معمولی ذہین فوٹوگرافروں کی ایک کھیپ آ گئی۔ ڈبلیو بیکر، اے ساچے، فریڈ بریمنز اور جیمز ریکلٹن کے نام محققین کو اچھی طرح معلوم ہیں۔ ان کے بعد ہندوستانی فوٹوگرافروں کی بھی ایک لمبی قطار نظر آتی ہے۔ بیسویں صدی کی آمد کے ساتھ ہی لاہور میں فوٹوگرافی کی بہت سی دکانیں کھل گئیں۔ ان سب کے زیر استعمال گلاس پلیٹ کیمرے تھے جو آج کل بھی ہسپتال روڈ پر میو ہسپتال چوک میں کام کرتے نظر آ جاتے ہیں۔ تیز تر تکنیکی تبدیلیوں کے ساتھ فوٹو صحافت در آئی اور دنیا بھر میں افراد کی ایک نئی قسم معرضِ وجود میں آ گئی ہے جو سلولائیڈ پر ایسے لمحات مقید کر لینے میں منہمک ہیں جن سے بعد میں بھی لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔

اسی نئی اور نایاب افرادی نسل میں ایف ای چودھری پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز لاہور کے سن ٹنتھنی ہائی سکول میں ایک سکول ٹیچر کے طور پر کیا، لیکن جلد ہی ''پاکستان ٹائمز'' لاہور کے چیف فوٹوگرافر بن گئے۔ پاکستانی فوٹو صحافت کے پیش رَو کی حیثیت سے آنے والے چودھری اس وقت ریٹائر ہوئے جب اخبار ہی 1980ء میں بند ہوگیا۔ وہ 15/مارچ 2013ء کو انتقال کر گئے۔ ان کی عمر اس وقت ٹھیک 104 برس تھی اور ان کے ساتھ ہی اس عہد کا بھی خاتمہ ہوگیا جس میں افراد دنیا کی سیاہ و سفید فوٹوگرافی کرنے میں مگن تھے۔ اطالوی فوٹوگرافر فیلیس بیٹو سے لے کر پاکستانی ایف ای چودھری تک ایک خاصا طویل سفر ہے۔ ہوسکتا ہے کسی روز ان کی ساری دنیا اکٹھے ہو کر لاہور کی وہ کاشی کاری دکھا سکیں جس سے لاہور آج بھی تعبیر ہے۔

●○●○●○●

ایڈولف ہٹلر کا تحفہ

پہلی بار میں نے ''خاکساروں'' کے متعلق اپنے ہمسائے حاجی عبدالرحمان سے سنا جو اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی مثال آپ تھی۔ نوعمری میں بادشاہی مسجد لاہور میں عید کی نماز کے بعد پہلی بار میں نے انہیں دیکھا تھا۔ میرے والد نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''یہ ہٹلر کے دوست تھے۔'' مجھ پر مشرقی کا رعب چھا گیا تھا۔

پچھلے ہفتے میرے دوست سیّد سکندر شاہ نے اس حقیقت پر افسوس کرتے ہوئے کہ پاکستان غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جہاں اپنے ہیرو کو بھلا دیا جاتا ہے، مشرقی کا ذکر کیا اور اچھرہ کے سچے رہائشی ہونے کے ناطے اس نے نہایت عیاری سے یہ بیان دیا کہ مشرقی کے پاس ایک خوبصورت کار تھی جو اسے ایڈولف ہٹلر نے تحفے میں دی تھی۔ یہ بات میری ترغیب کے لیے کافی تھی کہ میں ایڈولف ہٹلر کے تحفے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوں۔ ایک جمعرات کی شام میں تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا ذیلدار روڈ کی جانب روانہ ہو گیا۔

بڑے چوک سے ذرا پہلے بہت سے خوانچہ فروشوں کے درمیان ایک سیمنٹ کا بنا ہوا مکان ہے جہاں سرخ رنگ کا جھنڈا نصب ہے۔ ایک لوہے کا بدوضع دروازہ آپ کا منتظر ہے۔ میں نے چھوٹے دروازے کو دھکا دے کر کھولا تو مرے سامنے، جیسا کہ شوکیس میں ہوتا ہے، ایک زنگ آلود کار کھڑی تھی۔ اس تاریخی کار کے بارے میں کسی قسم کے شک کی گنجائش ہی نہیں کیونکہ یہ نہایت اعلیٰ ترین معیار کی ہے۔ میں اس کار تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا جسے فیوہر (ہٹلر کا خطاب) نے پیش کیا تھا۔ ''یہ ایک ایسے دماغ کے لیے جو نہایت اعلیٰ پائے کا ہے۔ ایک ایسے شخص کو جس کی سالمیت ہندوستان کو ایک عظیم افتخار تک پہنچا دے گی۔''

اس قدیم انحطاط پذیر شہکار کے قریب ہی علامہ عنایت اللہ خان مشرقی اور ان کی اہلیہ کی قبریں ہیں جو سادگی کا نمونہ ہیں۔ ان کا پوتا اس قبر پر ایک تحقیقی لائبریری تعمیر کر رہا ہے۔ یہ کام کافی عرصے سے رکا ہوا ہے کیونکہ عظیم علامہ کے ان غیر معمولی دیانت دار پیروکاروں کے ہاں پیسے کی کمی ہے اور انہیں چندہ مانگنے کی عادت نہیں

ہے، جسے وہ بھیک مانگنا کہتے ہیں۔ یہ ایک ویران جگہ ہے جو ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ ہم اپنے عظیم ترین دماغوں کی کس قدر عزت کرتے ہیں۔

کار 1942ء ماڈل کی رینالٹ بینز ہے۔ جن لوگوں کو تاریخی کاروں میں دلچسپی نہیں ہے ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جب نازی افواج نے فرانس پر قبضہ کیا تو اس وقت وہ ''پل مین'' کی طرز کی اعلیٰ معیار کی مرسڈیز کاریں محدود تعداد میں بناتے تھے۔ چونکہ یہ رینالڈ فیکٹری میں بنی تھی اس لیے کار کا نام ''رینالڈ بینز'' تھا۔ کار کے بوسیدہ اگلے حصے پر نام رینالڈ بنیز جلی حروف میں لکھا ہے۔ ٹائر جو اَب گل چکے ہیں، پرانے ارّے کے سلاخوں والے پہیوں پر چڑھے ہیں۔ فرنٹ گرِل کے عین نیچے کار اسٹارٹ کرنے والا ہینڈل بھی اپنی جگہ موجود ہے۔

میں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا تو چمڑے کی خوبصورت سیٹیں گل چکی تھیں۔ سیٹ کے نیچے چیسز بالکل محفوظ ہے۔ چیسز کا نمبر 3811967 ہے۔ میں نے جب یہ نمبر رینالٹ کمپنی کو ای میل کیا تو فوری جواب آیا کہ ان کے محافظ خانہ ریکارڈ کے مطابق یہ کار ایڈولف ہٹلر نے لاہور، انڈیا کے مسٹر عنایت اللہ خان مشرقی کو بطور تحفہ دی تھی۔ یہ دنیا بھر میں صرف ایک ہزار کی تعداد میں بنی تھیں۔ یہ پُل مین طرز کی چھ نشستوں والی رینالٹ نرو اسپورٹ کار تھی۔ یہ 4278 سی سی پاور سُپر لگژری کار تھی۔

اس کار کا اصل رنگ کریم تھا جو کار کے انجن اور اطراف کا تھا۔ جبکہ پچھلی جانب پہیوں کے مڈگارڈوں، فرنٹ اور پچھلی بتیوں کا رنگ سیاہ تھا۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ زنگ سارے پینٹ کو کھا چکا ہے۔ ایڈولف ہٹلر کے ذاتی استعمال میں ایسی چھ گاڑیاں تھیں۔ اس نے پچاس سے زائد گاڑیاں دنیا بھر میں معزز مہمانوں کو تحفتہً پیش کی تھیں۔ اس نے ایک کار فیلڈ مارشل رومیل کو بھی جنگِ عظیم دوم میں افریقی مہم سے بطور فاتح واپسی پر تحفتہً پیش کی تھی۔

کمپنی نے مشرقی خاندان کو کار کے عوض ایک لاکھ ڈالر کی پیشکش کی تھی لیکن انہوں نے ملکیت میں جھگڑے کی بِنا پر انکار کر دیا تھا۔ یہ 1970ء کی بات ہے۔ تب سے ایک اور نسل پروان چڑھ چکی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ انہیں لاکھوں ڈالر کی اس تاریخی کار میں رتی برابر دلچسپی نہیں ہے۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ تھوڑا عرصہ پہلے تک یہ ایک گیراج میں کھڑی تھی جہاں اس میں کبوتروں کا بسیرا تھا۔ یہ ہمارے موجودہ دور کا پرتو بن چکی تھی۔

علامہ مشرقی کون تھا؟ میں نے پانچ مختلف ادھیڑ عمر کے تعلیم یافتہ اشخاص کو فون پر پوچھا۔ ان میں سے صرف ایک اس عظیم شخصیت کے بارے میں مبہم سا سراغ دے سکا، جس شخص کو ''برطانوی ہند کا عظیم مجرب دماغ'' ٹھہرایا گیا۔ اس کا تعلق لاہور سے تھا۔ اس کے باوجود لاہور نہ تو اس کے متعلق جانتا ہے اور نہ ہی اس کو اپناتا ہے۔ اگر آپ اسے ہٹلر کے ساتھ نتھی کرتے ہیں تو آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ 1930ء میں

کیمبرج یونیورسٹی اور برطانوی اخبارات اُسے ''ناقابلِ بیان امکانات والا نابغہ روزگار'' کہتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک آزاد خیال سائنسدان تھا، جس نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ ہندوستان کی تاریخ اور ثقافتی طرزِ عمل ایسا ہے کہ عوام اپنے قائدین کے سلوک پر بلاواسطہ متناسب ردِعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ تصوّر کرنا کہ عوام کو تو اپنے قارئین کے عزائم کا علم ہی نہیں، سراسر خام خیالی ہے۔ انہیں ہر تفصیل کا علم ہوتا ہے۔

علامہ مشرقی امرتسر میں 25/اگست 1888ء کو سناروں کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے اور 27/اگست 1963ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ وہ نہایت ذہین طالب علم تھے۔ انہوں نے نت نئے تعلیمی ریکارڈ قائم کیے جس نے برطانیہ اور برصغیر کے ہر شخص کو حیران کر دیا۔ انہوں نے 19 سال کی عمر میں ایک سال میں علمِ ریاضی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور چار برس سے بھی کم عرصے میں ٹرائی پوس (بی اے آنرز کی ڈگری) مکمل کر لی۔

اگرچہ انہوں نے تمام مضامین میں نمایاں کامیابی حاصل کی، لیکن ان کی اصل شہرت علم ریاضی میں غیر معمولی قابلیت تھی۔ اپنے تعلیمی کارناموں پر انہیں ''فاؤنڈیشن سکالر'' اور کیمبرج یونیورسٹی سے ''اینکلر'' (ریاضی کے ٹرائی پوس میں درجہ اوّل حاصل کرنے والا) کا اعزاز حاصل ہوا۔ روزنامہ ''ٹائمز آف لندن'' اور ''ڈیلی ٹیلیگراف'' نے لاہور کے اس ذہین ماہرِ ریاضی علوم پر اداریے تحریر کیے۔

24 برس کی عمر میں وہ فارغ التحصیل ہو کر ہندوستان لوٹ آئے اور برطانوی حکومت میں مختلف حیثیتوں سے کام کیا۔ ان کی شخصیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے برطانوی حکام کو ذرّہ برابر حیرت نہ ہوئی، جب انہوں نے پشاور کے ڈپٹی کمشنر کو ہتکِ عزت اور غلیظ زبان استعمال کرنے پر تھپڑ مار دیا تھا۔ وہ 23/اپریل 1930ء کو پشاور کے قصہ خوانی بازار میں پٹھانوں کے قتلِ عام پر سرکاری اہلکار ہوتے ہوئے بھی اپنا منہ بند نہ رکھ سکے تھے۔ انہوں نے صورتِ حال کی بدنظمی کے بارے میں برطانوی اخباروں میں اصل واقعات لکھ بھیجے۔ ان کے کالم پڑھ کر برطانوی عوام ششدر رہ گئے۔ جب پنجابی قائدین نے ان کے نقطۂ نظر پر تنقید کی تو انہوں نے کہا۔ ''برطانوی حکومت مجھے میرے علم کی تنخواہ دیتی ہے نہ کہ میرے دل اور ضمیر کی۔'' اسی سیاق میں انہوں نے سر کا خطاب لینے سے انکار کر دیا تھا۔

1931ء میں علامہ مشرقی نے خاکسار تحریک (عاجزوں کی تحریک) کی بنیاد رکھی اور آسائش کی زندگی تیاگ دی، جس کے وہ عادی تھے۔ ان کی پارٹی کا بنیادی تصور یکساں مساوات کے اصول پر مبنی تھا جو نہ تو علی الحال تھا اور نہ ہی مراعات یافتہ اور غیر مراعات یافتہ طبقات کے مابین کوئی دیوار حائل تھی۔ علامہ مشرقی ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اس مسلمہ حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ جاگیرداری نظام کی بالادستی اور درجہ بندی پر مبنی افسر شاہی کی وجہ سے پاکستان کو ازحد نسلی اور صوبائی تعصّبات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس مساوات جبریہ کا حتمی نتیجہ مکمل

اور کُلی انتشار ہوگا۔ اگر ان خرابیوں کو دور کر دیا جائے تو حتمی نتیجہ اَن گنت خوشحالی کے امکانات کی صورت میں نکلے گا۔

چناؤ سے مفر نہیں۔ ماہرِ علم ریاضی نے 1953ء میں لکھا۔ ''میرے حساب کتاب سے مشرقی پاکستان 1970ء میں اپنی آزادی کا اعلان کر دے گا۔'' یہ دن دیکھنے کے لیے وہ زندہ نہیں رہے۔ انہوں نے مسئلہ کشمیر کو اقوامِ متحدہ میں لے جانے پر انتباہ کیا۔ ''کیونکہ ہم اسے ہندوستان سے کبھی آزاد نہیں کرا پائیں گے۔ اس حقیقت کو آج تسلیم کر لیں تو اچھے رہیں گے۔ اسے لازمی پاکستان کے صوبے کی حیثیت سے رہنا چاہیے اور ہمیں صوبے کے گمشدہ حصوں کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے ورنہ ایک روز ہم کشمیر کی تقسیم اسی طرح قبول کر لیں گے، جس طرح ہم نے پنجاب کی تقسیم قبول کر لی تھی۔''

کیا اس غیر معمولی لاہوری کے بارے میں کچھ مزید کہنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ جس نے اچھرے کی ایک غیر معمولی گلی میں زندگی گزار دی۔ کئی برس بعد اس کے بھانجے عظیم اختر حمید خاں نے اورنگی پراجیکٹ قائم کیا تو گویا اس عظیم شخصیت کے خیالات کو عملی جامہ پہنایا جا رہا تھا۔ نتائج حیران کن تھے۔ یہ حقیقت کہ ایڈولف ہٹلر نے انہیں بہترین کار بطور تحفہ پیش کی تھی، اہلِ برطانیہ کے لیے حیرت کا باعث نہیں تھی۔ اس نایاب کار کی آج حالت کیا ہے، سب دیکھ سکتے ہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ ریاست اسے اپنی تحویل میں لے کر، اسے اصلی حالت میں واپس لا کر، کسی سائنسی عجائب گھر میں رکھے اور اس کی نمائش کرے۔ مجھے ابھی سے بلند خاموشی سنائی دے رہی ہے۔

●○●○●○●

سام براؤن بیلٹ کی اصلیت

ایک زمانے میں سام براؤن کا نام لاہور میں عام رمزیہ لفظ تھا۔ ہر ایک اسے جانتا یا اس کے بارے میں واقف تھا۔ 1849ء میں اہلِ برطانیہ نے گجرات میں چیلیانوالہ کے مقام پر سکھوں کی سلطنت کو بہت بُری طرح تاخت وتاراج کر دیا تھا۔ یہ ایک گھمسان کی جنگ تھی، جس میں تقریباً پوری سلطنت کا ہی خاتمہ ہو گیا تھا۔ پہلی فوجی چھاؤنی قلعہ لاہور کے اندر قائم کی گئی تھی۔ لاہور آخری شہر تھا جس کی شکست کے بعد اہلِ برطانیہ نے اپنے قبضے کو مستحکم کر لیا تھا۔

بُری طرح ٹھکائی کے بعد برطانوی فوج کو پرانی انارکلی کی چھاؤنی میں رہائش کی تلاش میں مشکل پیش آ رہی تھی، جب لیفٹیننٹ سام براؤن اپنے سواروں کے ساتھ لاہور میں داخل ہوا۔ جب وہ ریٹائر ہوا تو اسے جنرل سر سیموئیل سام براؤن وی سی، جی سی بی، کے سی ایس آئی کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ اس کی یاد میں تین کتبے آج بھی موجود ہیں۔ ایک تو جزیرہ وائیٹ پر رائی قبرستان میں اس کی لاش کی کریا کرم والی راکھ کی قبر کے سرہانے لگا پتھر ہے۔ دوسرا پتھر اس کے اعزاز میں لندن میں سینٹ پال کیتھڈرل میں اور تیسرا مال روڈ لاہور کے کیتھڈرل میں نصب ہے۔ اہلِ برطانیہ کے نزدیک اس نے ''نڈر گھڑ سواروں کے ایک لیڈر'' کی حیثیت سے تاریخ میں اپنا نام مقام پیدا کیا تھا۔ لاہور کے لیے وہ ایک نڈر شخص تھا جس نے مقامی علم اور مہارت کو استعمال کر کے دنیا کو مشہور سام براؤن بیلٹ عطا کی تھی۔

سام براؤن ہندوستان میں بارک پُور کے مقام پر 3/اکتوبر 1824ء کو پیدا ہوا۔ اس کا والد ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنگال میڈیکل سروس میں سرجن تھا۔ اس نے چھیالیسویں بنگال مقامی انفنٹری فوج میں بطور سیکنڈ لیفٹیننٹ شمولیت اختیار کی اور رام نگر اور سعد پور کے مقامات پر حملوں میں حصہ لیا۔ یہ تو جب اُسے چیلیانوالہ کے میدانِ جنگ میں دھکیلا گیا اور چند ماہ بعد نزدیک ہی واقع گجرات میں، تو اسے پنجابی سپاہی کی قوت کا اندازہ ہوا۔ باقی ماندہ زندگی کے دوران وہ ان کے رعب تلے ہی رہا۔ اسے لاہور بھیجا گیا تاکہ وہ یہاں سے ''نہایت اعلیٰ

درجے کے گھڑ سوار'' بھرتی کر سکے۔

یہ سام براؤن کی رائے تھی کہ اسے چیلیانوالہ کے مقام پر ''فوجِ خاص'' کے مقابل جو تجربہ حاصل ہوا اس جیسی بہادری اس نے نہ کبھی پہلے دیکھی نہ سنی تھی اور یہ بھی اس کی رائے تھی کہ ان جیسے افراد کو اپنی صف میں شامل کرنا چاہیے۔اس کی اس جانچ سے اہلِ برطانیہ آئندہ سو برس تک بھرپور فائدہ اٹھاتے رہے۔

1849ء میں اسے لیفٹیننٹ بنا دیا گیا اور اسے ایک گھڑ سوار دستہ بھرتی کرنے کا کہا گیا جسے باقاعدہ گھڑ سوار دستہ پنجاب دوم کا نام دیا گیا، جو بعدازاں باقاعدہ فوج میں شامل ہو گیا۔اس کام کے لیے وہ لاہور آیا اور انارکلی کے علاقے میں رہنے لگا۔اس نے اندرون شہر میں ''فوجِ خاص'' کے سابق گھڑ سواروں کی تلاش شروع کر دی۔اگلے پانچ برس تک اسے اپنے اس دستے کی کمانڈ کرنا تھی۔نصف صدی کے بعد اس کے اعزاز میں 1904ء میں اسی دستے کا نیا نام ''بائیسویں سام براؤن کیولری'' رکھ دیا گیا۔

براؤن نے پنجاب دوم کی بے شمار جنگی معرکوں میں قیادت کی اور 1857ء میں بزدر مہم میں بہادری دکھانے پر اسے اعزاز سے نوازا گیا اور ترقی دے کر کیپٹن بنا دیا گیا۔ براؤن کو جنگِ آزادی، جسے بغاوتِ ہند بھی کہتے ہیں، کے دوران سیر پورہ کے نزدیک کارروائی پر وکٹوریہ کراس سے نوازا گیا۔ جب براؤن نے، جو اَب میجر بن چکا تھا، صرف ایک سوار کے ہمراہ حملے میں باغیوں کی ایک توپ پر قبضہ کر لیا تو اس کا بایاں بازو کٹ گیا لیکن اس نے وکٹوریہ کراس حاصل کر لیا۔اس کے مدِ مقابل نے تلوار سے اس کا بایاں بازو بدن سے جدا کر دیا تھا۔

اس واقعہ کے کچھ عرصے بعد اس نے وردی پہننا شروع کر دی جس پر اس کا نام لکھا ہوتا تھا۔ یہ سہولت اس لیے تھی کہ اس کو افسرانہ تلوار پہننے میں دشواری پیش آ رہی تھی، اس کا ازالہ ہو سکے۔ایک بیان کے مطابق اس کے سکھ اردلی نے اسے ایک بیلٹ پیش کی جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ''فوجِ خاص'' کے سپاہی پہنا کرتے تھے کیونکہ اس منتخب فوج، جس کا سپہ سالار نپولین کی شکست خوردہ فوج کا ایک فرانسیسی جرنیل تھا، کی وردی میں عام بیلٹ کے علاوہ ایک بوجھ سہارنے والی اضافی بیلٹ بھی شامل تھی۔ جس میں ایک تلوار، ایک خنجر، کرپان جو ہر سکھ مذہباً پہنتا تھا، ایک پستول اور دو چمڑے کے خول جس میں گولیاں رکھی جاتی تھیں، اٹھائے گرفت میں رکھتی تھی۔ یہ اچھا خاصا بوجھ بن جاتا تھا جو صرف ایک بیلٹ نہیں اٹھا سکتی تھی۔

''فوجِ خاص'' کے ڈیزائن میں تلوار کی بیلٹ شامل کی گئی تھی جو کندھے سے لٹکائی جاتی تھی۔اسی طور اسے نپولین کی فرانسیسی افواج پہنا کرتی تھیں جبکہ ہندوستان میں پہنے جانے والے روایتی ''کمر بند'' میں صرف ایک خنجر اور پستول تھامے رکھنے کا بندوبست تھا۔ کمر بند اور اس کے طریقِ کار کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ مغل افواج اور سکھ فوجی مثل، جو اس کا استعمال کرتے تھے، کی تصویریں ہیں جنہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ براؤن نے اپنی غیر معمولی ذہانت سے کام لے کر دونوں بیلٹوں کو ملا کر ایک چوڑی بیلٹ بنائی جو کمر کے گرد باندھی جاتی تھی، جسے ایک

چمڑے کی پتلی بیلٹ کندھے کے اوپر سے سہارا دیتی تھی۔

اس ایجاد کی وجوہات کے بارے میں چند ایک اختلافات ہیں۔ ایک نقطۂ نظر والے اسے براؤن کی معذوری سے تعبیر کرتے ہیں جبکہ دیگر حضرات اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ ایک گھڑ سوار کو حقیقی اسلحہ اٹھائے پھرنے کے لیے ایسی بیلٹ نہایت ضروری تھی۔ تلوار کے ساتھ ساتھ پستول اور اس کی گولیوں کے اضافی اسلحہ نے اس ایجاد کو ناگزیر بنا دیا تھا۔ سام براؤن کو اپنے بائیں بازو کی محرومی کے بعد اپنی تلوار کو بآسانی اٹھانے میں مشکل درپیش تھی خواہ وہ گھوڑے پر سوار ہو یا پیدل ہو، اس کا ایک ہاتھ کام کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اس بیلٹ کے ڈیزائن میں چمڑے کا ایک پستول گر بھی شامل تھا، جس میں ہتھیار خود بخود چل جانے کے خطرے کے بغیر، بحفاظت لٹکایا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس زمانے کے پستولوں میں یہ علت موجود تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں وجوہات نے ہی اس سادہ ایجاد میں اہم کردار ادا کیا۔ بعد میں سام براؤن بیلٹ، دوسرے افسروں نے بھی پہننا شروع کر دی جو براؤن کو ہندوستان سے جانتے تھے، لیکن برطانوی فوج میں بیلٹ کا عام استعمال براؤن کے ریٹائر ہونے کے بعد ہوا۔ براؤن کی اصل بیلٹ برطانیہ کی رائل ملٹری اکیڈیمی، سینڈھرسٹ کے ''انڈیا روم'' میں عوامی نمائش کے لیے رکھی ہوئی ہے۔

اُن دنوں لاہور اپنے اعلیٰ ترین معیار کے چمڑے کی مصنوعات کی وجہ سے مشہور تھا۔ اندرون شہر موچی دروازے کے اندر کوچہ چابک سواراں سے ذرا آگے ایک بازار ہے جہاں گھوڑوں کے کمر بند اور متعلقہ دیگر ساز و سامان کی فروخت ہوتی ہے۔ ایک مخصوص چمک، صیقل کی ہوئی، سرخی مائل بادامی رنگت کی آب و تاب جو صرف لاہور سے مختص ہے، والا چمڑا یقیناً بھینس کا ہوتا ہے جو دنیا کے دیگر ممالک میں دستیاب نہیں ہے۔ یہ بات سمجھ آتی ہے کہ سام براؤن بیلٹ نے، جو آج کل پوری دنیا کے تمام افسروں کے لیے معیاری ساز ہے، لاہور جیسے شہر میں جنم لیا تھا جو اَب خود شدید فوجی شہر بن چکا ہے۔ آج کل مغرب میں کئی کارخانے سام براؤن بیلٹیں بنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ جہاں زیادہ تر گائے کا چمڑا استعمال ہوتا ہے۔ اصل نمونہ جو رائل ملٹری اکیڈیمی، سینڈھرسٹ میں ہے وہ بھینس کے چمڑے کا بنا ہوا ہے۔

●○●○●○●

اطالوی نژاد لاہوری جنونی

جب لاہور کسی شخص کو اپنا لیتا ہے تو یہ رشتہ عجیب ہو جاتا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ وابستگی مقناطیسی ہوتی ہے یا نہیں، لیکن یہ یقیناً دلیلی تشریح کو رَد کرتی ہے۔ اسی طرح اٹلی کا رہنے والا ایک شخص تھا جو لاہور کا گورنر تعینات رہا۔ پہلے اسے شہر کا قاضی بنایا گیا اور پھر گورنر۔ وہ معدودے چند اشخاص کی طرح نہایت طاقتور تھا اور لوگ بھی اس سے خائف رہتے تھے۔

ژاں بپٹسٹ وینچورہ سترھویں صدی کے آخر میں اٹلی میں پیدا ہوا۔ نوجوانی ہی میں وہ اطالوی فوج میں بھرتی ہو گیا، جسے 1812ء میں روس میں نپولین کی فوج کے ہمراہ لڑنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ فرانسیسی فوج میں ایک ممتاز افسر تھا۔ اس کی آخری یورپی جنگ واٹرلو کے مقام پر ہوئی جس کے بعد وہ اس افراتفری میں سے صاف بچ نکلا۔ وہ ابھی جوان تھا اور تباہ و برباد ہو چکا تھا اور جیسا کہ بعد ازاں اس نے دستاویز میں لکھا کہ اسے افسوس تھا کہ ہر شخص موت آنے تک لڑتا نہیں رہتا تھا۔ خبطی وہ واحد لفظ ہے جو کوئی بھی سمجھدار فوجی تجزیہ نگار ایسے شخص کے لیے استعمال کرتا۔

لیکن وینچورہ کے پاس بہت سے متفرق خیالات تھے اور جب وہ چل پڑا تو پھر چل پڑا۔ مؤرخ ہمیں بتاتے ہیں کہ پہلی نظر میں ہی وہ ایک نہایت پُرجوش، آزاد طبع والا اعلیٰ افسر لگتا تھا۔ ایک ایسا معقول شخص جسے جو کام بھی سونپا جاتا وہ اُسے، مروّجہ طریق کار کی پروا کیے بغیر، پورا کر ڈالتا تھا۔ اس کے باوجود وہ بلاشبہ اپنی ہی نوعیت کا شخص تھا۔ وہ اٹلی واپس پہنچ گیا۔ کچھ عرصہ آرام کیا اور پھر اپنے خاندان کو الوداع کیا۔ جتنا سونا جمع کر سکتا تھا اس نے کیا اور ''مشرق'' کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کے لمبے سفر کا اختتام لاہور میں ہوا جو اُن دنوں، نپولین کے زوال کے بعد، سامراجی برطانیہ کی مخالفت میں سب سے بڑا قوی مرکز تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ برطانیہ کے خلاف وہیں سے لڑنے کا ارادہ کر بیٹھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی شہرت دور دور تک تھی اور پنجابی مِثل ایشیا کی اعلیٰ ترین فوج تسلیم کی جاتی تھی، کم از کم ہندوستان کے لارڈ رابرٹس کا یہی خیال تھا۔

لاہور میں مہاراجہ نے اُسے تقریباً ایک برس تک انتظار کرایا۔ وہ اس متاثر کُن شخص کا تفصیلی جائزہ لے رہا تھا۔ آخر کار رنجیت سنگھ نے فیصلہ کر لیا اور وینچورہ کو 1822ء میں لاہور دربار کی ملازمت میں لے لیا گیا۔ اسے سکھوں کی پیادہ فوج کے ایک دستے کی قیادت سونپ دی گئی۔ اس پیادہ فوج کے دستے کی اس نے خود تربیت کی اور اس طرح کی جیسی صرف جابر اور مطلق العنان حاکم ہی کر سکتے ہیں۔ بہت جلد یہ دستہ پنجاب فوج کے سب سے نڈر دستے کی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔ سپاہی اس غیر سنجیدہ شخص کی تعریف کرتے نہ تھکتے تھے جوان کے شانہ بہ شانہ اگلے محاذ پر لڑتا تھا۔ وہ اس کے ناقابلِ پیش گوئی طریق کار کی وجہ سے اسے بے حد چاہتے تھے۔ وہ شاذ و نادر ہی خطا کاروں کو سزا دیتا تھا، لیکن جب کبھی وہ کسی مجرم کو سزا دیتا تھا تو وہ غیر معمولی طور پر متشدد ہوتی تھی۔ مہاراجہ، جو آزادی وہ مانگتا اسے دے دیتا تھا، کیونکہ اصل امتحان تو میدانِ جنگ میں ہونا تھا اور امتحان کی گھڑی بھی آن پہنچی تھی جنگِ نوشہرہ کی صورت میں، جو 1823ء میں ہوئی۔ وینچورہ کی رجمنٹ نے نہ صرف پٹھانوں کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا بلکہ اس کی یلغار اس قدر سفاکانہ تھی اور اس کے طریقے اس قدر بے رحم تھے کہ بہت سوں کو یہی محسوس ہوا کہ کابل سے حملہ آور در آئے ہیں۔ کم از کم پٹھانوں کے ذہنوں میں تو یہی تھا۔

اسی وجہ سے مہاراجہ رنجیت سنگھ اسے عزیز رکھتا تھا اور اس کو مؤثر طور پر استعمال کرتا تھا۔ اگرچہ اس کی کارروائیاں اکثر مہاراجہ کو دہلا دیتیں اور خطرے کی گھنٹیاں بجا دیتی تھیں۔ مہاراجہ ہمیشہ اس طرح کے جملوں سے اس کا دفاع کیا کرتا تھا۔ ''گرم خون، دماغ پُٹھا، بندہ مرد ہے۔'' یعنی اس کا خون گرم ہے، دماغ الٹا ہے لیکن ہے وہ اصیل مرد! مہاراجہ رنجیت سنگھ کو یقین ہو گیا کہ یہ اطالوی نژاد، جس میں بظاہر فرانسیسی رکھ رکھاؤ جھلکتا ہے، پیدائشی لیڈر ہے۔

1825ء میں اس کو دو بڑی مہمات کی سرکردگی سونپی گئی تو سکھ سرداروں میں بغاوت پھیل گئی کہ انہیں برسہا برس کی لڑائیوں کے بعد جو مقام ملا تھا، اس پر ایک پردیسی کو فائز کر دیا گیا تھا لیکن رنجیت سنگھ کا اصرار قائم رہا اور اس نے اپنی بات منوا کر چھوڑی۔ یہ بتانا نہایت ضروری ہے کہ جنرل وینچورہ جب تک زندہ رہا، مہاراجہ کا وفادار رہا۔ اس کو ''وفادار'' کا خطاب عطا کیا گیا تھا جس کا وہ بجا طور پر حقدار تھا۔ مہاراجہ نے اسے ایک پنجابی لڑکی سے شادی کرنے کا حکم دیا لیکن وہ صریحاً راضی نہ ہوا اور کہا۔ ''میں آپ کا حکم بجا لاتے ہوئے شادی تو کر لوں گا لیکن اپنی پسند کی لڑکی کے ساتھ، آپ کی چنیدہ لڑکی کے ساتھ نہیں۔'' مہاراجہ کو اس کا جواب پسند آیا۔ ژاں بپٹسٹ وینچورہ نے لدھیانہ کے رہائشی ایک فرانسیسی کی چھوٹی بیٹی سے شادی کر لی اور اس کے ساتھ شہر کے ہنگاموں سے دُور، انارکلی کے مزار سے متصل ایک گھر میں رہائش اختیار کر لی۔ آج کل یہ گھر موجودہ سیکرٹریٹ کی عمارات کا ایک حصہ ہے، جسے فرانسیسی جرنیل نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج کے صدر مقام کی حیثیت سے تعمیر کیا تھا۔

اگرچہ اس کی بیوی بہت خوبصورت تھی، لیکن اس نے کبھی اُس کی پروانہ کی۔ اُس کی بجائے اس نے

چونا منڈی میں ایک بڑی سی حویلی میں اپنی پسند کا حرم قائم کر رکھا تھا۔ ایک بیان کے مطابق اس کے پاس چالیس یا پچاس لونڈیاں تھیں۔ لاہور دربار کو اس کا علم تھا کہ وہ سب اسے چاہتی بھی تھیں اور اس سے ڈرتی بھی تھیں۔ وہ لفظ جنونی کی تعریف پر پورا اترتا تھا۔ جلد ہی اسے لاہور کا قاضی مقرر کر دیا گیا اور چند ماہ کے اندر اندر اندرون شہر لاہور میں جرائم تقریباً صفر ہو کر رہ گئے۔ اس نے چوروں کے لیے ایک عجیب سزا رائج کر دی تھی۔ وہ انہیں دو روز تک ایک ٹانگ سے اُلٹا لٹکا دیتا تھا۔ آپ متفق ہونگے کہ یہ عجیب بات ہے نا! ایک زانی کو اس نے ایک ناقابلِ بیان طریقے سے الٹا ٹانگا کہ وہ مر ہی گیا۔ اس نے اس کی لاش پانچ روز تک اسی طرح لٹکنے دی حتیٰ کہ سڑاند آنے لگی۔ جب گورنر نے مہاراجہ سے احتجاج کیا تو وینچورہ کو اس کی جگہ گورنر لگا دیا گیا۔ لوگوں نے اس فیصلے کو سراہا۔

گورنر کی حیثیت سے اس نے فوری طور پر نکاسی کے نظام کو بہتر بنایا اور اس کے بعد باغوں اور بڑی بڑی خوبصورت عمارات پر خصوصی توجہ دی۔ اس میں سے اطالوی پَن اُبھر رہا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ قدیم حصاری اندرون شہر لاہور کو جس طرح سے ترقی دی گئی اس میں اس کا نمایاں اور مؤثر کردار رہا تھا۔ اس وقت تک مہاراجہ رنجیت سنگھ کے اپنے لوگ اس کی پریشانی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ مہاراجہ کو احساس ہوا کہ وزیر آباد، گوجرانوالہ اور ڈسکہ کے چیمے اور چٹھے سرداروں کے مابین پائی جانے والی بے چینی کو کچلنے کی از حد ضرورت ہے، چنانچہ وینچورہ کو وزیر آباد کا گورنر بنا کر بھیج دیا گیا۔

وینچورہ خاموشی سے وزیر آباد پہنچ گیا۔ مقامی لوگ اس چناؤ پر لاف زن ہوئے کیونکہ اس کی شہرت عملاً شدید بے خوفی، انصاف پسندی اور دیانت داری کی تھی۔ اپنی آمد کے دو ہفتوں بعد اس نے تمام سرکش جاگیرداروں کو شہر کے بڑے چوک میں ایک بڑے اجتماع میں آنے کی دعوت دی اور یکا یک ان کے پروردہ 20 سے زائد نامور ڈاکوؤں کو قید کر لیا۔ سب کی حیرت اور دہشت زدگی کی کیفیت کے دوران اس نے تمام ڈاکوؤں کو فوراً پھانسی پر لٹکا دیا اور پانچ روز تک ان کی لاشیں دھوپ میں لٹکتے رہنے دیں۔

یہ ایک طرح سے دھچکا پہنچانے اور رعب ڈالنے والی حکمت عملی تھی، جس کی وجہ سے جب تک مہاراجہ رنجیت سنگھ برسرِ اقتدار رہا چیمے اور چٹھے اپنے ٹھکانے پر رہے۔ لاہور دربار میں اس واقعہ پر افراتفری مچ گئی اور مہاراجہ خود بھی پریشان ہو گیا۔ اسے کسی کارروائی کی توقع تھی، لیکن ایسی نہیں۔ وینچورہ کو خالصہ سرداروں کے سامنے اس وحشی حرکت کی وضاحت پیش کرنے کے لیے طلب کیا گیا۔

اس نے مہاراجہ سے کہا کہ آپ گوجرانوالہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ صرف طاقت سے ڈرتے ہیں۔ کوئی بھی نرم عمل ان پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ مہاراجہ متفق ہو گیا اور اسے ہاتھ ہلکا رکھنے کا مشورہ دیا۔ وہ مسکرایا، جانے کی اجازت طلب کی اور اسی روز گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوا اور وزیر آباد پہنچ گیا۔

جب مہاراجہ رنجیت سنگھ قریب المرگ تھا تو وہ اس وقت ہری سنگھ کی وفات کے بعد سے پشاور میں

کیا، جہاں آج کل گڑھی شاہو کا علاقہ ہے۔ بڑی گھمسان کی جنگ ہوئی اور سکھا نے بڑی عقلمندی سے بھاری بھرکم روایتی فوج کا سامنا کرنے کے بجائے پسپائی کا فیصلہ کیا۔ اس نے عورتوں اور دولت کے ساتھ فرار کا منصوبہ پہلے ہی سے تیار کر رکھا تھا۔ جونہی رات آئی اس کی فوجوں نے مدِ مقابل فوج کو دھوکا دے کر دریائے راوی کو عبور کیا اور جموں کی پہاڑیوں کی طرف غائب ہو گئیں۔ اس کی تیز رفتاری اور حکمتِ عملی نے اس اَمر کو ممکن بنایا کہ تغلق افواج ان کا پیچھا نہ کر سکیں۔

جموں اور ہزارہ کی پہاڑیوں میں، تب تجربہ کار سکھا گکھڑ نے نئی گروہ بندی اور اپنی فوج میں مقامی علاقوں سے، جو گوجرانوالہ سے ہزارہ اور جموں تک پھیلے ہوئے تھے، بھرتی میں مزید اضافہ کیا۔ لاہور میں مختصر حکمرانی کے دور میں گکھڑ منڈی اناج کی بڑی منڈی بن گئی اور آج تک بنی ہوئی ہے۔ سکھا گکھڑ ہی کی بدولت چند صدیوں بعد گوجرانوالہ سے، سکھا کی رہائش کے نہایت قریب، ایک سکھ لیڈر پیدا ہوا جس نے فوج اکٹھی کر کے نہ صرف لاہور بلکہ پورے پنجاب پر حکومت کی۔ جس نوکر شاہی نے سکھا کی مدد کی تھی انہیں سزائیں دی گئیں، لیکن پھانسیاں نہیں دی گئیں اور وہ شہر میں اپنی دولت اور اثر و رسوخ کے ساتھ رہتے رہے۔ انہوں نے بڑی آسانی سے طرفداری بدل لی تھی۔

ہوا یوں کہ اسی زمانے میں امیر تیمور، شہنشاہ کو للکانے کے لیے شمال سے دہلی کی جانب روانہ ہو چکا تھا اور اس کے بیٹے شہزادہ پیر محمد نے میمنی حملے کے ذریعے ایک زبردست جنگ کے بعد ملتان پر قبضہ کر لیا تھا۔ برصغیر میں ایک عظیم تبدیلی نمودار ہونے کو تھی۔ جب یہ دونوں فوجیں جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھیں، سکھا گکھڑ کو اپنی نوکر شاہی کا اشارہ ملا اور وہ برق رفتاری سے روانہ ہو گیا۔ اس نے فریب سے کام لے کر چند گھنٹوں ہی میں لاہور پر قبضہ کر لیا کہ ہر کس و ناکس ششدر رہ گیا۔ انتقام کے ساتھ جابرانہ حکومت لاہور پر دوبارہ قابض ہو چکی تھی اور ساتھ ہی دہلی پر بھی، کیونکہ وہاں تیمور کی فوجوں نے اپنی مورچہ بندی مستحکم کر لی تھی۔

کشمیر جاتے ہوئے تیمور کی توجہ سکھا گکھڑ کے طور طریقوں کی جانب دلائی گئی۔ تو اس نے پورا دن دھیان نہ دیا۔ طاقتور تیمور، جو خود چنگیز خان کا وارث ہونے کی بناء پر بے رحم جنگجو مشہور تھا، اس شخص کی حکمتِ عملی سن کر دنگ رہ گیا۔ اس نے اپنی مجلسِ مشاورت بلائی اور سکھا گکھڑ کے بارے میں تفصیل سے بات چیت کی اور فیصلہ کیا کہ دس ہزار غضبناک گھڑ سواروں کی ایک برق رفتار فوج بھیج کر لاہور کا محاصرہ کر لیا جائے۔ حکم یہ تھا کہ ایک بھی گکھڑ شہر سے زندہ جانے نہ پائے۔ سکھا گکھڑ زیرِ دام آ گیا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں گکھڑوں نے نہایت بہادری سے دفاع کیا۔ لیکن سکھا کو لاہور کے عوام کو سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی۔ جب جنگ شدت اختیار کر گئی تو پوری آبادی نے گکھڑوں پر حملہ کر دیا اور سکھا گکھڑ کو اس کی منظورِ نظر عورتوں سمیت ایک ایک گکھڑ کو قتل کر دیا۔ پہاڑوں سے آئے ہوئے وحشی شخص کا راج اندر ہی سے سقوطِ ناگہانی کا شکار ہو گیا۔ لیکن ایسا تو ہوتا ہی ہے جب حکمران لوگوں کو سمجھنے میں غلطی کریں اور ان کی خاموشی کو کمزوری سمجھیں اور بعینہٖ سکھا گکھڑ کے ساتھ ہوا۔

●○●○●○●

تعینات تھا۔ وہ فوراً وہاں لاہور پہنچا اور اس کے جنازے میں نمایاں ماتمی تھا۔ جب آخری بار اس نے چلّا کر مشہور جملہ ادا کیا تھا۔ ''اب بہت عرصے بعد اس جیسا کوئی اور شخص پیدا ہوگا۔''

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے دو برس بعد وینچورہ کو سکھ سلطنت کا خاتمہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے 1841ء میں لاہور میں اپنا مکان فروخت کر دیا، اپنی بیٹی کو ساتھ لیا اور مکان کی فروخت سے حاصل شدہ روپیہ، اپنا سونا اور دیگر اثاثوں کو لے لیا۔ وہ اپنی فرانسیسی بیوی اور حرم کو پیچھے چھوڑ گیا ''یہ سب سدِ راہ ہیں!'' وہ اپنی جاگیر پر رہنے کے لیے فرانس چلا گیا۔ اس کے مطابق ''یہ آرام کا وقت تھا'' اور 3/اپریل 1855ء کو وہیں انتقال کر گیا۔ اگر کسی شخص نے لاہور کو اپنا مسکن بنایا تو وہ جنرل ژاں بپٹسٹ وینچورہ تھا، جسے اپنے ہر کام سے لگن تھی۔ لیکن جس کا طریقِ کار واقعی قابلِ اعتراض تھا، اسی لیے تو اسے ''اطالوی نژاد لاہوری جنونی'' کہا جاتا تھا۔ جب وہ چل پڑا تو پھر چل ہی پڑا۔

●○●○●○●

لاہور کا وحشی حکمران

لاہور کے حصاری اندرون شہر نے متعدد حکمران دیکھ رکھے ہیں جن میں بہت سے جابر تھے اور بہت سی جنونی عورتیں تھیں، حتیٰ کہ ایک ہیجڑا حکمران بھی تھا۔ یہ سب لوگ، تمام کے تمام، اقل ترین آمر حکمران تھے۔ تاتاری بھی آئے اور کئی بار آئے۔ زنا بالجبر کرتے رہے، لوٹ کھسوٹ کرتے رہے اور کئی بار شہر ہی کو جلا کر راکھ کرتے رہے۔ شہر ٹوٹے پھوٹے حصوں کو جوڑ جاڑ کر آگے بڑھتا رہا۔ شہری اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتے تھے حتیٰ کہ سکھا گکھڑ ان پر حملہ آور ہو گیا۔

شہنشاہ محمد شاہ کے عہدِ حکومت میں ایک تغلق، جو گورنر یا صوبیدار کہلاتا تھا، دہلی سے لاہور پر حکومت کرتا تھا۔ اقتدار کے مرکز سے دُور اور کابل اور دہلی کے راستے پر واقع، جہاں سے عموماً سب حملہ آور آیا کرتے تھے۔ لاہور شہر کی تزویری اہمیت اس کی دہلی میں برصغیر کے تخت پر قبضہ کرنے کی نیت سے پہنچنے سے پیشتر آخری بڑے فوجی پڑاؤ کی وجہ سے تھی۔ فوجی پہلو کے ساتھ ساتھ اس کی معاشی اہمیت بھی تھی کیونکہ اس میں، اس سارے علاقے کی سب سے بڑی اور اہم ترین اناج اور دیگر اشیاء کی منڈیاں واقع تھیں اور آج بھی ہیں۔ یہ علم کا گہوارہ بھی تھا۔ یہ تمام کشائش متعدد شہنشاہوں، حملہ آوروں اور تخت و تاج کے دعویٰ داروں کو اس امر کے اچھے خاصے ثبوت فراہم کر دیتے تھے کہ لاہور دہلی کی نسبت کہیں زیادہ سُود مند پیشکش تھی۔ کیونکہ یہاں کنواری لڑکیاں، خوبصورت تر تھیں اور موسیقی شیریں تر، دیگر معاملات کی تو بات ہی نہ کریں۔ یہ اِمتزاج سکھا گکھڑ کی فیصلہ کن کشش کا ثبوت بن گیا۔

گکھڑ قبیلہ شمال میں پہاڑوں کی ترائی میں آباد ہے۔ ان کا بڑا کاروباری قصبہ آج بھی سیالکوٹ کے نزدیک گکھڑ منڈی کہلاتا ہے۔ گکھڑ قبیلہ اس علاقے میں اور ہزارہ کی جانب پہاڑیوں تک پھیلا ہوا ہے۔ انہی ترائیوں میں ایک لمبا تڑنگا خوبصورت شخص پیدا ہوا جو غیر معمولی طور پر بہادر اور اکھڑ تھا۔ جو ایک ہزار سے زائد افراد پر مشتمل فوج کا سپہ سالار تھا۔ جو سب کے سب گھڑ سوار تھے اور ان کا واحد مقصد لوٹ مار اور غارت گری تھا۔ انہیں قلعہ بند لوگوں پر اپنی رفتار اور قوتِ محرکہ کی حکمتِ عملی کی وجہ سے برتری حاصل تھی۔ ان کے آباؤ اجداد نے

صدیوں حملہ آوروں کو آتے جاتے دیکھا تھا۔ ان کے نزدیک جس طریقے سے زندہ بچ رہے تھے وہ ان کا برصغیر کی لوٹ مار کر کے سب کچھ اپنے ہمراہ گھروں کو لے جانا تھا۔ سکھوں کا بہت بعد میں عروج سکھا گکھڑ کے عملی تجربات کا نتیجہ تھا، جو اپنے زمانے کا رابن ہڈ تھا اور افغانستان کے لٹیروں کو لوٹتا تھا۔ سکھا گکھڑ نے کئی بار لاہو کے چکر لگائے تھے اور قائل ہو چکا تھا کہ شہر پر قبضہ کر کے حکومت کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک لائحہ عمل تیار کیا کہ خاصی تعداد اور مغلوب کرنے والی قوت کے ساتھ حملہ کیا جائے، معقول وقت تک تخت نشینی کی جائے اور ہر قیمتی شے کو ساتھ لے جانے کے لیے جمع کیا جائے اور سرکاری فوج کے آنے سے پیشتر پہاڑوں میں واپسی کا رخ کر لیا جائے۔

سکھا گکھڑ نے پہلی بار ہزارہ کی پہاڑیوں سے، جہاں میدانی علاقوں میں کارفرما جاسوسوں سے دُور رہ کر اس نے اپنے لوگوں کی تربیت کی تھی، اپنی فوج کے ہمراہ لاہور کا رُخ کیا۔ وہ تین ہفتوں میں لاہور پہنچا اور راستے میں آنے والے تقریباً ہر گاؤں اور قصبے کو لوٹتا اور غارت گری کرتا رہا۔ وہ بڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھتا چلا گیا کیونکہ حملے سے ایک ہفتہ پہلے اس کے کارندے بڑی شاہراہوں کے کناروں پر تعینات تھے، جنہوں نے ہر مشکوک شخص کو، جو ذرا سا بھی سرکاری کارندہ یا جاسوس لگتا تھا، بے دریغ قتل کر ڈالا تھا۔ وہ 785ھ میں پہلی بار لاہور میں داخل ہوا تو اس نے پوری دفاعی فوج کو قتل کر دیا تھا اور ہر سرکاری اہلکار کو پھانسی دے دی تھی اور ان کے سروں کو نیزوں پر ٹانگ کر شہر کی گلیوں میں نمائش کی گئی تا کہ لوگوں کے دلوں میں دہشت پیدا ہو۔ اس کی فوجیں شہر کے ایک ایک گھر میں داخل ہو کر ہر قیمتی شے کو چھین لے گئیں اور اگر انہیں کوئی عورت پسند آ گئی تو اُسے بھی اٹھا لے گئے۔

سکھا گکھڑ اور اس کے ساتھیوں کی موجیں ہو گئیں، کیونکہ ان دہقانوں نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی شان و شوکت کا نظارہ ہی نہیں کیا تھا۔ اگر کسی شخص نے اپنے ساتھ زیادتی کی شکایت کی تو اُسے موقع پر ہی ہلاک کر دیا گیا۔ لاہور پر قبضے کے دو ہفتوں کے اندر اندر اس نے منڈیوں سے نصف سے زائد اناج اور مسالے، چھکڑوں کے ذریعے، گکھڑوں کی پہاڑیوں میں خفیہ ٹھکانوں پر پہنچا دیئے۔ شہنشاہ کو سقوطِ لاہور کا علم ہوا تو اُس نے فوری طور پر اپنے شہزادے ہمایوں کی سرکردگی میں شاہی افواج روانہ کر دیں تا کہ لاہور کو اُن سے بازیافت کرایا جا سکے۔ لیکن پھر جیسا کہ قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں، شاہی فوج کے دہلی سے پنجاب میں داخلے سے پیشتر ہی شہنشاہ کا انتقال ہو گیا اور فوج کو جانشین کے تخت پر بیٹھنے تک وہیں رکنے کا حکم ملا۔ اس وقفے کے دوران سکھا گکھڑ کو جاہ و جلال کا خیال آیا، کیونکہ اس وقت تک ابتدائی قتل و غارت کی وجہ سے پیدا ہونے والے خلاء کو مقامی افراد کی چھوٹی سی نوکر شاہی بڑے سرعت کے ساتھ پُر کر چکی تھی۔ لاہور کی گلیوں میں ایک مثل گونجی ''اپنی ماؤں بیٹیوں کو بھول جاؤ، اپنی روٹیوں کو چھپا لو کیونکہ سکھا آ گیا ہے۔'' آج تک شہر کے بہت سے بزرگ سرکار کی کارکردگی بیان کرتے وقت اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ نئے شہنشاہ سلطان محمود شاہ نے 796ھ میں تخت نشینی کے فوراً بعد لاہور کی بازیافت کے لیے پہلے سے بھی بڑی سپاہ روانہ کرنے کا حکم جاری کیا۔ سکھا گکھڑ نے اپنی افواج کو شہر کے مشرقی جانب مجتمع

کیا، جہاں آج کل گڑھی شاہو کا علاقہ ہے۔ بڑی گھمسان کی جنگ ہوئی اور سکھا نے بڑی عقلمندی سے بھاری بھرکم روایتی فوج کا سامنا کرنے کے بجائے پسپائی کا فیصلہ کیا۔ اس نے عورتوں اور دولت کے ساتھ فرار کا منصوبہ پہلے ہی سے تیار کر رکھا تھا۔ جونہی رات آئی اس کی فوجوں نے مدِ مقابل فوج کو دھوکا دے کر دریائے راوی کو عبور کیا اور جموں کی پہاڑیوں کی طرف غائب ہو گئیں۔ اس کی تیز رفتاری اور حکمتِ عملی نے اس اَمر کو ممکن بنایا کہ تغلق افواج ان کا پیچھا نہ کر سکیں۔

جموں اور ہزارہ کی پہاڑیوں میں، تب تجربہ کار سکھا گکھڑ نے نئی گروہ بندی اور اپنی فوج میں مقامی علاقوں سے، جو گوجرانوالہ سے ہزارہ اور جموں تک پھیلے ہوئے تھے، بھرتی میں مزید اضافہ کیا۔ لاہور میں مختصر حکمرانی کے دور میں گکھڑ منڈی اناج کی بڑی منڈی بن گئی اور آج تک بنی ہوئی ہے۔ سکھا گکھڑ ہی کی بدولت چند صدیوں بعد گوجرانوالہ سے، سکھا کی رہائش کے نہایت قریب، ایک سکھ لیڈر پیدا ہوا جس نے فوج اکٹھی کر کے نہ صرف لاہور بلکہ پورے پنجاب پر حکومت کی۔ جس نوکر شاہی نے سکھا کی مدد کی تھی انہیں سزائیں دی گئیں، لیکن پھانسیاں نہیں دی گئیں اور وہ شہر میں اپنی دولت اور اثر و رسوخ کے ساتھ رہتے رہے۔ انہوں نے بڑی آسانی سے طرفداری بدل لی تھی۔

ہوا یوں کہ اسی زمانے میں امیر تیمور، شہنشاہ کو للکانے کے لیے شمال سے دہلی کی جانب روانہ ہو چکا تھا اور اس کے بیٹے شہزادہ پیر محمد نے میمنی حملے کے ذریعے ایک زبردست جنگ کے بعد ملتان پر قبضہ کر لیا تھا۔ برصغیر میں ایک عظیم تبدیلی نمودار ہونے کو تھی۔ جب یہ دونوں فوجیں جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھیں، سکھا گکھڑ کو اپنی نوکر شاہی کا اشارہ ملا اور وہ برق رفتاری سے روانہ ہو گیا۔ اس نے فریب سے کام لے کر چند گھنٹوں ہی میں لاہور پر قبضہ کر لیا کہ ہر کس و ناکس ششدر رہ گیا۔ انتقام کے ساتھ جابرانہ حکومت لاہور پر دوبارہ قابض ہو چکی تھی اور ساتھ ہی دہلی پر بھی، کیونکہ وہاں تیمور کی فوجوں نے اپنی مورچہ بندی مستحکم کر لی تھی۔

کشمیر جاتے ہوئے تیمور کی توجہ سکھا گکھڑ کے طور طریقوں کی جانب دلائی گئی۔ تو اس نے پورا دن دھیان نہ دیا۔ طاقتور تیمور، جو خود چنگیز خان کا وارث ہونے کی بناء پر بے رحم جنگجو مشہور تھا، اس شخص کی حکمتِ عملی سن کر دنگ رہ گیا۔ اس نے اپنی مجلسِ مشاورت بلائی اور سکھا گکھڑ کے بارے میں تفصیل سے بات چیت کی اور فیصلہ کیا کہ دس ہزار غضبناک گھڑ سواروں کی ایک برق رفتار فوج بھیج کر لاہور کا محاصرہ کر لیا جائے۔ حکم یہ تھا کہ ایک بھی گکھڑ شہر سے زندہ جانے نہ پائے۔ سکھا گکھڑ زیرِ دام آ گیا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں گکھڑوں نے نہایت بہادری سے دفاع کیا۔ لیکن سکھا کو لاہور کے عوام کو سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی۔ جب جنگ شدت اختیار کر گئی تو پوری آبادی نے گکھڑوں پر حملہ کر دیا اور سکھا گکھڑ کو اس کی منظورِ نظر عورتوں سمیت ایک ایک گکھڑ کو قتل کر دیا۔ پہاڑوں سے آئے ہوئے وحشی شخص کا راج اندر ہی سے سقوطِ ناگہانی کا شکار ہو گیا۔ لیکن ایسا تو ہوتا ہی ہے جب حکمران لوگوں کو سمجھنے میں غلطی کریں اور ان کی خاموشی کو کمزوری سمجھیں اور بعینہٖ سکھا گکھڑ کے ساتھ ہوا۔

●○●○●○●

بِلّو اور اس کی رانیوں کی مقبولِ عام روایت

کچھ عرصہ قبل پنجابی گلوکاروں میں سب سے زیادہ تخلیقی فنکار، ابرار الحق نے بِلّو کے نام سے ایک گانا گایا جو تمام پوپ گانوں میں سرِفہرست رہا۔ اس کے مقبولِ عام ہونے کی معقول وجہ یہ بھی تھی کہ بِلّو کا نام ایک عجیب سا سحر طاری کر دیتا ہے۔ کشش کی وجہ پنجابی تاریخ میں اس کی گہری جڑیں ہیں، جو اہلِ لاہور کے لیے ایک خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

تاریخ کے تمام عظیم الشان شہنشاہوں کی طرح رنجیت سنگھ کا بھی آبادحرم تھا اگرچہ یہ حجم میں اتنا بڑا نہیں تھا، جتنے بڑے اس سے پہلے مغلوں اور ان جیسے دیگر حکمرانوں کے تھے۔ رنجیت سنگھ قلعہ لاہور کے بڑے سے شیش محل کے اوپر والی منزل کے چھوٹے سے کمرے سے اپنی سلطنت کے سنگھاسن پر سریر آرا ہوا کرتا تھا۔ اس کا حرم چار طبقات میں منقسم تھا۔ پہلے دو طبقوں میں نو نو عورتیں تھیں، تیسرے میں سات عدد اور چوتھے میں اکیس عورتیں تھیں۔ ہر طبقے کی عورتوں کا انتخاب سکھ اور مسلمان علماء کیا کرتے تھے جنہیں علم الاعداد اور علم رمل اور نجوم میں ملکہ حاصل تھا۔

پہلے طبقے میں شاہی بیگمات شامل تھیں جو تمام کی تمام سیاسی نظریۂ ضرورت اور معاہدوں اور پسند و ناپسند کے مطابق ہوتی تھیں۔ دوسرے درجے میں بیوہ عورتیں شامل تھیں جن سے بیگمات ہی کی طرح برتاؤ کیا جاتا تھا۔ تیسرے درجے میں منتخب داشتائیں تھیں، جو تمام تعلیم یافتہ اور ذہین عورتیں ہوتی تھیں۔ آخری درجے میں کنیزوں کی صف بندی تھی۔ ان تمام عورتوں کا انتخاب ان کی خوبصورتی کی بِنا پر ہوتا تھا اور وہ سلطنت کے دور و نزدیک سے لائی جاتی تھیں۔ ان کے لیے یہ معمول کی بات تھی کہ انہیں پچیس برس کی عمر کو پہنچ کر ریٹائر ہو جانا ہے تاکہ نئی اور نوجوان عورتیں ان کی جگہ لے سکیں۔ شاہی گھرانوں میں یہی زندگی کا چلن تھا۔

لاہور میں بشیراں نام کی ایک عورت تھی جو غیر معمولی طور پر حسین و جمیل تھی۔ وہ نہایت اعلیٰ درجے کی گلوکارہ تھی اور مہاراجہ پر نشہ طاری کر دیتی تھی۔ رنجیت سنگھ اس کی بلّی کی مانند ہلکی بھوری آنکھوں کی وجہ سے اُسے

بِلّو کہا کرتا تھا۔اس کا لازوال حسن ایسا تھا کہ سارے لاہور کو پتہ تھا کہ بِلّو مہاراجہ کے سوا سب کے لیے ممنوعہ ہے۔وہ ہر لحاظ سے شہنشاہ کی منظورِ نظر تھی، جس نے اس کے لیے آٹھ ہزار روپے سالانہ کی جاگیر دینے کا حکم جاری کیا۔حالانکہ کسی بھی دوسری عورت کو اس سے نصف دیا کرتا تھا۔اس کا مؤثر اثاثہ دیوانِ حافظ کی غزلیں گانے کی صلاحیت تھا جن میں سے اکثر اسے زبانی یاد تھیں۔اس کی آواز میں جو نغمگی تھی اس کا موازنہ شاذ و نادر ہی کیا جا سکتا تھا۔لاہور کی گلیوں میں اگر کسی نوجوان حسینہ کی اَنا اس کے سراپے سے بڑھ کر ہوتی تو اسے طنزاً بِلّو کہا جاتا تھا۔یہ تھا لاہور کی بشیراں کی غضبنا کی کا عالم! ایک تحریر کے مطابق، پانی والا تالاب کے قریب ایک وسیع حویلی میں اس کی رہائش تھی۔

ایک اور تحریر میں ایک دلچسپ واقعہ درج ہے کہ ایک روز رنجیت سنگھ نے تفریحی مُوڈ میں بشیراں کو پیشکش کی کہ وہ اسے پندرہ ہزار مالیت کے زیور اور چار ہزار روپے کی مزید جاگیر عطا کرے گا، اگر وہ نیک دل مسلمان وزیر فقیر نورالدین کو اپنی محبت میں اسیر کر لے تو! ''نہیں مہاراجہ شکریہ!'' بِلّو نے کہا۔''مجھے خدشہ ہے کہ اس جیسے مقدس شخص پر گناہ کی نظر ڈالنے سے کہیں میں اندھی نہ ہو جاؤں۔'' بہرحال فقیر نورالدین کے بھائی فقیر عزیزالدین جو خود بھی دربار میں وزیر تھا، اس کی اداؤں پر مر مٹا۔ایک روز جب وہ مہاراجہ سے ملنے گیا تو اس کے مشاہدہ میں آیا کہ راجہ حافظ کی غزل سننے میں مگن تھا۔وہ شاعری سننے کے لیے ٹھہر گیا اور ایک مقام پر وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور اس نے ''اللہ اکبر'' کا نعرہ بلند کیا اور پھر اپنے آپ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے قریبی پانی کے تالاب میں چھلانگ لگا دی۔شاہی خدّام بھی اس کی جان بچانے کے لیے ان کے ساتھ ہی تالاب میں کود گئے، کیونکہ وہ بیہوش ہو چکا تھا۔اس روز کے بعد سے جب بھی فقیر عزیزالدین کی مہاراجہ کے دربار میں آمد کی اطلاع ملتی تو ہر قسم کی موسیقی بند کر دی جاتی تھی۔مہاراجہ کہا کرتا ''بھاراؤ بھاگ جاؤ۔'' بھاراؤ پنجابی میں فاختہ کو کہتے ہیں، لیکن اس کی مراد سازندے ہوتے تھے۔یہ محاورہ آج بھی لاہور کے قدیم شہر میں رائج ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ بِلّو کی موجودگی میں کیسی نشستوں کا اہتمام کیا کرتا تھا اس کی ایک جھلک پیشِ خدمت ہے۔ان نشستوں میں جو شراب پلائی جاتی تھی وہ نہایت منتخب کشمش سے کشید کی جاتی تھی، جس میں نہایت باریک پسے ہوئے موتیوں کی آمیزش کی جاتی تھی۔وِکٹر یکموں نے بہت بعد میں تحریر کیا کہ شراب نہایت اعلیٰ درجے کی تھی اور بِلّو کے ساتھ نشستوں میں بے ہودگی کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا، بلکہ نہایت سنجیدہ ہوتی تھیں اور اپنی مثال آپ ہوا کرتی تھیں۔یہ عام تاثر کہ ان میں رنگ رلیاں منائی جاتی تھیں، اس کا سچائی سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ایسی نشستیں فنون کے نکتہ رس صاحب الرائے حضرات کے لیے تھیں یا ان کے لیے جو شاعری اور فنونِ لطیفہ کے گرویدہ تھے۔

اپنی جوانی میں بِلّو کا طائفہ چالیس جواں سال ناچنے والیوں پر مشتمل تھا۔اپنے گانے کے دوران وہ

پسِ منظر میں خاموش ناچ پیش کرنے کی صلاحیت کو بروئے کار لاتی تھی، تا کہ جو غزلیں وہ گایا کرتی تھی ان کا ایک مکمل تاثر اُبھر سکے۔ ہر ناچنے والی لڑکی ''بِلّو رانی'' کہلاتی تھی۔ یہ اصطلاح آج بھی اندرون شہر مستعمل ہے۔ بِلّو جو لباس اِن ناچنے والی ''رانیوں'' کو پہنایا کرتی تھی وہ آج بھی لاہور کے علاقے ٹبّی میں اس پیشے کو اپنانے والیاں وہی لباس زیب تن کرتی ہیں۔ بلاشبہ لاہور کی بشیراں عرف بِلّو اپنے زمانے کی عظیم مغنّیہ تھی۔ یہ مقبولِ عام روایت اب تک قائم دائم ہے۔

فقط لاہور ہی نہیں بلکہ پورے پنجاب کے لوگوں کے ذہنوں میں بِلّو کے نئے تصور کو پیدا کرنے کا اعزاز ابرار الحق کو جاتا ہے۔ یہ بُرا خیال نہیں ہے کہ اس تخلیقی عبقری کو چاہیے کہ ان جیسی حیرت انگیز عورتوں کے بارے میں مزید مطالعہ کرے اور عوام الناس کے ذہنوں میں بِلّو جیسی عورتوں کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت اور جوہرِ قابل کی حامل عورتوں کو دوبارہ بحال کر سکے۔

●○●○●○●

گھڑ سوار جس نے فیروز پور روڈ بنائی

جب بھی آپ مزنگ چونگی سے مڑ کر ماڈل ٹاؤن کی طرف یا اس سے بھی ورا فیروز پور روڈ پر سفر کریں تو ٹرینٹی کالج کیمبرج سے تعلیم یافتہ میجر ہڈسن بی اے کو ایک لمحہ کے لیے یاد کر لیا کریں۔ وہ کوئی عام شخص نہیں تھا۔ فیروز پور روڈ کی کہانی بڑی دلفریب اور تاریخ میں گڑھی ہوئی ہے۔

جب انگریزوں نے لاہور پر قبضہ کیا تو شہر کو ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے ملانے والی واحد سڑک شیر شاہ سوری والی جرنیلی سڑک ہی تھی۔ امرتسر سے لاہور آنے والی یہ سڑک قلعۂ لاہور کے شمالی جانب تھوڑا سا خم کھا کر گوجرانوالہ کی طرف مڑ کر پشاور تک چلی جاتی تھی۔ اگرچہ پورا پنجاب مارچ 1849ء میں انگریزوں کے تصرف میں آیا، لیکن لاہور اور اس کے قلعہ پر انگریز 1848ء ہی سے قبضہ کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور کی چھاؤنی میاں میر کے مقام پر واقع ہے، کیونکہ اسی جگہ لاہور پر قبضے سے پہلے انگریزی فوجوں نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ پنجاب کی سرحد ستلج سے شروع ہوتی تھی اور پنجاب کی مکمل فتح کے لیے اپنی افواج کی میسرہ اور میمنہ کارروائیوں کے لیے، انگریزوں کی نظر میں اس علاقے کی بے حد اہمیت تھی۔

کرنل ایچ ایم لارنس، یہ وہی شخص ہے جس نے ہماری بدقسمت جنگِ آزدی میں گائیڈز کور، یعنی راستہ بتانے والی فوج کو ازسرِنو منظم کیا تھا، نے ہڈسن کو بلایا جو اس وقت فوج میں لیفٹیننٹ کے عہدہ پر فائز تھا اور اسے بتایا کہ فوری طور پر انہیں لاہور سے قصور (جسے انگریز قصور کیمپ کہتے تھے) اور اس سے ورا ستلج تک ایک ٹھیک ٹھاک سڑک تعمیر کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ لارنس نے اُسے کہا۔ ''ہڈسن ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ فیروز پور تک روڈ کی تعمیر کے کام کو تم سرانجام دو گے اک دو دن میں کام شروع کر دو اور جتنی جلدی ممکن ہو سکے اسے مکمل کرو۔'' فیروز پور روڈ کی تعمیر کے سلسلے میں یہ کُلّی ہدایت تھی۔ ہڈسن پہلے ہی خاصا نامور ہو چکا تھا کیونکہ اُسی نے گھڑ سوار رجمنٹ ''ہڈسنز ہَورس'' تشکیل دی تھی، جس نے دہلی کے لال قلعہ کو فتح کر کے غدّر کا خاتمہ کر دیا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے اپنے پنجابی گائیڈوں کے ہمراہ شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو اس کے دونوں بیٹوں اور پوتے ابو بخت

کے ہمراہ ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کیا تھا۔ وعدے کے مطابق اس نے شہنشاہ کی جاں بخشی تو کر دی لیکن دیدہ دانستہ شہنشاہ کے دونوں بیٹوں اور پوتے کو گولی مار کر ہلاک کر ڈالا اور ان کی لاشوں کو کوتوالی کے باہر چبوترے پر ایک روز سے زیادہ عرصے تک دھوپ میں گلنے سڑنے کے لیے چھوڑ دیا۔ بعدازاں اس نے تحریر کیا کہ وہ دانستہ طور پر تیمور کے تاتاری خاندان کا قلع قمع کرنا چاہتا تھا۔ اگر آپ لاہور کے علاقے ڈیفنس کی طرف جاتے ہوئے گلبرگ سے آنے والی سڑک کا موڑ مُڑیں تو بائیں ہاتھ نکڑ پر ہڈسنز ہَورس تعینات تھی اور اب تک ہے۔ برصغیر کی تاریخ کا اچھوتا شاہکار، جسے ہم نے اپنے بچوں کو بتانے کی کبھی زحمت گوارہ نہیں کی۔

حکم یہ تھا کہ سڑک کو مزنگ گاؤں، جو اس وقت لاہور کی حدود سے باہر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، کے عین بیرون واقع ''چونگی'' سے شروع کیا جائے۔ اس سڑک کو بنیادی طور پر قصور کے قصبے، جو اس وقت پٹھانوں کا مضبوط قلعہ تھا اور انگریزوں کی مزاحمت کرتا آیا تھا، کے قریب سے گزر کر برطانوی ہندوستان کے شہر فیروز پور کی طرف جانا تھا۔

ہڈسن ایک اَن تھک گھڑ سوار تھا۔ اس کے لیے ستّر میل روزانہ گھڑ سواری معمول کی بات تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پورے ہندوستان میں چین کی سرحد سے لے کر کشمیر تک اور کابل اور کلکتہ تک، گھڑ سواری کے ذریعے سفر کر چکا تھا۔ ایک کتاب میں اعتراف کیا گیا ہے کہ گذشتہ ڈیڑھ سو برس میں، جب سے انگریز یہاں آئے تھے، کسی اور نے ہڈسن سے زیادہ گھڑ سواری نہیں کی تھی۔ چنانچہ ہڈسن مزنگ سے فیروز پور تک علاقے کے مساحتی نقشے کا معائنہ کرنے روانہ ہو گیا۔ روایتی حیثیت کا مالک گھڑ سوار ایک سڑک بنانے والا بن گیا۔ اس کی زندگی دُوربینوں، گنٹر زنجیروں، قطب نماؤں، زاویہ پیماؤں اور ان جیسے دیگر آلات سے عبارت ہو کر رہ گئی۔ اس کا سڑک بنانے کا طریقہ کار بڑا غیر معمولی تھا۔ روایتی اقتدار اور جمہوریت کا ملغوبہ۔ بعدازاں اس نے تحریر کیا کہ سڑک کی تعمیر میں تیزی اس حقیقت کی مرہونِ منت تھی کہ ہر ایک کو اچھی طرح ادائیگی کی گئی اور ہر ایک نے اسی طرح اچھا کام بھی کر کے دکھایا۔ اس کے طریقِ کار کا مطالعہ خاصے کی چیز ہے۔

لیفٹیننٹ ہڈسن دو دن میں تین مرتبہ لاہور سے فیروز پور آتا جاتا رہا اور راستے میں آنے والے تمام ''سرپنچوں'' سے ملاقاتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے پنچائتوں کے اجلاس میں شرکت کی اور اُن سے بحث کی کہ سڑک کی تعمیر کے لیے مزدور مہیا کرنا ان کا فرض ہے۔ اس نے ان سے پوچھا کہ کام کی مناسب اُجرت کیا ہو گی؟ طویل دلیل و بحث کے بعد بالآخر اُجرت طے ہو جاتی اور کام شروع کر دیا جاتا۔ چونکہ انگریزوں کی آمد سے قبل برسرِ اقتدار سکھوں نے دیہاتیوں سے بے رحم لوٹ کھسوٹ کی تھی، اس لیے ہڈسن کا طریقہ کار ان کے نزدیک بالکل متضاد تھا۔ غریبوں نے اسے بہت پسند کیا اور توقعات سے بڑھ کر کام کیا۔

لیفٹیننٹ ہڈسن نے بہترین راستہ تلاش کرنے کے لیے رات کو آگ روشن کر کے سڑک کے خمیدہ

موڑوں کا مطالعہ کیا۔ اس کے لیے یہ فنونِ لطیفہ کا کام تھا۔ ہڈسن نے گرمیوں کے تین طویل مہینوں میں تقریباً روزانہ ایک بار اس راستے سے گھوڑے کا سفر کیا ہوگا۔ خیال کیجیے ایک جنونی انگریز کا جو ہر روز مزنگ سے قصور اور پھر وہاں سے فیروز پور تک گھوڑے پر سوار سفر کرتا تھا اور پھر اسی رات واپس لوٹ آتا تھا۔ اسے جنونی کہنا برحق ہے۔ کیونکہ 1857ء کی جنگِ آزادی میں اس کے کارنامے اس کے جنونی ہونے کا بیّن ثبوت ہیں۔ اس کے لیے کام کرنے والے پنجابی مزدور بھی کچھ کم جنونی نہ تھے۔ اچھا کام کرنے کے معاوضے کے طور پر انہیں روزانہ اچھے کھانے اور مناسب اُجرت ملتی تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہتا۔ تین مہینے اور اکیس روز میں فیروز پور روڈ مکمل ہو گئی۔ جدید انجینئرنگ کے معیار کے لحاظ سے بھی یہ ایک معجزہ سے کم نہیں تھا۔ اس کا طریقِ کار بہت مدلل تھا اور اس کی جڑیں ملکی منطق میں پیوست تھیں۔

اس نے کیا یہ تھا کہ پوری سڑک کو چالیس حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس نے ''سرپنچ'' سے کام لے کر اُسے ہر حصے کے لیے سات سو صحت مند افراد فراہم کرنے کو کہا تھا جو روزانہ کم از کم بارہ گھنٹے کام کر سکیں۔ ہر ضلع کو سڑک کی تعمیر میں کرنے والے مطلوبہ کاموں کی تفصیل فراہم کر دی گئی تھی اور وہ ہر روز ہر ضلع کے کام کا معائنہ کرتا تھا۔ اس کی اَن تھک گھڑ سواری کی برداشت اس کے بہت کام آئی۔ اسی برداشت نے بعد ازاں 1857ء کی جنگ کے نازک دور اور دیگر ہڈسنز گھڑ سوار دستے کی مہمات میں اثر دکھایا۔ جب کام ختم ہو گیا تو اسے سڑک بنانے کے گھسے پِٹے کام سے نکل کر بے حد خوشی ہوئی اور وہ ایک بار پھر گھوڑے پر سوار فوجی زندگی کی جانب لوٹ گیا۔

اگر ہمیں اپنی موٹروے شاہراہیں خود بنانی ہیں، مقامی مدد سے، مقامی انجینئروں، ٹھیکیداروں اور مقامی مٹیریل سے، تو یقیناً ایسا کیا جا سکتا ہے اور نہایت سرعت کے ساتھ۔ کم از کم ہڈسن کا تجربہ تو یہی بتاتا ہے، جس طرح چینیوں نے 1949ء کے انقلاب کے بعد کیا تھا۔ لیکن پھر ہماری اس خوبصورت سرزمین میں کسی بھی کارآمد کام کرنے کے لیے جنونی ہونا پڑے گا۔

●○●○●○●

حسّو تیلی کے روحانی معجزے

مجھے اکثر حیرانی ہوتی کہ لوہاری دروازے کے اندر چوک جھنڈا کا نام کیسے پڑا تھا؟ اس مقام پر بہت سے واقعات ہو چکے تھے، لیکن اصل امتیاز اس حقیقت میں ہے کہ اس جگہ ایک حسّو تیلی نامی بزرگ اناج کی دکان کرتے تھے، لیکن یہ تو کوئی امتیاز کی بات نہیں لگتی۔

حسّو کا اصل نام شیخ حسّو تھا جو ذات کا تیلی (تیل نکالنے والا) تھا۔ وہ پیدائش سے وفات تک لوہاری دروازے میں ہی رہا۔ اسے اپنے شیخ باپ سے منڈی کی کھلی جگہ پر، اناج کی ایک دکان وراثت میں ملی تھی، جو اَب چوک جھنڈا کہلاتی ہے۔ یہاں اب بھی اندرون شہر میں ایک بڑی غلہ منڈی واقع ہے۔ اس منڈی میں پہنچنے کے لیے موری دروازے سے داخل ہو کر دائیں ہاتھ بل کھاتی ہوئی سڑک پر جانا ہوگا۔ ایک دوسرے راستے سے یہاں جانے کے لیے لوہاری دروازے میں داخل ہو کر پہلے چوک سے بائیں ہاتھ مڑنا ہوگا، دونوں راستے چوک جھنڈا آ کر ختم ہو جاتے ہیں۔

حسّو تیلی اپنی دکان میں بڑی خاموشی سے بیٹھا رہتا تھا اور چپ چاپ لوگوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے تسبیح پڑھتا رہتا تھا۔ یہ زمانہ 955-1004ء کا تھا۔ اکثر اوقات وہ آنکھیں بند کیے رہتا۔ جب بھی کوئی گاہک اس کی دکان میں آتا تو وہ اسے خود ہی اناج تولنے کے لیے کہہ دیتا اور اگر کوئی شخص ایسا کرنے سے انکار کر دیتا تو وہ اسے کوئی شے فروخت ہی نہ کرتا تھا۔ بہت جلد لوگوں کو پتہ چل گیا کہ اگر ادا شدہ رقم سے زیادہ مالیت کا اناج تول کر لے جاتے تھے تو گھر پہنچنے تک فالتو اناج غائب ہوا جاتا تھا اور اسی قدر رہ جاتا جتنی ادائیگی کی ہوتی تھی۔ البتہ اگر انہوں نے ادائیگی کے عین مطابق یا تھوڑا کم تولا ہوتا تو گھر پہنچنے پر اناج وزن سے زیادہ ملتا۔

یہ روایتی حکایت لگتی ہے لیکن لاہور کے بارے میں بے شمار کتابوں میں حسّو تیلی اور اس کے اس کرشمے کے بارے میں بے شمار واقعات منقول ہیں۔ بہت جلد لوگوں کو پتہ چل گیا کہ حسّو تیلی کو دھوکا دینا بے سود تفریح ہے اور پھر لوگوں نے اپنے مسائل کے حل کے لیے حسّو تیلی کے پاس آنا شروع کر دیا۔ وہ ایسے تمام لوگوں سے یہی کہا کرتا کہ انہیں اس کے بجائے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنی چاہیے۔

حسّو تیلی کی شہرت جلد ہی دور و نزدیک پھیل گئی اور اس نے نشانی کے طور پر اپنی دکان کے سامنے ایک جھنڈا گاڑ دیا۔ جھنڈے کا کھمبا آج بھی وہیں موجود ہے۔ غلہ منڈی سے نزدیک ہی ایک گلی میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں حسّو آرام کیا کرتا اور نماز ادا کرتا تھا۔ وہ کمرہ اب بھی موجود ہے۔ شیخ حسّو 1004ء میں وفات پا گیا اور اسے اچھرہ میں حضرت بابا شاہ جمال کے مزار کے پاس واقع چھوٹے سے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ اپنے گھر سے اِتنی دور دفن کرنے کی وجہ اس کا حضرت شاہ جمال کا مرید ہونا تھا اور وہ بہت ہی ہر دلعزیز مرید تھا۔ مشہور مؤرخ کنہیالال نے لاہور کے بارے میں اپنی کتاب میں حسّو تیلی کی قبر کی تصدیق کی ہے۔ قبر پر کتبہ بھی لگا ہے۔

لیکن پھر یہاں ایک تردید آ جاتی ہے۔ اگر آپ ایبٹ روڈ سے چھوٹی سڑک کی جانب جائیں جہاں آج کل پاسپورٹ کا دفتر واقع ہے وہاں دروازے کے قریب ایک خوبصورت مسجد ہے۔ اندر ایک جانب ایک قبر بنی ہے جس پر لکھا ہے ''سیّد حسین المعروف حسوّ تیلی''۔ اس کا مطلب ہے کہ ایک خاص شخص کا نام اور صحیح تواریخ دی گئی ہیں۔ اس کی تصدیق علامہ عالم فقیری کی کتاب ''تذکرۂ اولیاء اللہ'' سے بھی ہوتی ہے۔ عام طور پر یہی یقین کرنے کی طرف مائل ہو گا کہ اچھرہ والی قبر ہی مصدقہ ہے کیونکہ وہ حضرت شاہ جمال کے مرید تھے۔ اگرچہ مولوی نور احمد چشتی نے لاہور کے بارے میں اپنی کتاب میں اس جگہ کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ انہوں نے صحیح جگہ کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہوئی ہے۔

حسّو کے حضرت شاہ حسین المعروف لال حسین سے بھی گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ اپنی حیات میں حضرت لال حسین کہا کرتے تھے، ''حسّو حسین ہے اور حسین حسّو ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔'' حسّو کی قبر ایک احاطے میں ہے جس میں شیخ سعد اللہ ستر پوش اور اس زمانے کے دیگر معروف صوفیاء کرام کی قبریں بھی ہیں۔ یہ تھا چوک جھنڈا کے خاموش دانشمند حسّو کا رتبہ اور شہرت!

اگر آپ چوک جھنڈا جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ لوگ اس کمرے میں جہاں کبھی حسّو بیٹھا کرتا تھا تیل کے چھوٹے دیئے اور موم بتیاں جلاتے ہیں۔ یہ روایت مادھو لال حسین کے پیروکاروں نے شروع کی تھی، جو حسّو کو اپنے زمانے کا صاحبِ بصیرت گردانتے ہیں۔ اس سے بے شمار معجزات منسوب ہیں، اگرچہ وہ اپنی قوتوں کے بارے میں خاموش ہی رہتا تھا۔

آج بھی چوک جھنڈا سینکڑوں برس سے اسی طرح کام کر رہا ہے۔ وہ ایک بڑی غلہ منڈی رہی تاوقتیکہ مشرقی حصے میں اکبری منڈی وجود میں آ گئی۔ تاریخی نقطۂ نظر سے یہ قدیم ترین غلہ منڈی کہلا سکتی ہے کیونکہ یہ لاہور کی قدیم اور بھولی بسری لاہور کی مغربی دیوار کے مشرقی جانب واقع ہے۔ جھنڈے کا کھمبا تقریباً چار سو پچیس برس پرانا ہے اور لاہور کی ایک قدیم روحانی روایت کی نشانی ہے۔ لاہور کے اس غیر معمولی صوفی بزرگ کے بارے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے کیونکہ ایسے لوگوں کو بھلانا نہیں چاہیے۔

●○●○●○●

لاہور کے راجپوت قبائل کا سلسلۂ نسب

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کے لاہور پر حملہ آور ہونے اور اسے فتح کرنے سے قبل شہر کا کردار راجپوتانہ تھا۔ یہاں دو بڑے قبیلے تھے۔ بھٹوں کا حکمران قبیلہ اور نہایت عدم مماثل سولنکیوں کا قبیلہ تھا۔ شہر کی راجپوتی روایات قرونِ وسطیٰ سے بھی قدیم ترین تھیں۔ ان میں سے بہت سی باقی رہ جانے والی مبہم ہیں، جو پنجاب کی تقسیم کے مستقل روگ کی وجہ سے اور بھی زیادہ مبہم ہوگئی ہیں۔

لاہور کی بیشتر منقولہ تاریخ افغانیوں کے ایک ہزار سال قبل حملوں سے شروع ہوتی ہے جس نے اس کی ثقافت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل کر رکھ دیا۔ حملہ آور مسلمانوں کا مذہب، کھانے پینے کی عادات اور ملبوسات مقامی راجپوتوں سے یکسر مختلف تھے۔ اگرچہ دوطرفہ ہم آہنگی بھی ہوئی لیکن لشکر کشی نے ''قدیم'' لاہور کو ہمیشہ کے لیے بدل کر رکھ دیا، جس کے متعلق ہمیں بہت کم علم ہے۔ میں نے اس تحریر میں کوشش کی ہے کہ لاہور کے ان دو نمایاں قبائل کے بارے میں، ان کی روایتی داستانوں میں اصلیت اور قومی زبانی روایات کے ذریعے، جو برصغیر کی تاریخ نویسی کا ایک طریقہ رہا ہے، ان کے نظامِ کار کے بارے میں سرسری جائزہ پیش کرسکوں۔

پہلے سولنکی قبیلے کے بارے میں تھوڑا سا بیان۔ ایک انگریز ڈاکٹر، ہنری والٹر بیلیوؔ (1834-1892ء) جو پٹھانوں کی تاریخ کا ماہر مانا جاتا ہے، 1864ء کی ایک تحریر میں رقمطراز ہے کہ زیادہ تر پختون قبائل کے نام دراصل راجپوتوں کے نام تھے جو امتدادِ زمانہ سے تبدیل ہوتے گئے۔ اسی سے یہ نظریہ پیدا ہوا کہ ہندوؤں نے اس علاقے پر، جسے افغانستان کہا جاتا ہے، پہلے قبضہ کر رکھا تھا جہاں بعد میں ''غیر ملکی'' قابض ہوگئے۔ پشاور میں بطور سول سرجن تعیناتی کے دوران ڈاکٹر بیلیوؔ نے مقامی زبانوں کے علم میں دسترس پیدا کی۔ دوسری جنگِ افغان کے دوران وہ کابل میں چیف پولٹیکل آفیسر تعینات تھا۔ جب وہ ہندوستان کے سرجن جنرل کی حیثیت سے ریٹائر ہوا تو وہ مشرقی زبانوں کا مستند ماہر تسلیم کیا جاچکا تھا۔

ڈاکٹر بیلیوؔ کا خیال ہے کہ سلیمان کا سابقہ راجپوت سولان سے اخذ کیا گیا ہے، جو موجودہ سولنکی میں

صاف نظر آتا ہے۔ سوری پختون وہ لوگ تھے، جنہیں سیلیوکس (جس کا تلفظ سولانکے ہے) کا بیٹا جو سکندرِ اعظم کی مشرقی سلطنت کا حکمران تھا، شام سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ آفریدیوں کا ذکر ہیروڈوٹس نے ''اپریتائی'' کے طور پر کرایا گیا ہے جنہیں غزنوی انہیں موجودہ جگہ پر لائے تھے۔ لیکن وہ افغان صوبے میمنہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آج زیادہ تر سولنکی اپنی جغرافیائی اصل پاکستان کے شہروں شیخوپورہ اور گجرات کے مابین علاقے بتاتے ہیں۔

سولنکی قبیلے کا راجپوتی سلسلۂ نسب، اگر ہم راجپوتوں کی تاریخ کے ماضی میں مزید پیچھے جائیں تو پُورا ناس کی مرتبہ ایک کتاب جس کا نام ''دیس و بھاگا'' (جیسا کہ ٹی ایچ تھرٹن نے تحریر کیا ہے) ہے میں اس کا سراغ ملتا ہے۔

یہ قبیلہ راجپوتانہ میں انل ہارا پتّن سے پنجاب اور اس سے بھی پرلی طرف پیش قدمی کر گیا ہے۔ لفظ ''سورج'' اور ''سن'' کی جڑ ایک ہی ہے ''سولر'' (سورج کی) کی طرح۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سورج کی پوجا کرتے تھے۔ سولنکی قبیلہ، اگرچہ لاہور میں ایک معمولی نوعیت کا قبیلہ ہے، لاہور ہی کو اپنی راجدھانی مانتا تھا۔ وہ زیادہ تر تاجر تھے۔ بعد کے برسوں میں ان کا اجتماع شیخوپورہ اور گجرات کے مابین علاقے میں ہو گیا اور بہت سے مزید دور جا کر صوبہ سرحد میں آباد ہو گئے تھے، لیکن انہوں نے اپنی راجپوتانہ مغروری اصل ہمیشہ برقرار رکھی۔ ایک تحقیق نے تو ان کا رشتہ بھارتی گجرات کے خوجہ قبیلے سے جا ملایا ہے جو تجارت میں اوّل نمبر پر تھے۔ سولنکیوں کی ذیلی ذات نے، جو بہت بعد میں تاریخ میں وارد ہوئیں مہاتما گاندھی اور قائداعظم جیسی عظیم شخصیات کو جنم دیا۔

لیکن پھر راجپوتانہ سے سولنکیوں کی نقل مکانی کب ہوئی؟ اساطیری روایت کے مطابق مشہور سولر شہزادے، کینک سین نے تقریباً پندرہ سو برس قبل لاہور نقل مکانی کی تھی۔ کوئی واضح تاریخ ممکن نہیں لیکن وہ بھٹ قبیلہ سے بہت بعد میں آئے تھے، جو اس وقت حکمران تھے اور جنہوں نے ان کا سواگت کیا اور اُنہیں شہر میں قیام اور اس سے ورا اور دو عظیم دریاؤں کے مابین زمینوں پر آباد ہونے کی اجازت دے دی۔

لاہور کا نمایاں راجپوت قبیلہ ہمیشہ سے بھٹ یا بھاٹی تھا یا بھٹی، جیسا آج کل ہم اس کا تلفظ کرتے ہیں۔ لاہور کا مشہور بھاٹی دروازہ اسی قبیلے کے نام پر رکھا گیا تھا۔ قدیم بھٹوں میں سے لاہور کا بادشاہ بھیم سین کے بارے میں تاریخ میں لکھا ہے کہ وہ ایک جنگ میں دس ہزار گھڑ سوار سپاہ کے ساتھ میدانِ جنگ میں اُترا تھا۔ اس تعداد سے بارہ سو برس قبل اس کی معاشی قوت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بہت بعد میں لاہور کا راجہ جے پال ہُوا ہے۔ اس کی سلطنت، جیسا کہ مذکور ہے، ''سرہند سے لغمان اور کشمیر سے ملتان تک'' پھیلی ہوئی تھی۔ تقریباً آٹھ سو برس بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور کی اصل سلطنت کو عین اسی طرح از سرِ نو تعمیر کیا، جس طرح جے پال کے دور میں ہوا کرتی تھی، فقط وسعت پذیر انگریزوں کے ہاتھوں 1849ء میں گنوانے کے لیے۔

جب محمود غزنوی نے بالآخر لاہور فتح کر لیا تو راجہ جے پال نے موری دروازے کے باہر اپنا ''جوہر''

کرلیا یعنی خودسوزی کرلی۔اس مغرور بھٹ چوہان راجپوت کے بعد اس کا بیٹا انند پال تخت نشین ہوا، جس نے 1022ء میں جب محمود غزنوی نے شہر کو آگ لگا دی تو راہِ فرار اختیار کی۔ جے پال کی اجمیر پسپائی نے لاہور میں اُس ہندو راجپوت سلطنت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔لاہور کو ملک ایاز کے حوالے کر دیا گیا اور اس کے بعد تاریخ کا ایک یکسر مختلف دور شروع ہو گیا۔

لیکن یہ بھٹ آئے کہاں سے تھے؟ تاریخ کے مطابق یہ تقریباً ایک ہزار سات سو پچاس برس قبل جیسلیمر سے لاہور وارد ہوئے تھے اور راستے میں بہت سی سلطنتیں بناتے آئے تھے۔راجپوتانہ کی اس جنگجو نسل کے دیگر قبائل جیسے بسّے، وِرک وغیرہ میں سے بہت سے راجپوت مسلمان ہو گئے تھے۔آج بھی لاہور اور شیخوپورہ کے نواحی علاقوں میں رہتے ہیں۔ دیگر، غیر مسلم، 1947ء میں ہندوستان چلے گئے تھے۔آج لاہور میں، پورے برصغیر میں سے افغانستان اور اس سے بھی ورا علاقوں کے مختلف انواع کے لوگ بستے ہیں۔اس خوبصورت اختلاط سے جو لاہوری پیدا ہوا ہے اس نے شہر کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ان کے دم سے ہی شہر قائم ہے، نہ کہ شہر کی وجہ سے وہ۔

●○●○●○●

قلم اور تلوار

دو مجسمے جو اَب نظر نہیں آتے ہمیشہ سے لاہور کے عوام کی خصوصی کشش کا باعث رہے ہیں۔ پہلا لارنس کا اور دوسرا مجسمہ ملکہ وِکٹوریہ کا تھا۔ دونوں اب عجائب گھر لاہور کے تنگ و تاریک نہاں خانوں میں پڑے ہیں، کیونکہ ہم ان کی سرِعام نمائش کرنے سے ڈرتے ہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ہم تاریخ سے خائف ہوں۔

ان میں سے پہلے یعنی لارنس کے مجسّمے نے اپنے زمانے میں دُھوم مچادی تھی۔ 1911ء سے ہی ایک تحریک چل پڑی تھی کہ اسے مال روڈ پر لاہور ہائی کورٹ کے بالمقابل چبوترے سے ہٹایا جائے۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کے زیریں پتھر پر لکھے ہوئے الفاظ سے برصغیر کے عوام کی ہتک ہوتی تھی۔ الفاظ یہ تھے: ''کیا آپ تلوار کے ذریعے حکومت چاہتے ہیں یا قلم کے ذریعے؟'' انڈین نیشنل کانگرس نے اس مجسّمے کو ہٹانے کے لیے مہم چلا دی۔ لیکن انگریز اس بات پر اڑے رہے کہ پوچھا گیا سوال دِلآزاری کا باعث نہیں تھا۔ جونہی پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو اوّلیں کام یہ ہوا کہ مجسّمے کو گرا دیا گیا۔ غلطی کا ازالہ کر دیا گیا یا کم از کم اعلان یہی کیا گیا۔ لیکن یہ ملاحظہ کرنا دلچسپی کا باعث ہوگا کہ یہ سب کہاں سے شروع ہوا۔

ایچ آر گولڈنگ کے مطابق: ''1848ء میں کانگڑہ پہاڑ کے سرداروں کی بغاوت کچلنے کے بعد، ڈپٹی کمشنر رابرٹ کَسٹ نے، جان لارنس کے، جو تازہ قبضہ کردہ ستلج اور ماورا عملداری کا حاکم مجاز تھا، احکام پر عملدرآمد کرتے ہوئے منادی کرا دی کہ جس میں یہ جزو شامل تھا۔ ''میں نے اس ضلع پر تین برس سے صرف قلم کے ذریعے حکومت کی ہے اور اگر ضرورت پڑی تو میں اس پر تلوار کے ذریعے حکمرانی کروں گا۔'' اس اعلان کو کَسٹ نے دور دور تک مشتہر کرایا اور ضلع کے منحرف علاقوں میں دیہاتوں کے سربراہوں، لمبرداروں کو اطلاع کرائی کہ بغاوت سے نبٹنے کے لیے اس کے دورے کے دوران اُسے آ کر ملیں۔

راستے میں آنے والے ہر پڑاؤ پر کئی دیہاتوں کے اجلاس منعقد ہوئے۔ کَسٹ نے میز پر ایک قلم اور ایک تلوار رکھی اور لمبرداروں سے کہا کہ وہ جس طرح کی حکمرانی چاہتے ہیں ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کر

لیں۔ایک بھی اجلاس میں، اور ایسے بائیس سے زائد اجلاس ہوئے، کسی نے تلوار کا انتخاب نہ کیا۔اس حکمتِ عملی کی کامیابی نے انگریزوں کو بے شمار نتائج سے ہمکنار کیا اور انہوں نے بڑی بے دردی سے کانگڑہ کی بغاوت کو چلنے کا بندوبست کر لیا۔اُن دنوں تمام باغیوں کو توپ کے دہانے پر رکھ کر اُڑا دیا جاتا تھا۔بہت جلد پنجاب کے رہنے والوں کو پتہ چل گیا کہ بغاوت یکطرفہ گلی کا نام تھا۔اس لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ تمام لمبرداروں نے قلم کو منتخب کیا تھا۔مزے کی بات یہ ہے کہ جان لارنس نے کبھی وہ الفاظ ادا ہی نہیں کیے تھے جو بار بار اس کے نام سے منسوب کر دیئے جاتے رہے۔

لندن کے مشہور مجسمہ ساز سر ایڈگر بوہم نے مجسمہ بنایا اور لاہور میونسپلٹی کو پیش کر دیا۔ 30/مارچ 1887ء کو لیفٹیننٹ گورنر سر چارلز ایچی سن نے اس کی نقاب کشائی کی۔انگریزوں کے نزدیک یہ مجسمہ ان کی حکومت کے روشن پہلو کی ترجمانی کرتا تھا۔1911ء میں شہریوں کی ایک کمیٹی کے محضر پر میونسپلٹی نے مجسّمے کو ہٹانے کی تجویز پر غور کیا کیونکہ وہ مقامی لوگوں کے احساسات کی دل آزادی کا باعث بن رہا تھا۔اس وقت کے ڈپٹی کمشنر آر ہمفریز نے لیفٹیننٹ گورنر سر لوئیس ڈین کی تجویز سے اتفاق کیا کہ مجسّمے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔جنگِ عظیم اوّل کے خاتمے کے فوراً بعد 1920ء میں اس مسئلے کو دوبارہ اٹھایا گیا۔ایک تجویز یہ بھی دی گئی کہ مجسّمے کو چھوڑ کر صرف الفاظ کو مٹا دیا جائے اور جونہی اس مسئلے پر احتجاج بڑھا اور لوگوں نے مجسّمے کو مکمل طور پر ہٹانے کے لیے عوامی مظاہرے شروع کر دیئے تو یہی تجویز جلد ہی مشہور ہو گئی۔

انگریز ایسے معاملات سے نبٹنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ابتدائی طور پر انہوں نے ایک تجویز دی کہ مجسّمے کو کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے۔اس پر مظاہرے کرنے والے وقتی طور پر رُک گئے، لیکن یہ بات اخباروں میں افشا ہو گئی کہ مجسمہ ایک ٹرسٹ نے تعمیر کرایا تھا اور حکومت اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانے سے قاصر تھی۔مظاہرے دوبارہ شروع ہو گئے۔چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ اس مسئلے کو لاہور میونسپلٹی کی ایک ذیلی کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے جس میں لاہور کی ممتاز شخصیات کو نمائندگی دی گئی تھی۔ساری کارروائی ٹھنڈی پڑ گئی کیونکہ مذاکرات طول پکڑتے گئے۔تقریباً ایک برس کے غور و خوض کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ مجسمہ مکمل طور پر ایک تحفہ ہے، لہٰذا اس کا ٹرسٹ میں ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اس لیے کمیشن نے فیصلہ دیا کہ میونسپلٹی مجسّمے کو ہٹانے میں حق بجانب ہے۔

10/جولائی 1922ء کو لاہور میونسپلٹی نے ذیلی کمیٹی کے خدشات کے بارے میں تجویز دی کہ اس سے پہلے کہ اس تحفہ مجسّمے کو منظر سے ہٹایا جائے، لارنس کے نام کی خاطر یہ مناسب ہو گا کہ ایک نیا مجسمہ بنایا جائے جو اس پرانے مجسّمے کی جگہ نصب کر دیا جائے۔یہ بھی تجویز دی گئی کہ تین چوتھائی خرچ حکومت برداشت کرے گی اور ایک تہائی لاہور میونسپلٹی۔میونسپلٹی کی مالیاتی کمیٹی نے 23/فروری 1923ء کو اس تجویز کو رد کر دیا۔چنانچہ ایک تعطل پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے مندرجہ ذیل حکم صادر کیا گیا: ”گورنمنٹ کی طرف سے لارڈ لارنس کے نئے مجسّمے

کے اخراجات کا حصہ ادا کرنے سے انکاری ہونے کے پیشِ نظر اور میونسپلٹی کی مالیاتی قلت کے پیشِ نظر یہ طے ہوا ہے کہ قدیم مجسّمے کی جگہ متبادل نئے مجسّمے کی تجویز رَد کی جائے اور حکومت سے درخواست کی جائے کہ مجسّمے کو اپنی تحویل میں لے لے۔'' یہ نوکر شاہی کی استادانہ کارروائی تھی۔ احتجاج ختم ہو گیا، لیکن کبھی کبھار پھر شروع ہو جاتا۔

لارڈ لارنس قلم اور تلوار اپنے ہاتھوں میں لیے 14/اگست 1947ء تک استادہ رہا، جس روز ہم نے بلاشبہ اس کی تلوار کو گرا دیا لیکن پھر ہم نے اپنی زندگیوں میں سے قلم کو بھی گرا دیا۔ ظفر الاحسن صاحب نے مشہور و معروف لارنس کو عجائب گھر لاہور کے گوداموں کے سپرد کر دیا تھا اور مجسّمے کو بچا لیا تھا۔

●○●○●○●

شہزادہ جو فقیر ہو گیا

ایک زمانے میں لاہور پر احمد شاہ ابدالی کے پوتے شاہ زماں کی حکومت تھی۔ افغانستان کے پہاڑوں سے آنے والوں کا واحد مقصد ہمارے ملک کے عوام کی لوٹ کھسوٹ تھا۔ ان کے مرنے اور معدوم ہونے کے برسوں بعد اسلامی مطمعٔ نظر کے بہانے تراشے گئے۔ کسی بھی طرح سے ''دولت کے انبار لگانے'' کو اپنی صوابدیدی سیاسی معنی پہنانے کا آسان عمل۔

ایک زمانے میں اہلِ لاہور خصوصی طور پر اور اہلِ پنجاب عمومی طور پر، دولت کے انبار لگانے کی سعیٔ لاحاصل کو بیان کرنے کے لیے ایک جملہ کہا کرتے تھے۔ ''جو تم کھا پی سکتے ہو وہ تمہارا ہے، باقی ماندہ احمد شاہ ابدالی کی ملکیت ہے۔'' یہ تھا وہ خوف کا عالم جو ان افغانی لٹیروں کی مسلسل آمد میں باقاعدگی کی وجہ سے پیدا ہو چکا تھا۔ سکھ اقتدار کے عروج کے باعث تمام بڑی افغان مہمات کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ خاص طور پر جب سفاک جرنیل ہری سنگھ نلوا پنجاب کی حکومت قائم کرنے کے لیے کابل تک جا پہنچا تھا۔ تاریخی دَعاوِی کا دائرہ مکمل ہو چکا تھا۔ نلوا کی غضبناکی اس قدر شدید تھی کہ آج بھی افغانی مائیں اپنے بچوں کو ڈرانے کے لیے کہتی ہیں کہ ''رونا دھونا بند کرو ورنہ نلوا آ جائے گا۔''

لاہور کے حکمرانوں کی داستانوں میں قسمت کے پھیر کی دلچسپ ترین کہانی شاہ زمان کی ہے۔ اپنے باپ تیمور اور دادا ابدالی کی طرح، کابل کا حکمران ہر سال پنجاب پر چڑھ دوڑتا اور لاہور کا رخ کرتا۔ دریائے سندھ تک کوئی ان کی راہ میں زیادہ حائل نہ ہوتا، لیکن ایک بار جب وہ شہزور دریا عبور کر لیتا تو ابتدائی طور پر مقامی حکمران انہیں روکنے کی کوشش کرتے۔ لیکن جب وہ دیکھتے کہ وہ ان سے بہت زیادہ طاقتور ہے تو چپکے سے پرے ہو جاتے اور انتظار کرتے۔ تسلیم شدہ پنجابی گوریلا حکمتِ عملی وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی گئی۔ یہ ان حملہ آوروں سے دھوکا کرتے اور انہیں دہلی کی طرف جانے پر اُکساتے اور واپسی پر راستے میں حملہ آوروں پر در پردہ وار کر دیتے، حتیٰ کہ سارا مالِ غنیمت چھین لیتے۔ سکھ مثل فوجی اس کام میں ماہر تھے۔ اسی حکمتِ عملی نے آخر کار

افغانیوں کو ہمیشہ کے لیے کچل کر رکھ دیا اور پورے پنجاب میں پنجابی حکومت قائم ہوگئی۔

افغان حکمرانوں کا بڑا مسئلہ پنجابیوں سے جنگ کرنا نہیں بلکہ اپنے ملک میں سازشوں سے نبٹنا تھا۔ یہ ایک بھائی کی دوسرے بھائی سے مخالفت تھی۔ جب بھی ایک بھائی ہندوستان پر حملے کے لیے روانہ ہوتا تو دوسرا بھائی اس کے تخت پر قابض ہونے کی کوشش کرتا۔ شاہ زمان کے دو طالع آزما بھائی تھے، جو اس کے لیے بے شمار مشکلیں کھڑی کر دیتے تھے۔ 1796ء میں جب وہ تیسری بار ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو اس کے بھائی محمود نے شب خون مار دیا۔ ہر سال اسی طرح ہوتا رہا۔ شاہ زمان نے لاہور پر آہنی پنجے والی سخت گیر حکومت کی، لیکن آخر کار اس کے بھائیوں نے اسے شرافت چھوڑنے پر مجبور کر دیا تو اس نے اس کی آنکھیں نکلوا دیں۔

جب تک رنجیت سنگھ پنجاب کے مہاراجہ کے طور پر اپنی حیثیت مستحکم کرتا شاہ زمان ایک بار پھر اپنے بھائیوں کے ہاتھوں راہِ فرار اختیار کر چکا تھا۔ شاہ شجاع اٹک پہنچا، جہاں اس کے مشفق میزبان نے اسے سازش کے شُبے میں قید کر کے کشمیر بھیج دیا۔ لیکن رنجیت سنگھ نے فیصلہ کیا کہ شاہ زمان اور شجاع کے اہلِ خانہ کو راولپنڈی میں پناہ دے دی جائے، لیکن انہوں نے وہاں بھی سازش شروع کر دی۔ انہوں نے جلاوطن حکومت قائم کر لی۔ اس پر شاطر رنجیت سنگھ مجبور ہو گیا کہ انہیں لاہور لے آئے اور ان پر کڑی نظر رکھے۔

11 نومبر 1811ء کو لاہور کا سابق حکمران شاہ زمان اندرون شہر لاہور میں داخل ہوا۔ وہ ایک بادشاہ کی حیثیت سے یہاں سے گیا تھا، لیکن اب ایک حقیقی فقیر کی طرح واپس آیا تھا۔ اسے بازارِ حکیماں کی ایک شاندار حویلی میں رہائش دی گئی اور اس کی کڑی نگہداشت کی گئی۔ لیکن پھر اس خاندان کی سازش کی اشتہا ان پر غالب آ گئی۔ اس وقت رنجیت سنگھ اپنے بیٹے اور وارث کھڑک سنگھ کی شادی کے شاندار استقبالیے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس سے قبل شہر میں اتنی شاندار اور وسیع پیمانے پر کوئی شادی نہیں ہوئی تھی۔ دولہا کو دو لاکھ چھتیس ہزار روپے نقد سلامی میں ملے، جو موجودہ دور کے سونے کی مالیت کے حساب سے بیس کروڑ سے زائد کی رقم بنتی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پانچ ہزار روپے نقد کا گراں قدر تحفہ پیش کیا۔

لیکن رنجیت سنگھ کا شاہ زمان اور اس کے خاندان کو مہمان ٹھہرانے کا مقصد افغان سازش سے کہیں بڑھ کر تھا۔ اس کی آنکھ، ایک ہی آنکھ تھی، گولکنڈہ کی کان سے برآمد شدہ ''کوہِ نور'' ہیرے پر تھی اور وہ ہیرا اس کے مہمانوں کے تصرّف میں تھا یا اشتباہ تھا کہ ان کے پاس ہے۔ ابتدائی طور پر، جب یہ ہیرا کان سے برآمد ہوا اور اس کو چمکایا گیا تو، یہ مغلوں کی ملکیت تھا۔ پھر ایرانی حملہ آور نادر شاہ نے 1739ء میں کوہِ نور ہیرا اور تختِ طاؤس شہنشاہ محمد شاہ سے چھین لیے۔ جب 1747ء میں نادر شاہ کو قتل کر دیا گیا تو یہ احمد شاہ ابدالی کے قبضے میں آ گیا۔ پھر تیمور کے ہاتھ لگا اور پھر شاہ زمان کی ملکیت میں آ گیا۔ اس کے بعد شاہ شجاع اور اس کی بیوی وفا بیگم کی ملکیت رہا۔ جب وہ کابل سے فرار ہوا تو ہیرے کو لاہور لے آیا، چنانچہ اسی کنبے سے رنجیت سنگھ نے ہیرا نکلوا لیا۔

وفا بیگم نے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس کے خاوند کی آؤ بھگت کی گئی اور اس کے بھائی سے تخت واپس حاصل کرنے میں مدد فراہم کی گئی تو وہ ہیرا حوالے کر دے گی۔ چنانچہ شاہ شجاع کو شیر گڑھ سے رہا کر دیا گیا اور لاہور میں بڑی دھوم دھام سے اس کا سواگت کیا گیا۔ رنجیت سنگھ کا وفادار محکم چند اسے لے کر آیا تھا۔ ان کی آمد کے دوسرے دن ہی رنجیت سنگھ نے کہلا بھیجا کہ اب افغانیوں کو اپنے وعدے کا پاس کرتے ہوئے مشہور ہیرا اس کے حوالے کر دینا چاہیے۔ افغانیوں نے قرآن پر حلف دیا کہ ہیرا ان کے پاس نہیں ہے۔ رنجیت سنگھ نے ان سے وعدہ نباہنے کے لیے تین دن تک کوشش کی، لیکن افغانی نہیں مانے۔ پھر شجاع شاہ نے ہیرے کی قیمت پچاس ہزار روپے نقد لینے اور پنجاب کے جنوب میں واقع علاقے کی بازیافت میں مدد کے وعدے پر کہا کہ وہ اس بارے میں سوچے گا۔ اس موقع پر پنجابی ازلی دوستی کی خاطر اپنی پگڑیاں بدل لیتے تھے۔ یکم جون 1813ء کو شاہ شجاع نے ہیرا مہاراجہ کے حوالے کر دیا۔ اس تمام عرصے میں یہ انہی کے پاس تھا۔

اس بارے میں بہت سے بیانات ہیں کہ ہیرا کیسے نکلوایا گیا۔ یہ بیان محکم چند کی، جو اس موقع پر موجود تھا جب قیمت کی ادائیگی ہوئی اور ہیرا وصول کیا گیا، ڈائری سے ہے۔ لاہور ہی میں انگریزوں نے یہ ہیرا قبضے میں لیا جو اب ملکہ برطانیہ کے تصرف میں ہے۔ چنانچہ جب لاہور کا حکمران فی الواقعی ایک فقیر کی حیثیت سے گیا اور ہیرے کو قیمتاً فروخت کر دیا۔ اسی بنیاد پر لاہور کے دارالحکومت والی پنجاب گورنمنٹ اس ہیرے کی حقیقی اور جائز مالک ٹھہرتی ہے۔ کیا ہم کبھی اس ہیرے کو بازیافت کرا پائیں گے؟ سخت تردّد والی بات ہے۔ یہی روایت در آتی ہے کہ ایک دل کش لاہوری مثل ہے کہ ہیرا ایک دن لاہور واپس آ جائے گا۔

●○●○●○●

قزلباش قازق

اگر آپ لاہور ریلوے اسٹیشن سے شملہ پہاڑی کی طرف جانے والی ایمپریس روڈ پر سفر کریں تو سڑک کے دونوں اطراف جو زمین ہے، ساری کی ساری قزلباش خاندان کے علی رضا خان کی ملکیت تھی یا اُسے انگریزوں سے تحفے میں ملی تھی۔ جس نے انگریزوں کی افغان جنگوں سے خلاصی کرائی تھی۔ یہ تحفہ اب ایک وقف یا ٹرسٹ کا حصہ ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں جب انگریز راج اپنے عروج پر تھا، تو مسلمان دولتمند خاندانوں کی تعداد مٹھی برابر تھی۔ سب سے اہم بازارِ حکیماں کا فقیر خاندان تھا، اس کے بعد نواب شیخ امام الدین اور شیخ غلام محی الدین کا کشمیری خاندان تھا۔ پھر ایک اور خاندان تھا جسے ملتان کے نواب کہا جاتا تھا، جو اصلاً قندہار سے تعلق رکھتے تھے۔ دولت کے لحاظ سے قزلباش خاندان نے جو بہتات اور اثر و رسوخ حاصل کیا وہ بے حساب تھا۔ آج بھی ان کی وقف جائیداد اِن کے ڈانواں ڈول رسوخ کی نگرانِ حال ہے۔

قزلباش سردار رضا علی خان جب پہلی بار افغانستان سے لاہور آیا تو اسے ''کابلی قزلباش'' کہا جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ وصف جاتا رہا کیونکہ انگریزوں نے اس کی خدمات پر اسے ''نواب'' کا خطاب عطا کر دیا تھا۔ اسے مقامی لوگوں سے منتخب ترین زمینیں چھین کر بخش دی گئیں۔ ایک تحریر میں نواب رضا علی خان کو ''غالباً تاجِ برطانیہ کی وفادار ترین رعیت'' کہا گیا ہے۔ جب انگریز کابل میں گرفتار ہو گئے تھے تو رضا علی خان نے رشوت کے ذریعے ان قیدیوں کی مدد کی اور انہیں ہزارہ لے جانے سے باز رکھا۔ انگریز افغان جنگِ اوّل 1838-1842ء میں قزلباشوں نے کُھل کر انگریزوں کا ساتھ دیا۔ امیر عبدالرحمان نے انہیں 1891-1892ء میں ہزارہ قبائل کے خلاف مہمات میں دشمن کا فریق قرار دیا تھا اور انہیں ریاست کا دشمن قرار دے کر ان کی جائیداد ضبط کر لی تھی۔

جب انگریزوں نے دوسرا حملہ کیا تو رضا علی خان اور اس کے قزلباش جنگجوؤں نے محمد اکبر خان کے

خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ایک لحاظ سے اس نے اپنی ہی نسل سے غداری کی اور ان کی شکست کے بعد برطانوی ہندوستان میں آباد ہو گیا۔ کابل میں اس کی جائیداد ضبط کر لی گئی اور اس کے گھروں کو مسمار کر دیا گیا۔ پھر کابلی قزلباش قبیلے اور ان کے سردار کی کابل واپسی ممکن نہ رہی۔

سکھوں کے خلاف مہم میں قزلباشوں نے، جو بہترین گھڑ سوار جنگجو تھے، انگریزوں کی لاہور دربار کو کچلنے میں بے حد مدد کی۔ وہ انگریزوں کے ہمراہ لاہور شہر میں داخل ہوئے اور موچی دروازے کے معتد بہ علاقوں پر قبضہ کر لیا جہاں انہوں نے بڑے خوبصورت گھر تعمیر کیے اور برطانوی لاہور کے امیر ترین لوگوں کی حیثیت سے اپنے آپ کو مستحکم کر لیا۔ اس سے پیشتر 1846ء میں کانگڑہ اور کشمیر کی مہمات میں قزلباش گھڑ سواروں نے لارڈ لارنس کی مدد کی تھی، لیکن بالآخر وہ لاہور ہی میں آباد ہو گئے۔

1857ء میں محمد رضا خان اور محمد تقی خان ایک ہزار گھڑ سواروں کے ہمراہ دہلی روانہ ہو گئے۔ انہوں نے عہد کیا کہ وہ انگریزوں سے ایک پائی بھی معاوضہ نہیں لیں گے۔ گویا انہوں نے اپنے آپ کو تاجِ برطانیہ کے وفادار ہونے کا اعلان کر دیا۔ قزلباش گھڑ سواروں نے اس فیصلہ کن جنگ میں بہت بھیانک کردار ادا کیا، کیونکہ جب مسلمانوں نے جنگ سے فرار ہونے کی کوشش کی تو انہوں نے سینکڑوں مسلمانوں کو تہِ تیغ کر ڈالا کیپسین کی اصلاً قزاق قوم سے سب خوفزدہ تھے، کیونکہ انہوں نے اس امر کو یقینی بنایا تھا کہ لاہور اور دہلی کی درمیانی سڑک کھلی رہے۔ اس سے جب مغل سلطنت ڈھے گئی تو انہیں وسیع پیمانے پر برسرِ پیکار ہونا پڑا۔

ان کی خدمات کے عوض 1857ء میں انگریزوں نے فوری طور پر لاہور کے جنوب مشرق میں ایک سو سنتالیس دیہات کی املاک بطور انعام بخش دیں۔ رائے وِنڈ اور لاہور کے درمیانی علاقے کی زمینیں ان کے نام لگا دیں۔ علی رضا خان کو دو ہزار روپے سالانہ کی پنشن عطا کی گئی اور نواب کا خطاب دیا گیا۔ اس کے بعد اُسے کابلی قزلباش رضا کے بجائے نواب رضا علی قزلباش کہا جانے لگا۔ اس کے تینوں بیٹوں نوازش علی خان، ناصر علی خان اور نثار علی خان نے بھی انگریزوں کے لیے بے مثال خدمات سرانجام دیں۔ سردار چتر سنگھ اٹاری کے خلاف مہم میں نوازش نے لارنس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اگر تلوار کے دھنی غضبناک قزلباش نہ ہوتے تو جنگجو خالصہ جنگ جیت جاتے۔ اس کے بعد سے لارنس ہمیشہ ان کیپسین کے گھڑ سواروں کی قدر کرتا رہا۔

باپ کی وفات کے بعد نثار علی خان، قزلباش قبیلے کی، انگریزوں کی عطا کردہ تمام زمینوں اور جائیداد کا خیال رکھتا رہا۔ ایک اندازے کے مطابق کابلی بشمول کیپسین قازق نے اتنی دولت جمع کر لی کہ پورے پنجاب میں کسی اور خاندان کے پاس نہ تھی۔ نثار نے اپنے لیے اندرون موچی دروازہ ایک شاندار حویلی تعمیر کی۔

آج قزلباش قبیلہ حد درجہ انحطاط پذیر خاندانوں کا مجموعہ رہ گیا ہے۔ بڑا جاگیردار، نواب مظفر علی خان پنجاب کا سابق وزیرِ اعلیٰ اب بھی ایمپریس روڈ پر نواب محل کا مالک ہے۔ ان کے پاس ایمپریس روڈ پر زمین

کا ایک خاصا بڑا خطہ ہے، لیکن یہ سب وقف جائیداد ہے۔ لاہور رائے وِنڈ روڈ پر بھی ان کے پاس کئی مربعے زمین ہے، لیکن یقیناً ان کی پہلے والی شان و شوکت نہیں رہی۔ آج کوئی بھی سرکردہ قزلباش نظر نہیں آتا سوائے لندن سکول آف اکنامکس کے تعلیم یافتہ ڈاکٹر مظفر قزلباش کے، جو ایک عالم شخص ہے اور جسے درست طور پر اپنے غضبناک آباؤ اجداد کی نسبت کتابیں اور خاموش زندگی عزیز ہے۔ چند ایک نے مغرب کے ٹھنڈے موسموں کی وجہ سے وہیں پناہ لے رکھی ہے۔

●○●○◐○●

بدذات چندوشاہ

اگر آپ کو مال روڈ سے لاہور چھاؤنی جانے کا اتفاق ہوتو آپ کور کمانڈر ہاؤس یا جناح ہاؤس کے بالمقابل ایک چوراہے پر پہنچ جاتے ہیں۔ بائیں ہاتھ سکھ پائینیرز کی رجمنٹ کی یادگار ہے جو 1947ء میں برخاست کردی گئی تھی۔ میں نے وہاں کھڑے ہوکر ہڈسنز ہورس کے بارے میں سوچا۔ جنگِ عظیم اوّل اور دوم کے جنگی میدانوں کے بارے میں، گروارجن سنگھ کے متعلق اور ایک اور شخص کے بارے میں، جسے میرے والد بدذات چندوشاہ کہا کرتے تھے۔

لاہور میں اور اس کے گردونواح میں کوئی فوجی عمارت ایسی نہیں ہے جو اس کا مقابلہ کرتی ہو۔ اگر آپ صرف اس لمبی فہرست ہی کا مطالعہ کریں جو جنگی میدانوں پر مشتمل ہے جہاں سکھ پائینیرز، جو 1857ء میں تشکیل دی گئی رجمنٹ تھی، لڑائیاں لڑتے رہے اور کارہائے نمایاں سرانجام دیتے رہے، تو آپ کو افسوس ہوگا کہ ایک صدی میں اس قدر جوانوں کی ہلاکت ہوئی تھی۔ خصوصی طور پر لاہور کے رہائشی پائینیر رسالدار بشارت علی کی کہانی بے حد پر متاثر کن ہے۔ اصلاً روہتک سے تعلق رکھنے والے بشارت علی نے میجر ڈبلیو ایس آر ہڈسن کی ماتحتی میں خدمات سرانجام دیں۔ جس نے لاہور میں مشہور رجمنٹ ''ہڈسنز ہورس'' کی بنیاد رکھی اور جس نے 1857ء میں شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کیا تھا۔ ہڈسن خود رسالدار بشارت علی کے گاؤں گیا اور اُسے اور اس کے خاندان کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس پر دشمنی کا الزام لگایا گیا تھا لیکن 1878ء کے پنجاب ڈسٹرکٹ گزیٹیرز میں فین شا کی 1878-79ء کی روہتک تصفیہ رپورٹ کا حوالہ دیا گیا ہے، جس کے مطابق ہڈسن رسالدار بشارت کی ایک بہت بڑی رقم کا مقروض تھا اور ادھار ادا کرنے کے بجائے ہڈسن نے اس کو ہلاک کر دیا۔ الزام ثابت ہو گیا تھا، لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس مقدمے کو سرد خانے کی نذر کر دیا۔

مجھے یاد ہے کہ تقریباً تیس برس قبل جب میں نوجوان طالب علم تھا تو بلجیم کے جنگی میدانوں سے گزرتے ہوئے آئپیئرز کے مقام پر ایک بہت بڑی یادگاری لوح پر پنجابی فوجیوں کے نام پڑھ رہا تھا، جوان کے

اعزاز میں نصب کی گئی تھی۔ اس فہرست میں سینکڑوں فوجیوں کے نام مع جائے پیدائش لکھے ہوئے ہیں اور سینکڑوں جائے پیدائش کے سامنے لاہور کا نام درج ہے۔ ان کا خون اب بھی آئیئر ز اور فلینڈر کے سرسبز خوبصورت میدانوں اور بہت سی دیگر جگہوں پر بہہ رہا ہے، جہاں پنجابی جنگ میں کام آئے تھے۔ مجھے یاد ہے آئیئر ز کے عجائب گھر میں موچی دروازے کی ماں کا اپنے بیٹے کے نام اردو میں لکھا ہوا ایک خط پڑھ رہا تھا، جس کے الفاظ تھے۔ ''بیٹے اللہ تمہارے ساتھ ہے۔'' مجھے یاد ہے کہ جب میں نے وہ نام پڑھے تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور میں کتنا جذباتی ہو رہا تھا کہ میرے شہر کے شہیدوں نے دنیا کے جنگی میدانوں کو نشان زدہ کر رکھا ہے۔ مجھے اس بات کا دکھ بھی تھا کہ آخر میرے شہر یا کسی اور شہر کے خوبصورت انسانوں کو یہاں کیوں آنا پڑا تھا۔

لاہور چھاؤنی کی خوبصورت یادگاری لوح مجھے ان تمام لوگوں کی یاد دلاتا ہے جو ہم سے بچھڑ گئے ہیں۔ اسی یادگاری لوح نے مجھے چندو شاہ کی بھی یاد دِلا دی جو دہلی کا ایک متمول ہندو ساہوکار تھا اور اصلاً لاہور کی اکبری منڈی کے علاقے کا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اکبرِ اعظم کے قریب ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے والد مرحوم نے ایک بار جب ہم اندرون شہر لاہور میں پیدل چلتے جا رہے تھے تو ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ''یہ چندو حرامزادے کا تھا۔'' مجھے اپنے والد کے منہ سے نکلے یہ الفاظ نہایت سخت لگے۔ لاہور کی چونا منڈی کے بارے میں ایک کہانی سنی جو سنائے جانے کے قابل ہے۔ چندو کی ایک خوبصورت بیٹی تھی جس کا بہر طور کوئی مناسب رشتہ نہیں مل رہا تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ دولہا لاہور یا امرتسر کے علاقے کا پنجابی ہو۔ اس کے گماشتوں نے دور و نزدیک تلاش کے بعد بالآخر بتایا کہ اگر کوئی رشتہ ہے تو وہ یقیناً گرو ارجن دیو کا خوبصورت جوان بیٹا ہرگوبند ہے۔ اس بات کو سن کر ہندو ساہوکار نے کہا کہ ''قلعہ میں نہایت احتیاط سے پکائی ہوئی اینٹ بدرو (نالی) میں لگانے والی نہیں ہوتی۔'' یہ قول آج بھی سکھ دماغ میں جاہ گزین ہے۔

لیکن پھر وقت گزرنے کے ساتھ چندو شاہ ذہنی طور پر تیار ہو گیا لیکن پھر گرو ارجن نے انکار کر دیا، جس پر چندو نے چال چلی اور اکبرِ اعظم کو یہ پٹی پڑھائی کہ سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ بے حرمتی کلمات سے اَٹا پڑا ہے۔ جب لاہور میں گرو کو بلا بھیجا گیا تو اس نے دو ایلچی بھائی بُدھا اور بھائی گرداس بھیج دیئے۔ مقدس گرنتھ کو کھولا گیا اور انہوں نے پڑھ کر سنایا۔ ''رب نے دن اور روشنی سے دنیا کی تخلیق کی۔ آسمان، زمین، درخت اور پانی اُسی کے بنائے ہوئے ہیں۔ رب کو طمع میں بھول جانا ایسے ہی ہے جیسے مُردہ گوشت کھانا۔ جس طرح شیطانی روحیں ہلاک کرتی اور مُردوں کو ہڑپ کر جاتی ہیں۔ ہر شخص کو اپنے آپ پر قابو رکھنا چاہیے، ورنہ سزا دوزخ ہے۔ جب آپ اس جہان سے جائیں گے تو کوئی مدد کو نہیں آئے گا۔ صرف رب پاک کو علم ہے میری قسمت میں کیا ہے۔ (نانک) مجھ غلام کی درخواست صرف تمہارے (رب کے) حضور ہے! (تیلنگ)

شہنشاہ اکبر نے یہ سنا تو مطمئن ہو گیا کہ ان کلمات میں سے کوئی بے حرمتی کلماتِ کفر نہیں ہیں لیکن چندو

نے اصرار کیا کہ چونکہ یہ کلمات انہوں نے یادداشت سے سنائے ہیں، لہٰذا یہ کوئی ثبوت نہیں بلکہ کسی کو گرنتھ پڑھنے کو کہا جائے۔ اکبر مان گیا اور گرنتھ کو کھولا گیا اور یہ کلمات پڑھے گئے۔ ''تم رب کو نہیں دیکھ پاتے جو تمہارے دل میں رہتا ہے اور تم اپنی گردنوں کے اردگرد بُت پہنے پھرتے ہو۔ ایک رب کو نہ ماننے والا ''کافر'' پانی کو بلوتا پھرتا ہے اور بالآخر خود فریبی میں مارا جاتا ہے۔ وہ بت جسے تم خدا کہتے ہو، تمہارے ساتھ غرق ہو جائے گا۔ اے ناشکرے گناہگار! یہ پتھر کی کشتی تو تمہیں دریا کے پار نہیں لگائے گی۔ نانک کہتا ہے گرو سے ملو جو مجھے رب تک لے گیا، جو پانی، زمین، پاتال اور گنبدِ افلاک میں رہتا ہے۔'' (سوہی) شہنشاہ اکبر بے حد خوش ہوا اور اس دن کے بعد جب بھی وہ لاہور آیا تو وہ گرو کے پاس، تکریم کی خاطر، ٹھہر کر آگے جاتا۔

لیکن اکبر جلد ہی انتقال کر گیا اور چونکہ اس کا بیٹا خسرو ارجن سنگھ کا مہمان تھا، چندو نے جہانگیر سے کہہ کر گرو ارجن سنگھ کو جیل بھجوا دیا اور اس پر تشدد کرایا۔ چندو کی جوان بیٹی نے کبھی شادی نہ کی اور گرو ارجن کو بچانے کی کوشش کی، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ لاہور کے لوگ کئی برس تک چندو کو کوستے رہے۔ جب بھی کوئی بزرگ چندو کے گھر کے پاس سے گزرتا تو وہ چندو کو صلواتیں سناتا اسی لیے شاید میرے والد نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ اسی لیے اندرون شہر لاہور کی قدیم، تنگ اور پیچ دار گلیوں میں اب بھی کہا جاتا ہے۔ ''چندو چن نہیں ہندا بے شک شاہ ہووے'' (چندو کبھی نہیں چمکتا بے شک وہ شاہ ہی کیوں نہ ہو۔) ایک اور ترجمے میں کے ایس دُگل نے اسے یوں مبدل کیا ہے۔ ''چندو کا کبھی نواسہ نہیں ہوگا چاہے وہ شاہ ہی کیوں نہ ہو۔'' لیکن مجھے پورے خلوص کے ساتھ اب بھی اس کی جوان بیٹی سے پوری ہمدردی ہے۔ کیونکہ وہ رشوت دے کر قلعۂ لاہور میں داخل ہوئی اور اپنے مغرور باپ کی طرف سے معافی کی خواستگار ہوئی تھی۔

●○●○●○●

لاہور کا رابرٹس خاندان

دو عوامل نے پنجاب کو 1857ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لینے سے باز رکھا۔ ایک تو محکمہ ڈاک و تار تھا اور دوسری آرتھر آسٹن رابرٹس کی سربراہی میں لاہور والنٹیرز (رضا کار) تھی۔ رابرٹس بعد ازاں لاہور چیف کورٹ کا جج بن گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میاں میر چھاؤنی میں بے تحاشا سپاہیوں کو برخاست کر دیا گیا۔

ہندوستان کے دوسرے حصوں کے برعکس ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہیوں نے پنجاب میں ٹیلیگراف تاریں نہیں کاٹی تھیں لہٰذا ہر قسم کی برقی تار کے ذریعے بھیجی گئی اطلاعات یہاں ملتی رہیں کہ دہلی میں کیا واقعات ہو رہے تھے۔ دہلی کا سقوط صیغہ راز میں رکھا گیا۔ اس سلسلے میں انگریزوں کی خوش قسمتی نے ساتھ دیا اور دہلی سے ٹیلیگراف آپریٹر کا 12 رمئی 1857ء کو بھیجا گیا برقی پیغام پنجاب میں صرف دو اشخاص نے وصول کیا۔ ایک تو چیف کمشنر لارنس نے اور دوسرے مالیاتی کمشنر منٹگمری نے۔ لارنس دوٹوک فیصلہ کرنے والا شخص تھا۔ اس نے فوراً اپنے جاسوس میاں میر چھاؤنی روانہ کر دیئے۔ وہ علاقہ جسے ہم آج کل ''صدر'' کہتے ہیں۔ بازاروں میں خاصا ہیجان انگیز احساس تھا، لیکن کیا کھچڑی پک رہی تھی اس کا لارنس کو پتہ نہ چل سکا۔ اس گومگو کی کیفیت نے اسے اوّلیں وار کرنے پر اُکسایا۔

لاہور کے مقامی رجمنٹوں سے جو سولہویں نیٹوؤانفنٹری، چھبیسویں نیٹوؤانفنٹری، انچاسویں نیٹوؤانفنٹری اور آٹھویں لائیٹ کیولری جو چھاؤنی میں تعینات تھیں، ان سب سے 13 رمئی 1857ء کی صبح چار بجے ہتھیار رکھوا لیے گئے۔ یہ سب بالکل غیر متوقع طور پر کیا گیا تھا کیونکہ سپاہیوں کو ابھی میرٹھ بغاوت یا دہلی پر انگریزوں کے قبضے کی خبر ہی نہ تھی۔ انگریزوں کے اس فیصلہ کن اقدام سے لاہور کو محفوظ کر لیا گیا، لیکن یہ کافی نہ تھا۔ لاہور کی دیسی رجمنٹوں کو غیر مسلح کرنے کے بعد نصف اکیاسویں فُٹ رجمنٹ راتوں رات ٹھہرے بغیر امرتسر پہنچی اور وہاں تعینات اُنسٹھویں نیٹوؤانفنٹری کو بھی غیر مسلح کر دیا۔ 14 رمئی 1857ء کی صبح سویرے کی کارروائی سے کسی بڑی مخالفت یا بغاوت کا سامنا ہونے سے بچت ہو گئی۔

14 رمئی 1857ء کو چند غیر مسلح سپاہیوں نے لاہور میں داخل ہو کر آفیسرز کالونی صدر میں چند انگریزوں کو ہلاک کر دیا۔ انہیں سرعت سے گرفتار کر لیا گیا۔ اس سے پہلے کہ بغاوت پھوٹ پڑتی، انگریز انہیں مین بازار میں لے آئے اور حیرت زدہ آبادی کے سامنے توپوں سے اُڑا دیا۔ یہی عمل انہوں نے انارکلی چھاؤنی میں بھی دہرایا۔ پورے ''غدّر'' کے دوران لاہور کمپنی کی قوت کا مینار اور دہلی پر قبضہ کے لیے فوجوں کی روانگی کا صدر مقام بنا رہا۔ لاہور والنٹیرز، جس کی لاہور میں تشکیل ہوئی اور 1868ء میں سبکدوش کر دی گئی، کا کمانڈار لاہور کے کمشنر کی زیرِ ہدایت کام سرانجام دیتا تھا جو آئرلینڈ نژاد سرکاری ملازم تھا اور جو بعد ازاں لاہور ہائیکورٹ، جسے اس وقت لاہور چیف کورٹ کہا جاتا ہے، کا جج بن گیا تھا۔ آرتھر آسٹن رابرٹس کا کردار پُراسرار ہی رہا، کیونکہ اس شخص کا تمام تر ذکر کمپنی کے اور بعد ازاں برطانوی حکومت کے ''غدر کے ریکارڈ'' میں دبا دیا گیا۔ آرتھر اے رابرٹس اور اس کے بیٹوں نے کسی نہ کسی طور لاہور میں خدمات سرانجام دیں اور اس خاندان کی، کمپنی اور حکومتِ برطانیہ دونوں رہینِ منت تھیں۔

رابرٹس خاندان اصلاً سٹراڈبیلی کوئینز کاؤنٹی (لیوس) آئرلینڈ سے تعلق رکھتا تھا۔ 1790ء کے آلوؤں کے قحط کے دوران یہ خاندان ہندوستان چلا آیا کیونکہ رابرٹس کا باپ ایسٹ انڈیا کمپنی میں کلرک تھا۔ جب بہت سے آئرش باشندے براعظم امریکہ کی طرف بھاگ رہے تھے، انگریزوں کے ظلم کی وجہ سے، تو آرتھر رابرٹس خاندان نے اُلٹی طرف پیش قدمی کر ڈالی اور ہندوستان کے شہر بنارس، جسے اب وارنسی کہا جانے لگا ہے، میں آرتھر آسٹن رابرٹس 28 رجون 1818ء کو پیدا ہوا۔ کلکتہ میں ابتدائی تعلیم پانے کے بعد مزید تعلیم کے لیے وہ 1836ء میں انگلستان کے ہیلبری کالج میں چلا گیا اور پھر 1837ء میں بنگال سول سروس میں شامل ہو گیا۔ 1814ء میں اس نے ایلز بتھ ووڈ سے کلکتہ میں شادی کی اور پھر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کے ساتھ پنجاب میں آ گیا۔ جب 1849ء میں لاہور پر قبضہ ہو گیا تو وہ سول سروس کے سربراہ کے طور پر یہاں آ گیا۔ 1856ء میں وہ یہاں کا کمشنر تھا چنانچہ اگر کوئی شخص پنجاب کو بہت اچھی طرح سے جانتا تھا تو وہ رابرٹس تھا۔

آرتھر رابرٹس نے مخبروں کا ایک جال بچھا دیا۔ یہ افواہ عام تھی کہ بطور کمشنر اسے ہر اہم شخص کی ہر حرکت کا پتا ہوتا تھا۔ اسی مربوط سلسلے کی وجہ سے ہی اسے 1857ء میں لاہور کی پولیس نفری کو محفوظ رکھنے میں مدد ملی تھی۔ اس نفری نے 1857ء کے پورے عرصے میں مکمل ہم آہنگی کو یقینی بنائے رکھا تھا۔ کوئی شخص بھی مشکوک نظر آتا تو اسے پریشان اور خوفزدہ لوگوں کے سامنے توپ سے اُڑا دیا جاتا تھا۔ 1857ء میں اس کی خدمات کے پیشِ نظر اسے تمغہ سی بی (کمانڈر آف دی باتھ) عطا کیا گیا۔

جونہی غدر پر قابو پا لیا گیا تو آرتھر رابرٹس فوری طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگ گیا کہ عوام کے

لیے کمپنی کیسی مساوی اور منصفانہ سلوک پر مبنی انتظامہ لانے والی تھی۔ 1866ء میں اسے لاہور چیف کورٹ کا جج مقرر کر دیا گیا اور اس کے منصفانہ فیصلوں کی بناء پر ہر کسی نے اس کی توقیر کی۔ اُسے ''کمپینین آف سٹار آف انڈیا'' اس کی اعلیٰ خدمات پر عطا ہوا۔ تب حکومتِ برطانیہ نے ریاست حیدر آباد کی حاکمیت اس کے نظام کے ذریعے کرنے کا منصوبہ تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ رابرٹس کو وہاں ریذیڈنٹ تعینات کر دیا گیا۔ وہ وہیں 10 رمئی 1868ء کو انتقال کر گیا۔ آرتھر رابرٹس کی بیوہ سکاٹ لینڈ میں ہاوک کے نزدیک واڈلیوپ قصبے میں چلی گئی، جہاں 7 رجون 1905ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

آرتھر آسٹن رابرٹس کے تینوں بیٹوں نے پنجاب کے لیے لاہور ہی میں خدمات سرانجام دیں اور سب نے بڑے ممتاز مناصب پر کام کیا۔ اس کے بڑے بیٹے آرتھر ولیم رابرٹس (1842-1899ء) نے جو ہندوستان کے شہر فورٹ ولیئم بنگال میں پیدا ہوا۔ ہیرو سکول (1855-1857ء) اور ایسٹ انڈیا کالج (1857ء) سے تعلیم حاصل کی اور 1858ء میں ساتویں ڈراگون گارڈز میں شمولیت اختیار کی۔ 1862ء میں بنگال کیولری میں کمشن لیا اور پھر 1864ء میں پنجاب کے محکمہ سیاسی اُمور میں بھرتی ہو گیا۔ اس نے 82-1881ء میں بیکانیر کی بغاوت کو کچلنے میں خدمات سرانجام دیں اور 1898ء میں میجر جنرل کی حیثیت سے ریٹائر ہوا۔

دوسرے بیٹے ایلن سکاٹ رابرٹس (1845-1932ء) نے 1862ء میں بنگال انفنٹری میں شمولیت اختیار کی اور پھر پنجاب کمشن میں 94-1866ء تک خدمات سرانجام دیں۔ وہ لیفٹیننٹ کرنل کی حیثیت سے ریٹائر ہوا اور انگلستان چلا گیا۔ تیسرے بیٹے اسٹیفن ولیئم ٹام بل (1855-1897ء) نے، جو کسی وجہ سے غیر مقبول رہا، ستائیسویں پنجاب نیٹوؤ انفنٹری میں خدمات سرانجام دیں۔ 1877ء میں جواکی میں اور پھر افغانستان میں خدمات بجالایا۔ اس کا 16 رجون 1879ء کو پچیس برس کی جواں عمری میں لنڈی کوتل کے مقام پر انتقال ہوا۔ لاہور کیتھڈرل میں ایک لوح پر رقم ہے: ''اسٹیفن ولیئم ٹام بِل کی یاد میں پی این (ستائیسویں) عارضی جو، بعمر 25 سال، 16 رجون 1879ء کو لنڈی کوتل کے مقام پر انتقال کر گیا۔ آنجہانی آرتھر اے رابرٹس سی بی سی ایس ایل بنگال سول سروس کا بیٹا تھا۔''

رابرٹس خاندان کی حاکمیت اور اثر ورسوخ نے 1857ء کی جنگِ آزادی سے پہلے اور بعد میں لاہور کے طرزِ انتظام وانصرام پر گہرا اثر ڈالا۔ بلاشبہ انہوں نے اپنے فیصلوں پر سختی سے عملدرآمد کرایا، جو انصاف پر مبنی تھے اور ایسے انصاف پر جو ''ہوتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔'' ایک فیصلے پر جو انہوں نے نوٹ لکھا وہ آج بھی افسروں کی رہنمائی کا بین ثبوت ہے: ''دیانت دار ہونے کا دعویٰ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں جب تک عوام الناس اس افسر کو دیانت دار نہ سمجھیں کہ وہ موثر انصباطی کارروائی میں خودمختار اور آزاد ہے۔ تب ہی نظم وضبط قائم کیا جا سکتا ہے۔''

●○●○●○●

بدمعاش جو بزرگ سے زیادہ نامور ہوا

جب ہم گڑھی شاہو کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہمیں ریلوے اسٹیشن کا خیال آتا ہے، عیسائی فرقے کا خیال آتا ہے، برٹ انسٹیٹیوٹ جیسے شاندار ناچ کلب کا خیال آتا ہے، جو اَب بیکار پڑا ہے اور ہمیں کونوینٹ آف جیزز اینڈ مَیری کا خیال آتا ہے۔ لیکن یقیناً اس جگہ کے بارے میں اور بھی بہت کچھ ہے جسے ہم نے کبھی کھنگالنے کی کوشش نہیں کی۔

گڑھی شاہو علاقے کی شہرت کا عروج برطانوی دَور میں تھا جب ریل کی پٹڑی بچھائی گئی۔ اُن دنوں انجن ڈرائیور ہونا بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ ابتدائی طور پر تمام انجن ڈرائیور انگریز تھے اور برطانوی راج نے ان کے لیے ریلوے کی پٹڑی کے نزدیک نہایت خوبصورت رہائش گاہیں تعمیر کیں تھیں جو اَب بھی پُرشکوہ میو گارڈنز سے لے کر برٹ کلب تک اور دوسری کالونیاں جو پرانے میو روڈ، جسے اب علامہ اقبال روڈ کا نام دے دیا گیا ہے، کے دونوں اطراف میں پھیلی ہوئی تھیں۔ پتہ نہیں ہم اپنی تاریخ کو کیوں بھول جاتے ہیں؟ پھر انگریزوں نے ریلوے کے محکمے میں ہندوستانی عیسائیوں کو بھرتی کرنا شروع کر دیا جو زیادہ تر پرتگالی تھے، جن کا تعلق گوا سے تھا اور لاہور ڈی سوزا، ڈی سِلویا اور فیرئر خاندانوں سے بھرا پڑا تھا اور سفید فام اصل انگریزوں کا تو ذکر ہی نہ کریں ،جن کے خاندان برٹن، برائن اور نبلٹ تھے۔

ان کو ریلوے پولیس میں بھی بھرتی کیا گیا اور بعد ازاں پنجاب پولیس میں بھی اور ان تمام لوگوں نے بڑی ممتاز خدمات سرانجام دیں۔ آج تقریباً یہ سب لوگ ہمارے تعصّبات کا شکار ہونے کی بناء پر ٹھنڈے ملکوں کی طرف پرواز کر گئے ہیں۔ گڑھی شاہو کا معاشرتی اور ثقافتی ماحول بقیہ لاہور کے علاقوں سے غیر معمولی طور پر مختلف تھا۔ ہر کوئی وہاں جانا چاہتا تھا۔

لیکن پھر اس علاقے کی اصل کہانی شہنشاہ شاہ جہان کے دور سے شروع کرنا پڑے گی، کیونکہ اسی کے دورِ حکومت میں ایک عرب بزرگ، جن کا نام ابوالخیر تھا، لاہور تشریف لائے تھے۔ وہ اسلامی فقہ کے معروف عالمِ

دین تھے اور بغداد سے سفر کر کے ہندوستان پہنچے تھے۔ پنجاب پہنچنے پر اس کا موسم طبیعت کے موافق پایا تو لاہور میں تھوڑی دیر قیام کا فیصلہ کیا۔ اُن دنوں جو علاقہ اب گڑھی شاہو کہلاتا ہے، محلّہ سیّداں کہلاتا تھا۔ کیونکہ اس علاقے میں عالم حضرات قیام پذیر تھے، جیسے سیّد جان محمد حضوری، جن کے نام پر حضوری باغ ہے۔ یہ دانشمندانہ ماحول انہیں بہت پسند آیا اور انہوں نے یہیں آباد ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

شہنشاہ اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں ابوالخیر کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی تھی۔ شہنشاہ کی خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اِن بزرگ شخصیت سے فائدہ اٹھائیں۔ اس نے حکم دیا کہ بزرگ عالم دین ابوالخیر کے لیے ایک مدرسہ اور موزوں رہائش تعمیر کی جائے۔ ایک شاہی فرمان کے ذریعے اس مدرسے اور گھر کی دیکھ بھال کے لیے ایک رقم بھی مختص کر دی گئی۔ چنانچہ ابوالخیر کا ادارہ قائم ہو گیا۔ آج بھی گڑھی شاہو کے بڑے چوراہے کے قریب جہاں سڑک تھوڑا سا خم کھاتی ہے، ایک چھوٹی سی گلی ہے جس کے خاتمے پر قبرستان کے ایک کنارے پر قائم دائم ہے، لیکن غیر آباد اور لاوارث۔

ابوالخیر صاحب نے 105 برس کی عمر تک اپنے مدرسے میں پڑھایا اور پھر اپنی وفات پر اس دور کے دیگر معروف لوگوں کی طرح وہیں دفن ہوئے۔ جب مغلیہ سلطنت رُو بہ زوال تھی اور طوائف الملوکی آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی تو علم و فضیلت کی قدر و منزلت نہ رہی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ سے قبل لاہور پر تین سکھوں کی حکمرانی تھی۔ بالآخر رنجیت سنگھ نے سختی سے نظم و ضبط پر عمل پیرا ہو کر چالیس برس تک حکومت کی۔ بہر حال جس زمانے میں طوائف الملوکی چار سو پھیلی ہوئی تھی تو مدرسے پر ایک ''خلیفہ'' نے قبضہ کر لیا جس کا نام محمد نعیم تھا، جو وہاں پڑھایا کرتا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد یہ خلا پُر کرنے والا کوئی نہ تھا۔

لیکن طوائف الملوکی کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ اسے پتہ ہوتا ہے کہ خلاء کو کس طرح سے پُر کیا جائے جیسا موجودہ دور میں ''قبضہ گروپ'' قانون کا تمسخر اُڑاتے رہتے ہیں۔ ایک لحاظ سے تو کچھ بھی نہیں بدلا۔ موجودہ دور کے گڑھی شاہو چوراہے کے قریب مکان اور مدرسے پر کئی بدمعاشوں کی آنکھ تھی۔ لوگوں نے مدرسے کی عمارت سے اینٹیں چرانا شروع کر دیں۔ ڈاکوؤں کے جتھے مدرسے کے طالب علموں پر حملہ آور ہوتے اور ان کی معمولی نوعیت کی اشیاء لُوٹ لے جاتے تھے۔

پھر شاہو نام کا ایک حقیقی مافیا کا گُرو اپنے رسہ گیر، مویشی چور ٹولے کے ہمراہ آیا اور عالمِ دین ابوالخیر اور اس کے دیگر علماء کرام کے لیے بنائی گئی دونوں عمارتوں پر قابض ہو گیا۔ وہ علاقے سے مویشی اور دوسری اشیاء چرا کر لاتے اور اس محفوظ جگہ پر ذخیرہ کرتے تھے۔ اگر مالکان آ جاتے تو قلیل معاوضہ لے کر ان کی اشیاء واپس کر دیتے بصورت دیگر ان کو فروخت کر دیتے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب تین سکھ حکمران اپنی الگ الگ چھوٹی عملداریوں تک محدود تھے۔

چنانچہ شاہو کے ٹولے کا سب سے زیادہ اقتدار تھا۔ اسی کی وجہ سے اس علاقے کا نام شاہو دی گڑھی پڑ گیا۔ سکھوں نے بھی اسے گڑھی شاہو کہا اور انگریزوں نے بھی اور ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ اور ہمیں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم اس کا نام تبدیل کر دیں کیونکہ شاہو ایک بدنام زمانہ کردار تھا اور اس نے بالکل ویسی زندگی بسر کی، جیسے آج کل کے ''معزز'' شہری بسر کرتے ہیں اور یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔

لیکن انگریزوں نے گڑھی شاہو کا حلیہ یکسر بدل کر رکھ دیا۔ کیونکہ یہ ان کی افواج اور رعایا کو آمد و رفت کے ذرائع مہیا کرنے کی تمام تر کارروائیوں کا مرکز تھا، جو ان کی زندگیوں میں نمایاں طور پر انقلاب لے آئے۔ ذرا سوچئے تو، زندگی میں ذرائع آمد و رفت کی وجہ سے انقلاب آ جانا بعینہ ایسے ہی ہے، جیسے اندرونی محرق انجن یا اپنے زمانے میں موبائل ٹیلیفون کا چلن ہونا۔ لیکن کون سوچ سکتا تھا کہ ایک ایسا علاقہ جو اپنے رہائش پذیر اور وقت کے عالمِ دین شخص کے نام کو برقرار نہ رکھ سکا اور ایک پورے بدمعاش شخص کے نام کو، جو صحیح معنوں میں ''قبضہ گروپ'' کا لیڈر تھا، قائم رکھا۔ قسمت کے عجیب پھیر لاہور میں دیکھنے کو ملتے ہیں، کیونکہ ہر اینٹ کی اپنی کہانی ہے۔

●○●○●○●

نامور خواجہ سرا

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ خواجہ سراؤں میں ایک عجیب قسم کی کشش پائی جاتی ہے۔ اگر چہ ہمارے والدین نے ہماری پرورش میں ناپسندیدہ افراد قرار دے کر انہیں سختی سے نظر انداز کرنے کو کہہ رکھا ہے، لیکن جوان ہونے پر حیرت کا اظہار ہوتا ہے کہ کیا ان کے پاس اصلی سودا ہے بھی یا نہیں؟ تاریخ میں انہوں نے ایک زبردست کردار ادا کیا ہے دو طرح سے۔ ایک تو حسبِ سابق حالت کی پاسداری کرنے کا اور دوسرے ایسے طبقے کی حیثیت سے جو ظالم حکمرانوں کے ضمیروں کو مسلسل کچوکے لگاتے رہنے کا۔

اگر آپ داتا گنج بخشؒ کے مزار پر زیارت کے لیے جائیں اور نئی تعمیر شدہ مسجد کی طرف منہ کر کے بائیں گلی میں چلتے چلے جائیں تو آپ بلال گنج روڈ والے چوراہے پر جا نکلیں گے۔ اگر آپ ریٹی گن روڈ کی طرف واپس چلیں تو بائیں ہاتھ دو گلیوں میں ایسا علاقہ ہے جہاں دو برادریاں رہتی ہیں یعنی لاہور کے خواجہ سرا اور مزار کے پٹھان فقیر۔ ان بھول بھلیوں والی گلی میں باہر کے افراد کو اتنی کڑی نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ دونوں برادریاں نہ تو کسی کو ایک انچ زمین دیتے ہیں نہ ہی پیشکش کرتے ہیں۔ یہ ان کا اپنا علاقہ ہے ان کی اپنی جنت۔ اِس کھلے اور وسیع علاقے میں ان برادریوں کے عجیب راز چھپے ہوئے ہیں۔

اگر آپ روشنائی دروازے سے قلعہ میں داخل ہوں، جو اَب عوام کے لیے قلعے میں داخل ہونے کے لیے ایک ہی کھلا دروازہ ہے، تو آپ کے سامنے اس تاریخی عمارت میں آگے جانے کے دو راستے ہیں۔ وہ سڑک جو اوپر کی طرف بل کھا کر دائیں جانب چڑھتی ہے۔ یہ راستہ ہے جہاں ہاتھی اپنی سواریوں سمیت گزر کر دیوانِ عام کی طرف اور اس سے بھی آگے دیوانِ خاص تک جایا کرتے تھے۔ اگر آپ بڑی بڑی سیڑھیوں اور فٹ پاتھوں والا راستہ اپناتے ہیں جو سیڑھیوں سے پٹڑی والے راستے کے بائیں جانب پڑتا ہے تو اوپر جا کر شیش محل کے بالکل سامنے پہنچ جائیں گے۔ اگر آپ ان سیڑھیوں والے راستے پر چلیں تو آپ کو دیواروں میں جا بجا گولیوں کے نشان ملیں گے۔ کچھ پر تو سائن بورڈ لگے ہوئے ہیں جو ان کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ باقی آپ خود چلتے

ہوئے دیواروں میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ نشانات اُن لڑائیوں کے ہیں جو دو سو برس قبل لڑی گئی تھیں اور چند ایک اس سے بھی پہلے۔ لیکن گولیاں اور خواجہ سرا کہاں سے آن ٹپکے؟ یہاں ہمیں شاہی خاندانوں میں خواجہ سراؤں کے تاریخی کردار کو دھیان میں رکھنا ہوگا، کیونکہ خواجہ سراؤں کے بغیر کسی شاہی خاندان کا وجود نہ تھا۔

مغلیہ خاندان کے آخری عظیم شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات اور شہنشاہ شاہ عالم کی وفات کے بعد جب لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے لڑائی شروع ہوئی تو عظیم بادشاہ کے پڑنواسے سے تعلق رکھنے والی فوجیں حملہ آور ہوئیں، تو اسی راستے سے قلعہ میں داخل ہوئی تھیں۔ جب انہوں نے حرم کے علاقے کی طرف یلغار کی جہاں باقاعدہ طور پر ''خواجہ سراؤں کی ایک فوج'' حفاظت پر مامور تھے جو راہداریوں اور بالکنیوں میں استادہ تھے۔ جونہی سپاہیوں نے پیش قدمی کی تو خواجہ سراؤں نے سپاہیوں پر اُوپر سے چھلانگیں لگا دیں۔ چند ایک نے حرم کی شہزادیوں اور خواتین کی حفاظت کے لیے چاقوؤں کا آزادانہ استعمال کیا۔ یہ بہت ہی خونیں اور ہولناک واقعہ تھا اور خواجہ سرا اس راہداری کے ایک ایک انچ کے لیے لڑتے اور قربان ہوتے رہے۔ ''بالآخر حملہ آوروں کو حرم سرا پہنچنا ہی تھا، جہاں تعینات سپاہیوں نے حقیقتاً بے چوں و چرا بغیر لڑائی لڑے ہتھیار ڈال دیئے۔'' بہت بعد کی بات ہے، جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد، قلعہ پر بادشاہی مسجد کے اگلے دونوں میناروں سے، جہاں توپیں نصب تھیں، گولہ باری کی گئی تھی۔ سپاہیوں کو حرم کے علاقے میں داخل ہونے کی جرأت نہیں ہوئی تھی، کیونکہ یہ افواہ عام تھی کہ وہاں سکھ سپاہیوں سے زیادہ خوفناک خواجہ سرا موجود تھے۔ یہ توضیع اس لیے بھی قابلِ یقین ہے کہ جب 22 ستمبر 1857ء کو کیپٹن ہڈسن نے آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کیا تو دہلی کے خواجہ سراؤں کی بہادری کے قصے لاہور میں گردش کرتے رہے تھے۔ ہڈسن نے اپنی ذاتی ڈائری میں لکھا: ''میں بادشاہ اور اس کی چہیتی بیوی کو گرفتار کرتے وقت خوش نصیب رہا اور آج مزید خوش نصیب ٹھہرا ہوں کیونکہ میں نے بادشاہ کے دونوں بیٹوں اور مشہور یا بدنام پوتے ابو بخت نامی کو گرفتار کر کے تباہ و برباد کر ڈالا ہے۔ اس کی حفاظت پر مامور ایک خوفناک خواجہ سراؤں کے دستے نے سخت مزاحمت دکھائی، لیکن ان سب کو ہلاک کر دیا گیا۔ یہ بات لائقِ تحسین ہے کہ ہر خواجہ سرا بڑی بے خوفی اور تُند خوہی سے اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔''

لاہور کے خواجہ سراؤں کی اپنی روایت ہے جس کے تحت وہ اپنے ''بادشاہ'' کا انتخاب کرتے ہیں جو صرف مرنے پر ہی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ یہ انتخاب داتا صاحب کے علاقے میں کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے بادشاہ کی بڑی بے جگری سے حفاظت کرتے ہیں اور بادشاہ کی اجازت کے بغیر تو پولیس بھی اس علاقے میں داخل نہیں ہو سکتی۔ خواجہ سراؤں کے مابین شادیوں کی اجازت بھی بادشاہ ہی دیتا ہے۔ اگر کوئی دوستی کا یہ بندھن توڑنا چاہے یا اسے آپ جو بھی نام دینا چاہیں، تو پھر لاہور کے خواجہ سراؤں کا یہ طبقہ جوابی حملہ کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے لاہور کی پولیس کی بھی یہ روایت رہی ہے کہ وہ کبھی اس علاقے میں دخل اندازی

نہیں کرتے۔

آپ حیرت میں ہوں گے کہ اس مزار کے پٹھان فقیروں نے لاہور کے خواجہ سراؤں سے کیا لینا ہے؟ مقبولِ عام روایت یہی ہے کہ دوسو برس سے زیادہ عرصے سے، جب سے مغل حکمرانوں نے لاہور کے خواجہ سراؤں کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھالیا تھا، ان کی آمدن کا عشر خواجہ سراؤں کے ''بادشاہ'' کے حوالے کر دیا جاتا ہے، جو اسے اپنی برادری کی فلاح و بہبود پر خرچ کرتا ہے۔ کسی قابلِ ثبوت ریکارڈ سے اس روایت کی تصدیق نہیں ہوتی، لیکن اس کی زبانی توثیق آج بھی ملتی ہے۔ یہ بہت ہی مسدود برادری ہے جو اُمید ہے آہستہ آہستہ کُھل جائے گی کیونکہ پاکستان اور دیگر دنیا کے ممالک ان سے مزید رواداری کا سلوک کر رہے ہیں جس کی ترجیحات عام شہری کی بہ نسبت ''غیر مشابہ'' ہیں یہ بھی بحث طلب نکتہ ہے۔

●○●○●○●

جگّے کی بہن مِیداں

جب میں نے بالآخر یہ خبر پڑھی کہ خوشونت سنگھ کے ناول ''ٹرین ٹو پاکستان'' پر مبنی ہندوستان میں ایک فلم بنے گی تو مجھے نِمو کا خیال آیا اور پھر جگّے کا، جو عورتوں کی عصمت دری کرنے والا ڈاکو تھا اور ساتھ ہی مجھے میداں کا خیال آ گیا۔ اگر کوئی ترسانے والی عورت تھی تو وہ میداں ہی تھی۔

میرے کالج کے ایّام میں ہم اپنے دوست شیرو کے، اندرونِ شہر بھاٹی دروازے میں واقع، گھر پیدل جایا کرتے تھے اور اکثر داتا دربار کے علاقے میں پہنچنے کے لیے پرانی خندق، جسے سب لوگ نالے کے نام سے پکارتے تھے، پر بنے عارضی پُل پر سے ہو کر جایا کرتے تھے جو اندرون شہر کے انتہائی جنوب مشرق میں واقع ہے۔ جب ہم نالے کے ساتھ ساتھ چلتے تو ہم بہت سی بھینسوں کو وہاں بندھا ہوا دیکھتے، یہ میداں کی ملکیت تھیں۔ غالباً اس کا نام حمیداں تھا اور خالص لاہوری زبان میں اگر یہ نام ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ بولیں تو اس میں جنسی کشش آ جاتی ہے اور اگر نام کے آخری حصے کو تھوڑا سا کھینچ کر بولیں تو اس میں مزید شہوانی کشش کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

لیکن میداں کوئی آسان حدف نہ تھی۔ وہ چھ فٹ لمبی اور چوڑے عرض کی تھی، موٹاپا نام کو نہ تھا۔ اس کا جسم سخت مشقت والے کام کرنے سے اس قدر متناسب ہو چکا تھا کہ پینسٹھ سے زیادہ عمر ہونے کے باوجود وہ ٹھاٹھ دار لگتی تھی۔ غالباً جب ہم کالج میں پڑھتے تھے تو ہر شے ہیجان انگیز لگتی تھی، لیکن میداں واقعی ٹھسے دار تھی۔ میرا دوست شیرو اس سے خوف کھاتا تھا اور خوف کھانے سے مراد واقعی سچ مچ خوفزدہ ہونا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے وجہ بتائی کہ ''وہ جگّے کی بہن ہے۔'' میں اپنے قدموں پر ہی رُک گیا۔ اب وہ مجھے ڈراؤنی لگنے لگی اور میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی ہمت نہ کر سکا حالانکہ میرا قد چھ فٹ دو انچ ہے اور قبول صورت بھی ہوں، لیکن میں میداں کا جوڑ نہیں تھا۔ وہ غالباً مجھے ناشتے میں کھا جاتی۔ اس قسم کا خوف وہ ہر اس شخص کے دل میں پیدا کر دیتی تھی جو اُسے ایک نظر دیکھ لیتا تھا۔

اندرون شہر کی خشک خندق کے جنوب مشرقی کونے پر واقع عمارت میداں کی ملکیت تھی۔ وہ آج بھی

اٹھانوے برس کی عمر میں وہیں رہتی ہے اور اب بھی اسی روایتی چارپائی پر بیٹھتی ہے، جو پٹ سن کے دھاگے سے بُنی جاتی ہے۔ اب بھی اس کے پاس بہت سی بھینسیں ہیں اور اس کی آواز دوسرے لوگوں سے اونچی ترین سنائی دیتی ہے۔ اٹھانوے برس کی عمر میں وہ اب بھی ٹھسّے سے رہتی ہے۔ وہ اب بھی ''برادری'' کی کوٹ کچہری لگاتی ہے، کیونکہ وہ جگّے کی بہن میداں ہے اور کسی کو بھی اپنے قدموں پر روکنے کے لیے کافی ہے، بالکل جیسے بتیس برس قبل میرے ساتھ ہوا تھا۔

یہ بات ہمیشہ پُراسرار رہی کہ میداں کیسے اپنی بھینسوں کے دودھ کو فروخت کرتی تھی۔ کیونکہ اس طرزِ زندگی سے اس کا جواز نہ بنتا تھا۔ ایک قصہ مجھے بھاٹی دروازے کے تھانے کے ایس ایچ او نے سنایا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اردگرد کے دیہات سے چوری کی گئی تمام بھینسیں اُسے ادنیٰ معاوضے کے عوض فروخت کر دی جاتی تھیں اور وہ ان کو اچھے خاصے منافع پر بیچ دیتی تھی، لیکن کسی کی، نہ ہی ایس ایچ او کی، جرأت نہ تھی کہ اس سے باز پُرس کرتا کہ اس نے اپنی بھینسیں کہاں سے خریدی ہیں۔ ایک بار ایک نڈر پولیس آفیسر نے جرأت کر کے چوری کی املاک قبضے میں رکھنے پر گرفتار کر لیا تو اس نے ضلع کچہری لاہور کے احاطے میں اس کی پٹائی کر ڈالی اور جب اسے جیل ہو گئی تو چار تگڑے جوانوں نے اس کو قابو کیا ہوا تھا۔

پھر ایک گھنٹے کے اندر اندر تین سو سے زائد گجروں نے اپنے ریہڑوں پر تھانے پر دھاوا بول دیا اور دو روز تک پورے شہر میں دودھ کی ترسیل بند کر دی۔ لاہور میں ایک بحران آ گیا کیونکہ لوگ کہتے تھے کہ میداں کو ہاتھ لگایا گیا ہے۔ اس کے مقدمے کی پیروی کے لیے لاہور اور اس کے گردونواح کے ہر گجر نے ایک ایک تولہ سونا مشترکہ فنڈ میں دیا۔ پہلی پیشی پر جج نے اسے رہا کر دیا اور ایس ایچ او کو ایک عورت پر دست درازی کی جرأت کرنے کی کوشش پر سرزنش کی۔

باعزت رہائی پر میداں ایک بہت بڑے جلوس کے ساتھ گھر لوٹی۔ تھانے کے باہر اس نے جنگی للکار بلند کی جسے مقامی زبان میں ''بھڑک'' مارنا کہتے ہیں۔ تھانے میں سے کسی نے کھڑکی سے بھی باہر جھانکنے کی جرأت نہیں کی۔ مجھے یاد ہے اس روز بھاٹی دروازے کے پورے علاقے میں دودھ مفت تقسیم کیا گیا۔ آج بھی کسی کو جگّے کی بہن سے دخل اندازی کرنے کی جرأت نہیں ہے۔ حال ہی میں میرے دوست شیرو نے مجھے بتایا کہ وہ اب بھی زندہ ہے، تو میں دوبارہ اسی راستے پر گامزن ہو گیا۔ وہ بیٹھی ہوئی تھی، ہمیشہ کی طرح بڑے ٹھسے کے ساتھ۔ اٹھانوے برس کی لمبے قد والی طاقتور عورت، اس کے گرد ایسا ہالہ تھا جو ہر شخص کو اس سے دُور ایک فاصلے پر رکھتا تھا۔ کیونکہ اس کی بے حد عزت کی جاتی تھی۔ وہ بڑی عقل والی عورت ہے۔ وہ اپنے لمبے چوڑے خاندان کو ہدایات دیتی ہے کہ ان کا طرزِ عمل کیسا ہونا چاہیے۔ سرکاری پابندی کے باوجود اب بھی اندرون شہر میں اس کے پاس بھینسیں بندھی ہیں، لیکن پھر وہ میداں بھی تو ہے، جگّے کی بہن۔ وہ سو برس جیتی رہے گی اور قصے سناتی رہے گی

کہ کس طرح اس کے بہادر بھائی نے اپنی محبوبہ نمو کو، پاکستان جانے والی ٹرین پر، بچانے کی خاطر اپنی جان کی قربانی دی تھی۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سارا قصہ ہی من گھڑت ہے اور یہ کہ سارے پنجابیوں کی طرح خوشونت سنگھ ایک عظیم کہانی کار ہے۔ خوشونت کا ''جگا'' مسلمان نہیں تھا تو میداں کس طرح جگّے کی بہن ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے؟ اس بات نے مجھے پریشان کر رکھا تھا۔ تو کیا جگا ڈاکو اور جگا گجر دو الگ کردار تھے؟ روایتی قصے کے مطابق جگا ڈاکو، رسہ گیر، عورتوں کی عصمت دری کرنے والا اور اللہ کی زمین پر تُند شراب پینے والا اور حد سے زیادہ نڈر شخص تھا۔ کوئی تعجب کی بات نہیں جو میداں اب بھی فخر سے سر بلند کر کے چلتی ہے۔

●○●○●○●

یہ بلّاقی شاہ تھا کون؟

جب آٹھ برس قبل میں نے کالم لکھنا شروع کیا تو میں نے لاہور کے بارے میں بحث و تمحیص کے لیے چند حدود متعین کر لی تھیں اور یہ حدود اندرون شہر بھاٹی دروازے کے میرے دوست شیرو نے کی تھیں، جس کے ہمراہ میں اب بھی کئی کئی گھنٹے سڑکوں اور گلیوں میں پیدل چل پھر کر ہر معاملے پر بات چیت کرتا رہتا ہوں۔

حفظِ مراتب، لوگوں، جگہوں، اشیاء اور چہروں کو دی گئی۔ آج ہم ہر اچھی کہانی کی طرح ابتدا سے شروع کرتے ہیں۔ ''لوگ'' ''جگہوں'' سے متعلق ہوتے ہیں وہ جو ''چیزیں'' وقت کے ساتھ ساتھ کرتے رہتے ہیں، اسے ہم تاریخ کہتے ہیں اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اس کا چہرہ بشرہ ہوتا ہے اور ہم اس چہرے کا معائنہ کرتے ہیں اور ہمارے شعور میں ایک یاد کندہ ہو جاتی ہے اور وہ لاشعور میں جگہ بنا لیتی ہے۔ اکٹھے رہنے سے ہم اپنی زندگیوں کے طور طریقے وضع کرتے ہیں۔ لاہور اور اس کے لوگ بے نظیر ہیں کیونکہ دوسرے شہروں اور لوگوں کی طرح تاریخ نے اُن کی بھی کندہ کاری کی ہے۔

ایک شخص جس کے بارے میں بڑی چاہت سے لکھنا چاہوں گا اور جس کے بارے میں مجھے زیادہ علم بھی نہیں ہے، اسے بلّاقی شاہ کہا جاتا تھا اور جو پانی والے تالاب کا ایک ہندو ساہوکار تھا۔ تمام لاہوریوں میں سے ہمارے بزرگوں کے، جو اب بھی اندرون شہر ہی رہتے ہیں، ذہنوں میں اس شخص کی یاد سب سے زیادہ تازہ ہے۔ بلّاقی شاہ تھا کونَ؟ مجھے یاد ہے میرے والد نے مجھے بلّاقی شاہ کے پوتے، جسے وہ ''لاٹو شاہ'' یا رام پرکاش کہتے تھے، کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ان کا ہم جماعت تھا اور وہ دونوں کالج کی کرکٹ ٹیم میں کھیلا کرتے تھے۔ اب لاٹو اور مرحوم ممتاز صحافی مظہر علی خان صرف دو ایسے طالب علم تھے جو اپنی کاروں میں کالج آتے تھے۔ لاٹو صرف ریشمی لباس اور مظہر علی خان کھدر کا لباس پہنا کرتے تھے۔ ان کا یہ مارکہ ان کی وفات تک رہا۔ چنانچہ ّبلاقی شاہ یقیناً بہت امیر شخص تھا اور پنجاب کی تقسیم کے وقت اسے لاہور کا امیر ترین شخص کہا جاتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پنجاب کے تقریباً ہر امیر زمیندار نے اس سے ادھار لے رکھا تھا۔ ایک روئداد کے

مطابق وزیراعظم پنجاب سر سکندر حیات ٹوانہ نے بھی بلّاقی شاہ سے اچھی خاصی رقم بطور قرض لے رکھی تھی۔ چنانچہ تقسیم امیروں کے لیے پریشانیوں سے نجات کی علامت تھی کیونکہ ان کو قرضے ادا نہیں کرنے پڑے اور بعد ازاں کلیموں کی لوٹ مار میں مزید امیر ہو گئے۔

بلّاقی شاہ ایک علامتی لاہوری کردار تھا۔ ایک خاصے معتبر عمر رسیدہ شخص نے مجھے بتایا کہ جب بلاقی شاہ کو علم ہوا کہ اس کا بیٹا طبّی کی ناچنے والیوں کے ہاں کثرت سے جانے لگا ہے تو وہ ایک رات خود ایک ''مُجرے'' میں بیٹے کے سامنے جا بیٹھا۔ اگر اس کا بیٹا پانچ روپے کا نوٹ (جو اس زمانے میں بڑی رقم تھی) دیتا تو بلّاقی شاہ دس روپے کا نوٹ نچھاور کر دیتا۔ اس رات ناچنے والیاں خوشی سے پاگل ہو گئیں کیونکہ دولت کی بارش ہو رہی تھی، اس لیے کہ باپ اور بیٹا مقابلے پر تھے اور دونوں ایک دوسرے کے نہلے پہ دہلے پھینک رہے تھے۔ دونوں خالی ہاتھ گھر لوٹے لیکن بیٹے کو سبق مل گیا کہ وہ دولت ضائع کرتا رہا تھا کیونکہ ناچنے والیوں کو اس سے نہیں، اس کی دولت سے پیار تھا۔ ایک مہینے بعد ناچنے والیوں کا ایک وفد بلّاقی شاہ کے پاس آیا اور اسے اس کی لٹائی ہوئی رقم واپس کی اور درخواست کی کہ وہ اپنے بیٹے کو اِن کے ہاں آنے کی اجازت دے دے۔ بلّاقی شاہ نے رقم لے لی اور اُن سے کہا کہ وہ وہاں سے چنّت ہو جائیں۔

بلّاقی شاہ کے اور بھی قصے ہیں جو ایک دوسرے سے بڑھ کر دلچسپ ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ ہمارے قارئین بلّاقی شاہ کے بارے میں بہت سے قصے سنانے کے قابل ہوں گے، کیونکہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ پھر دیگر قد آور شخصیات ہیں جیسے سر گنگا رام جس کی ہمارے شہر کے لیے بے مثل خدمات ہیں۔ ہم نے جو اس کو بھرپور عزت نہیں دی، یا سرے سے دی ہی نہیں، تو یہ ہماری ذہنی غربت کا چیخ چیخ کر اعلان کر رہی ہے۔ ہم سلطان ٹھیکیدار کے بارے میں لکھ چکے ہیں اور کنہیا لال کے بارے میں جو اعلیٰ ترین درجے کا انجینئر اور وقائع نگار تھا۔ اگرچہ اس کے بارے میں مزید جانکاری کی ضرورت ہے۔ پھر دیال سنگھ، رتن چند، میلہ رام اور سر شاہ دین جیسے لوگ بھی ہیں، جو سب عظیم لاہوری ہیں اور ان سب کے بارے میں غفلت برتی گئی ہے۔ ہمیں ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی ضرورت ہے اور ہمیں انہیں شہر کے سپوت ہونے پر اعزاز سے نوازنا چاہیے۔ ہمیں لالہ لاجپت رائے اور بھگت سنگھ، جیسے شہیدوں کو بھی نہیں بھولنا چاہیے، جنہوں نے صرف ہندوستان کے لیے نہیں بلکہ پورے برصغیر کی آزادی کی خاطر اپنی جانیں دے دی تھیں۔ ہمیں انہیں صرف اس لیے نہیں بھلا دینا چاہیے کہ وہ غیر مسلم ہیں۔

لیکن پھر امیروں اور طاقتوروں کی بہ نسبت کم درجے کے ''انسان'' بھی تھے جو آج بھی لوگوں کی اجتماعی یادداشت میں زندہ جاوید ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں بچپن میں الماریاں بنانے والے اور بعد ازاں لٹّو بنانے والے سراج دین سے ''گھومنے والا لٹّو'' خریدا کرتا تھا۔ وہ اپنے بڑے بڑے ہاتھوں پر بڑی بڑی انگلیوں سے

چٹکی بجا کر تیزی سے لٹّو گھما لیتا تھا۔اس کا تقریباً پچیس برس قبل انتقال ہو گیا تھا،لیکن وہ لارنس روڈ پر 1929ء سے لٹّو بنا رہا تھا۔کھانے پینے کے محاذ پر کئی نام نمایاں ہیں،جن میں چونا منڈی کا ''خلیفہ کبابیہ'' بھی تھا۔اس کا پوتا اب بھی وہاں دکان کرتا ہے،لیکن سواد جاتا رہا ہے۔اگر نام کو زندہ رکھنا ہے تو معیار کو مستقل بڑھاتے رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

پھر گوالمنڈی کا سردار مچھلی فروش تھا۔اس کے بیٹے کاروبار چلا رہے ہیں اور فارمی مچھلی کو ''راوی کا رہو'' کہہ کر بیچ رہے ہیں۔راوی تو اب رِستا ہے اور اس قدر کثافت آلود ہو گیا ہے کہ رہو جیسی حساس مچھلی تو ایک طرف رہی اگر انسان جیسی ڈھیٹ ذی حیات بھی ہو تو اس کثافت میں مر جائے گی۔اندرون شہر میں صرف ایک شخص رہ گیا ہے جو اَب بھی دال کلچے بناتا ہے۔وہ اب بھی گلیوں میں گھومتا پھرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کی مشعل لے کر آگے چلنے والے کوئی نہیں ہے۔ہو سکتا ہے کہ لاہور میں مشہور دال کلچہ جلد ختم ہو جائے۔ہم لاہور کے دو فضل حضرات کو نہیں بھول سکتے۔لال کھوہ کی برفی بنانے والا اور ٹبی چوک کا سِری پائے والا فضل۔دونوں نام لاہور اور لاہور سے باہر پھیل چکے ہیں اور اللہ کرے دونوں خوشحال رہیں۔ان کے متعلق مزید جاننے کی ضرورت ہے۔

●○●○●○●

مشہور اکھاڑے اور گاماں کی روایت

مشہور تاریخی دنگلوں میں سے، جو اَب تک لاہور میں منعقد ہوئے ہیں، ایک شاہی دنگل میں، جس کی صدارت مہاراجہ رنجیت سنگھ کر رہا تھا، گوجرانوالہ کا اٹھارہ سالہ پہلوان اترا جس نے کُشتیوں میں یکے بعد دیگرے پنجاب کے بڑے بڑے نامی گرامی پہلوانوں کو پچھاڑ دیا۔ اسے نلوا کا خطاب دیا گیا اور بعدازاں وہ لاہور دربار کی پنجابی فوج کا بہترین جرنیل ہوا۔

کئی برس بعد ایک اور شاہی دنگل نے پورے برصغیر کے لوگوں کے تخیل کو اسیر کر لیا تھا۔ یہ لاہور کے رستم ہند گاماں پہلوان اور ورلڈ چمپئن پولینڈ کے زبسکی پہلوان کے مابین دنگل تھا۔ یہ مقبولِ عام روایت آج بھی قدیم اندرون شہر لاہور کی پیچیدہ گلیوں میں زیر بحث رہتی ہے۔ جب احمد بخش گاماں ریٹائر ہوا تو وہ دنیا بھر کے تقریباً ہر قسم کے چمپئن کو شکست دے چکا تھا اور اس کے کارہائے نمایاں سے برصغیر کی دیسی کُشتی کا شمار بین الاقوامی کھیلوں میں کیا جانے لگا تھا اور اس کے اپنے قول کے مطابق ''معزز طاقتور اور پھرتیلے لوگوں'' کے صاف ستھرے کسرتی کھیل کی حیثیت سے غیر معمولی معتبر بن گیا۔ 1910ء میں ''رستم ہند'' کے خطاب کے لیے ایک دنگل کا انعقاد کیا گیا۔ گاماں پہلوان نے سب پہلوانوں کو پچھاڑ کر وہ خطاب جیت لیا تھا۔ گاماں کی آخری کُشتی، یورپی چمپئن جے سی پیٹرسن کے ساتھ ہوئی، جسے اس نے صرف پینتالیس سیکنڈ میں چت کر دیا تھا۔ اس کا 22 رمئی 1960ء کو لاہور میں انتقال ہوا تھا۔

کئی ہزار سال سے پہلوانی ایک شاہی کسرتی کھیل رہا ہے اور صدیوں تک بہترین پہلوان بہترین جرنیل بنتے آئے ہیں۔ خواہ قدیم یونان ہو، سلطنت روما ہو، کلوپیٹرا کا مصر ہو یا ایران یا ہندوستان پاکستان کا برصغیر، پہلوانی ہمیشہ قومی زندگی کا جزو رہی ہے۔ آج بھی سالانہ کل پنجاب دنگل جو قلعہ لاہور کے نزدیک کُشتیوں کے سٹیڈیم میں منعقد ہوتا ہے، جس میں پنجاب کے دور دور کے دیہاتوں سے جوان کھنچے چلے آتے ہیں۔ انسانی طاقت کی کشش ایسی ہی ہوتی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ پرانے وقتوں میں اکثر جنگوں کا فیصلہ دشمنوں کے مابین

صرف ایک کُشتی کے مقابلے سے ہی ہو جاتا تھا۔ لاہور شہر میں پہلوانی کی ایک خاص روایت رہی ہے اور چونکہ اب یہ روایت کمزور پڑتی جا رہی ہے تو اب وقت ہے کہ ہم سمجھیں کہ یہ کیا تھی تا کہ اس کا اعادہ کیا جا سکے۔

تمام پہلوان ایک مخصوص ''اکھاڑے'' سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس ڈھیلی مٹی کے ہموار قطعۂ زمین کے لیے انگریزی زبان میں پِٹ (گڑھا) ہی قریب ترین لفظ ہے۔ مقامی لوک گیتوں میں ان جگہوں کو اساطیری حیثیت حاصل ہے۔ لاہور میں بنیادی طور پر پہلوانوں کے تین گروہ ہیں جو ''کلووالا''، ''نوروالا'' اور ''کوٹ والا'' ہیں۔ ہر اکھاڑہ اپنے اپنے پہلوانوں کی تربیت کرتا ہے اور پھر مختلف اکھاڑوں کے مابین مقابلے ہوتے ہیں۔ اس صدی سے پہلے لاہور میں ایسے سینکڑوں اکھاڑے تھے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بتدریج کم ہوتے چلے گئے۔

ادبی رسالے نقوش لاہور نمبر کے، جو 1962ء میں شائع ہوا تھا اور جس کا اب نوادرات میں شمار ہوتا ہے اور اسے دوبارہ تحریر کرانے کی سخت ضرورت ہے، مطابق لاہور کے بڑے بڑے اکھاڑوں میں، موہنی روڈ پر ''اکھاڑہ خلیفہ بوٹا''، ''اکھاڑہ گاماں اور امام بخش''، اندرون شہر لاہور میں ''اکھاڑہ تکیہ تاجے شاہ''، ''اکھاڑہ چانن قصائی''، ''اکھاڑہ ننھے شاہ'' تھے۔ پھر ''اکھاڑہ نزد پُل مصری شاہ'' اور ایک اور مشہور ''اکھاڑہ ویام شالہ'' تھا جسے بھولو پہلوان، اسلم، گوگا اور اعظم پہلوان استعمال کرتے تھے۔ ''اکھاڑہ چوک برف خانہ'' بھی بڑے غضب کی شہرت کا حامل تھا۔ دیگر مشہور اکھاڑوں میں ''اکھاڑہ خلیفہ بخشی''، ''اکھاڑہ حانی پہلوان'' اور ''اکھاڑہ گاڈو شاہ'' تھا جو رستم زمان کی ملکیت تھا۔ اندرون شہر سے ذرا باہر، سرکلر باغ میں، دو مشہور اکھاڑے تھے، دونوں کا نام ''اکھاڑہ بالمکیاں'' تھا۔ ان میں سے ایک بھاٹی دروازے کے باہر اور دوسرا ٹکسالی دروازے کے باہر واقع تھا۔

پچھلے چھیاسٹھ برس میں، جنہیں میرے والد ''کلیم کی ذہنیت والے سال'' کہتے تھے، جو ''قبضہ عہد'' میں متشکل ہو گئے تھے اور موجودہ دور جو ''فوجی پلاٹوں کا دور'' کہلاتا ہے، نے ان تمام اکھاڑوں پر قبضہ کر کے انہیں پلاٹ برائے فروخت میں تبدیل کر دیا تھا۔ لیکن دیسی کُشتی کو برقرار رکھنے کے لیے جگہ کی ضرورت تو ہے اور ہم قدیم خاندانی اکھاڑوں کے تجارتی ناموں پر ''کُشتی کلب'' معرضِ وجود میں آتے دیکھ رہے ہیں۔

ان نئے کُشتی کلبوں کی چند مثالیں یہ ہیں: شاد باغ نمبر 2 کا ''اکھاڑہ حاجی صدیق پہلوان'' اب ''میراں کُشتی کلب'' کہلاتا ہے اور کوٹ خواجہ سعید کا ''اکھاڑہ کالا جٹ پہلوان'' اب ''کالا جٹ کُشتی کلب'' کہلاتا ہے۔ ''اکھاڑہ صادق پہلوان میوہ منڈی والا'' اب ''صادق کُشتی کلب صادق آباد، لاہور'' کہلاتا ہے۔ ایک اور بہت ہی قدیم اور مشہور ''اکھاڑہ سجن پہلوان'' جو شاہ میراں میں ہے اب ''سجن کُشتی کلب'' کہلاتا ہے۔ اب ایک اور دلچسپ نام کا اکھاڑہ بِلا چنگڑ پہلوان اب ''بِلا کُشتی کلب، شاہدرہ'' کہلاتا ہے۔ لگتا ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ''نئی عزت داری'' کے لیے دوڑ لگی ہوئی ہے، جو پہلوانوں کی بیش قیمت اساس سے تہی ہے۔ یہ نام ہو سکتا

ہے آج دل آزار لگتے ہوں، لیکن یہ اپنے ہمراہ ___ ایک چھوٹے سے نام میں ___ ایک پہلوان کی اصل اور کارناموں کی تاریخ سموئے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''اکھاڑہ پپو پہلوان چڑھتا سورج'' کا نام اب صرف ''پپو کشتی کلب'' ہے۔ ایک وقت تھا جب پپو نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ گاماں اور بھولو برادران سے مقابلہ کرسکتا ہے اور ایک کُشتی میں پپو نے اسلم کو چٹ شکست دے بھی دی تھی، لیکن دوسری میں وہ ہار گیا تھا۔ دونوں موقعوں پر قدیم شہر میں بڑے پیمانے پر خوشیاں منائی گئی تھیں اور مٹھائیاں تقسیم کی گئی تھیں۔ چند ایک بے ربط لڑائیاں دونوں پہلوانوں کے حمایتیوں میں ہوئیں اور پھر بعد میں جو بہیمانہ واقعات پیش آئے ان کا ذکر نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ ایسی فخریہ بات تھی لاہور میں پہلوان ہونا!

سکول میں پڑھنے والے لڑکے کی حیثیت سے مجھے اچھا پہلوان سے، جو ہمارا ہمسایہ تھا، ملاقات یاد ہے۔ ایک بار میں سکول سے دیر سے لوٹا تو میری والدہ کے اُن سے پوچھنے پر کہ آیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے؟ ''نہیں، لیکن میں دیکھتا ہوں'' ان کا جواب تھا۔ افوہ! ایک ہلکا سا ہاتھ جو میرے سر پر پڑا آج بھی ان کی یاد دلاتا ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ پہلے زمانے کے پہلوان غنڈے نہیں ہوتے تھے۔ وہ محلے کے محافظ ہوتے تھے اور ان کے علاقے میں کوئی جرم سرزد کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ وہ بے پایاں پیار کرنے والے شخص تھے، جو اپنی دودھ کی دکان کے باہر بیٹھے رہتے اور درجنوں کے حساب سے دودھ کے گلاس پی جاتے۔ لوگ انہیں محوِ حیرت سے دیکھتے۔ افواہیں وہ خود ہی پھیلاتے تھے کہ ایک چمپئن پہلوان ایک وقت کے کھانے میں کم از کم ایک سالم بکرے کا گوشت کھا جاتا ہے۔ مجھے کرکٹ کے سابقہ کھلاڑیوں نے بتایا کہ جوانی میں ٹیسٹ کریکٹر عمران خان آدھا بکرا کھا سکتا تھا۔ میں نے ایک بار اندرون شہر میں کالا پہلوان کے اکھاڑے میں اس سے یہ ذکر کیا تو اس نے فوراً جواب دیا: ''عین ممکن ہے، دیکھتے نہیں گوریاں کیوں اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔'' اس پر اس نے اپنے کان پکڑ لیے جیسے گستاخانہ بات کہنے پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ رہا ہو۔

لاہور کا روایتی پہلوان ایک عظیم کھلاڑی تھا۔ قدرتی طور پر دوسروں کو معاف کر دینے والا اور کمزوروں کا محافظ اور وہ اس کام میں بڑا فخر محسوس کرتا۔ اس کے لیے اس کی صحت ہی سب کچھ تھا اور وہ نظرِ بد سے بچنے کے لیے صدقہ دیتے تھے اور اب چونکہ شہر اپنے مرکز سے میلوں دُور تک پھیل چکا ہے اس لیے دیسی پہلوان کی قدیم روایت بھی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا فن زوال پذیر ہے۔ اگرچہ انگلستان میں پنجابیوں نے اس فن کی بحالی کا خاصی حد تک بندوبست کر رکھا ہے، لیکن ہوسکتا ہے دائرے کا چکر پورا ہو چکا ہو اور ہم ایک بار پھر اپنے شہر میں ایک اور یورپی زبسکی کا لاہور سے ایک اور گاماں پہلوان کے مابین، ایک اور کُشتی کا مقابلہ دیکھ پائیں۔ یہ یقیناً گذشتہ مقابلوں سے زیادہ مجمع گیر ہوگا۔

●○●○●○●

باگھ کی مانند شخص

ہم پانچ بھائی تھے اور زیادہ تر اپنے لان کے درخت گھر میں رہتے تھے۔ جب نائی ہمارے ختنے کرنے آیا تو ہم دو روز تک کبوتروں کے دَڑبے میں چھپے رہے تھے۔ گنگا رام ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کے ڈاکٹروں میں سے کسی نہ کسی کو تقریباً روزانہ زخمی کر دیتے۔ ہم بڑے غصیلے، دہشت گرد بچے تھے، لیکن صرف ایک چیز سے ہم سہم جاتے تھے، جب ہمارے والد ''ہریارا گلے'' کہتے، یہ ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا اور ہم فوراً راہِ راست پر آجاتے۔

قلعہ لاہور کے عین بالمقابل مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھی ہے اور اس سمادھی کے احاطے میں اس سے بڑھ کر محترم گروارجن دیو کی سمادھی ہے۔ کبھی دریائے راوی یہاں بہتا تھا اور اس کے کنارے کئی سو برس تک، قوی اور بہادر ترین جوان کشتیوں کے دنگل کیا کرتے تھے جو کئی ہزار سال پہلے سے منعقد ہوتے آرہے تھے۔

سمادھی سے باہر اور سرکلر روڈ کے درمیان عتیق سٹیڈیم ہے جو مرحوم جرنیل عتیق الرحمان سے موسوم ہے جو نہایت درجہ شریف انسان تھے۔ لفظ جرنیل پر ہر لحاظ سے پورا اترتے تھے اور بلاشبہ اب تک پنجاب کے تمام گورنروں میں سب سے زیادہ دیانت دار تھے۔ وہ کُشتیوں کے بڑے شوقین تھے اور انہوں نے اس کھیل کو خاصا فروغ دیا۔ بسنت کے روایتی جشن سے ذرا پہلے، جو فروری کے پہلے ہفتے میں شروع ہوتا ہے، سالانہ دنگل مقابلے ہوتے ہیں تاکہ ملک کے قوی ترین شخص کا فیصلہ کیا جاسکے۔

عام طور پر زمانۂ قدیم میں زیادہ کشش کا باعث پہلوانی تھی، لیکن اس سے بھی پہلے نیزہ بازی، تلوار بازی اور گھڑ دوڑ ہوا کرتی تھیں۔ ساٹھ کی دہائی میں جنرل عتیق الرحمان نے اِن تینوں روایتی کھیلوں کو ایک نئی تقریب ہارس اینڈ کیٹل شو (گھوڑوں اور مویشیوں کی نمائش) میں اکٹھا کر دیا۔ یہ تقریب کئی برس تک منعقد ہوتی رہی، لیکن پھر منتظمین کی لاپروائی سے ختم ہوگئی، کیونکہ انہوں نے اِس اَساسی دیہی کھیل کو شہری رنگ دے کر کھیل سے زیادہ نمائشی تقریب بنا دیا تھا۔ لیکن پہلوانی وہیں رہی جہاں ہمیشہ سے تھی۔ عین گروارجن اور مہاراجہ رنجیت

سنگھ کی سمادھیوں کے بیرون تقریباً دوسو برس قبل اسی مقام پر ایک نہایت غیر معمولی دنگل ہوا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ، جو خود بھی گھڑ سواری کا ماہر اور اس منصفانہ کھیل کو پسند کرتا تھا، اس وقت پنجاب کا حکمران تھا۔

یہ 1805ء کا سال تھا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ مہمانِ خصوصی تھا۔ ابتدائی ادوار کے بعد اوّل نمبر کے پہلوانوں کے جوڑ ہو رہے تھے کہ چودہ برس کا ایک نوجوان مجمع سے آگے بڑھا اور ایک ایسے پہلوان کو مقابلے کے لیے للکارا جو اس برس مقابلہ جیتنے والا لگتا تھا۔ مجمع نے اس کی خالص پنجابی للکار سے آسمان سر پر اٹھا لیا تو مہاراجہ نے پہلوان کو کہا کہ اس بگڑے بچے کو اچھی طرح سے سبق سکھا دے۔ مجمع کی ہنسی، ٹھٹھول میں کم عمر پہلوان نے کرتا اتارا، دھوتی کو باندھا اور اپنے سے دگنے قد کے پہلوان سے کُشتی لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔

چمپئن پہلوان نے نوجوان کو پکڑا تو اس سے پہلے کہ اسے پتہ چلتا کہ کیا ہو رہا ہے، نوجوان لڑکے نے چمپئن کو کندھے پر اٹھا کر زمین پر پٹک دیا۔ اس نے اس پر لعن طعن کی اور ایک طرف ہو گیا۔ غصے سے بھرا ہوا پہلوان زمین سے اٹھا اور نوجوان پہلوان کو گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ لیکن لڑکے نے بجلی کی طرح سرعت سے اس کی ٹانگوں میں سر دیا اور اسے اٹھا کر پھر زمین پر ایک طرف پٹک دیا۔ مجمع پاگل ہو گیا۔ مہاراجہ نے لڑکے کو حکم دیا کہ وہ باقی پہلوانوں سے باری باری کُشتی کرے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور کم سے کم وقت میں کُشتیاں جیت لیں۔

چاک و چوبند پنجابی بڑے رسان سے مہاراجہ کے پاس گیا اور بڑی دلیری سے اسے کہنے لگا۔ ''مہاراج! میں آپ کے چار بہترین پہلوانوں سے بیک وقت کُشتی لڑ سکتا ہوں۔'' چالاک حکمران بھلا ایسا پُرمسرت موقع ہاتھ سے کیوں جانے دیتا، کیونکہ اس کی خواہش تھی کہ مقابلہ ختم ہونے سے قبل لڑکے کا تکبر خاک میں ملنا چاہیے۔ چنانچہ چار بہترین پہلوانوں نے لڑکے کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ اس کے بعد جو بھی ہوا وہ تاریخ کا حصہ بن گیا، کیونکہ اس شخص کو حیران کن اٹھان ملی، جس کے نام سے آج بھی مائیں اپنے بچوں کو ڈراوا دیتی ہیں۔ اس قدر زیادہ اس شخص کا خوف تھا جس نے مجمع سے نکل کر ملک کے قوی ترین افراد کو مات دے دی تھی۔ چند لمحوں کے اندر اندر لڑکے نے چاروں پہلوانوں کو زمین دِکھلا دی تھی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کھڑا ہو گیا۔ لڑکے کو اپنے پاس بلایا اور اسے اپنا سب سے قیمتی ہیروں کا ہار انعام میں دے دیا۔ لڑکے کا نام ہری سنگھ تھا جو گوجرانوالہ سکرچاکیہ مثل کے سردار گردیال سنگھ کا بیٹا تھا اور اکیلا ہی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر لاہور کُشتیوں کے مقابلے دیکھنے چلا آیا تھا اور کُشتیوں کو دیکھتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ ان سب کو شکست دے سکتا ہے۔ مہاراجہ نے حکم دیا کہ ہری سنگھ اس کا ذاتی محافظ ہو گا، کیونکہ وہ اس کے باپ گردیال سنگھ سے بخوبی واقف تھا۔

چنانچہ ہری سنگھ لاہور آ گیا اور مہاراجہ کے ہاں رہنے لگا اور اس کے ہمراہ دوروں پر بھی جانے لگا۔ چند

مہینوں کے بعد مہاراجہ اور ہری سنگھ شکاری دورے پر جنگل میں گئے ہوئے تھے جو دریائے راوی کے کناروں پر بکثرت تھے۔ مہاراجہ اور ہری سنگھ درختوں کے درمیان سے گزر رہے تھے کہ ایک باگھ نمودار ہوا اور ہری سنگھ کے گھوڑے پر حملہ کر دیا۔ نوجوان ہری سنگھ زمین پر آن رہا تو باگھ اس پر جھپٹ پڑا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب نوجوان ہری سنگھ نے باگھ کو کُشتی کا ایک داؤ مار کر دور پھینک دیا اور پھر اپنی کمر سے خنجر نکالا اور بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ شیر کا پیٹ پھاڑ ڈالا اور اسے موقع پر ہی ہلاک کر دیا۔ لیکن اس پھرتیلی کوشش کے دوران ہی ہری سنگھ کا گھوڑا ہلاک ہو چکا تھا۔ ہری سنگھ مہاراجہ کو بھول کر اپنے گھوڑے کے پاس بیٹھ گیا اور رونے لگا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اسے اٹھایا اور اس سے اظہارِ ہمدردی کیا اور اسے ''نلوا'' یعنی شیر کو مارنے والا، کا خطاب دیا اور اسے اپنے بہترین دس گھوڑے عطا کر دیئے۔ اس نے اس نوجوان کو جرنیل کے عہدے پر فائز کر دیا اور اسے ایک نہایت اعلیٰ معیار کی ''شیر دل فوج'' تشکیل دینے کا کام سونپ دیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ہری سنگھ نلوا اور اس کے لاہوری شیر دلوں نے قصور کے ظالم پٹھانوں کو فتح کر کے، کشمیر کے ڈوگروں کو مطیع بنا کر، زمزمہ توپ، جو اَب عجائب گھر لاہور کے باہر نصب ہے، کو استعمال میں لا کر قلعہ ملتان کو فتح کر کے اور سب سے اہم یہ کہ صوبہ سرحد کے پٹھانوں پر فتح پا کر اپنا نام پیدا کر لیا۔ اس نے قلعہ جمرود تعمیر کرایا۔ اس کی اتنی دہشت تھی کہ آج بھی کابل سے اٹک تک جب مائیں اپنے بچوں کو ڈرانا چاہیں تو انہیں صرف ''ہریا راغلے'' کہنا ہوتا ہے، یعنی ہری آ رہا ہے۔ جمرود کے محاصرے کے دوران وہ زخمی ہو کر فوت ہو گیا۔ محاصرہ اس وقت کیا گیا جب پٹھانوں کو پتہ چلا کر ہری سنگھ شکار کرنے کے دوران ایک اچانک حملے میں زخمی ہونے کی وجہ سے انتقال کر چکا ہے۔ لیکن جب اس کے زندہ ہونے کے ثبوت کے طور پر اس کی لاش کو قلعہ کی دیوار سے دکھایا گیا کہ وہ صحیح سلامت ہے، تو پٹھان راہِ فرار اختیار کر گئے، لیکن ہری سنگھ مر چکا تھا۔ اس کی موت میں بھی دہشت کی حکمرانی تھی۔ آج بھی رنجیت سنگھ کی سمادھی کے بیرون کُشتیوں کے مقابلے دیکھتے ہوئے چودہ سالہ لڑکے کی روح کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دیکھتے ہیں اگلی چمپئن شپ لاہور کی وہ روایت جو اتنی پرانی ہے جتنا کہ زمانہ، کون جیتے گا؟

●○●○●○●

دینا ناتھ برہمن۔ باز ماندہ

پہلی مرتبہ جب میں نے یہ نام سنا تو اس وقت میں کالج کا طالب علم تھا اور بھاٹی دروازے کے ایک طعام خانے میں چائے پی رہا تھا۔ بوڑھے مالک نے ایک کنجوس گاہک کو بُرا بھلا کہتے ہوئے اسے ''دِینا ناتھ برہمن'' کہہ کر پکارا۔ یہ نام مجھے دلچسپ لگا کیونکہ یہ پورے پچیس برس میرے تحت الشعور سے چپکا رہا۔ یعنی پچھلے ہفتے تک جب میں اتفاقاً مسجد وزیر خان کے پاس سے گزر رہا تھا۔

اندرون شہر لاہور کے باسی اس نام کو دو شاندار حویلیوں، جو مسجد وزیر خان کی نکڑ کے قریب واقع ہیں، اور راوی کے کنارے اس کی سمادھی کے حوالے سے یاد کرتے ہیں۔ دو حویلیوں میں سے ایک ''حویلی دینا ناتھ'' اور دوسری ''حویلی دینا ناتھ راجہ کلانور'' کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔ پہلی حویلی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت میں اور دوسری برطانوی دورِ اقتدار میں، لیکن 1857ء سے پہلے، تعمیر ہوئی تھیں۔

وہ تاریخ میں اہم ہے کیونکہ وہ مہاراجہ کی نیابت پر مامور تین افراد، یعنی ایک مسلمان، ایک ہندو اور ایک سکھ، کی مجلسِ انتظامیہ کا ایک رکن تھا جو دسمبر 1846ء میں لاہور دربار کے معاملات چلانے کے لیے اور پنجاب پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے 1849ء میں مکمل تصرف میں آنے سے قبل، تشکیل دی گئی تھی۔ دوسرے دو ارکان فقیر الدین اور تیجا سنگھ تھے۔ دیوان دینا ناتھ اس مجلسِ انتظامیہ کا سربراہ تھا۔

لیکن یہ دینا ناتھ تھا کون؟ جس کا نام اس کی وفات کے 147 برس بعد بھی قدیم لاہور کی گلیوں میں استعمال ہو رہا تھا۔ 1807ء سے 1857ء تک کے پچاس برسوں پر تھوڑی سی تحقیق سے اس غیر معمولی شخص کے بارے میں دلچسپ حقائق سامنے آ گئے، جو لاہور پر تیس برس تک نہایت خاموشی، لیکن بڑی مستعدی سے، لاہور کے بہت سے پیش بین حکمرانوں، جیسا کہ وہ تھے، حکومت کرنے کے طرزِ طریق پر اثر انداز رہا۔ اس شخص کا کمال یہ تھا کہ اس نے فی الواقعی کسی شخص کو بھی اپنا دشمن نہ بنایا۔

دیوان دینا ناتھ ایک کشمیری پنڈت تھا جو 1815ء میں نقل مکانی کر کے لاہور آ گیا تھا۔ سکھ دربار میں

ایک فائق سرکاری منتظم اور دربار میں خاصے اثر انداز مشیر کی حیثیت سے پہچان رکھنے والا، کشمیری پنڈت بخت مل کا بیٹا تھا جو وادیٔ کشمیر میں افغان گورنروں کے استبدادانہ دورِ حکومت میں نقل مکانی کر کے دہلی چلا آیا تھا۔ وہ فوجی حساب داری اور اس کا شاہی مہر کے محافظ دیوان گنگا رام (اس کا سر گنگا رام سے کوئی واسطہ نہیں جو بہت بعد میں ہوا) سے قریبی تعلق تھا اور اسی کی معرفت لاہور آیا تھا۔

دیوان گنگا رام کی سفارش پر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے دینا ناتھ کو لاہور آنے کی دعوت دی اور اسے محکمہ فوجی حساب داری میں متسدی اور محرّر کی اسامی کی پیشکش کی۔ 1826ء میں جب دیوان گنگا رام کا انتقام ہو گیا تو اس کی جگہ دینا ناتھ فوجی حساب داری محکمہ کا سربراہ اور شاہی مہر کا محافظ تعینات ہو گیا۔ 1834ء میں جب دیوان بھوانی داس انتقال کر گیا تو مہاراجہ نے اسے دیوانی اور مالیاتی محکمہ کا بھی سربراہ بنا دیا اور 1838ء میں اسے دیوان کا اعزازی خطاب بھی عطا کیا۔ چنانچہ اپنی قابلیت اور سیاسی بصیرت کی بناء پر دینا ناتھ ریاست کے معاملات اور اثر رسوخ میں بلند ترین مقام پر پہنچ گیا۔

دانشور لیپل گرفن اسے ''پنجاب کا ٹیلی رنیڈ'' کہا کرتا تھا۔ دیوان دینا ناتھ کی خصوصی قابلیت یہ تھی کہ اسے علم تھا کہ اپنی جاہ طلبی کو کیسے قابو میں رکھنا ہے۔ اسے ہر چہرہ اور نام یاد رہتا تھا اور وہ ہر ایک سے اس کی فلاح و بہبود میں گہری دلچسپی کا اظہار کرتا رہتا تھا۔

دیوان دینا ناتھ کی سب سے ممتاز قابلیت یہ تھی کہ وہ ہمیشہ تشہیر سے انتہائی گریز کرتا تھا، لیکن اس کے باوجود اس کی ریاستی امور، خاص طور پر مالی امور، پر آہنی گرفت تھی۔ ساری فوج رقوم کے لیے اسی پر انحصار کرتی تھی۔ اسی لیے چند عالم فاضل حضرات اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعد وہی لاہور دربار کا غالباً سب سے زیادہ ذی اقتدار شخص تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے پُرآشوب ایّام میں اس نے رانی چاند کور یا کنور شیر سنگھ میں سے کسی ایک کا بھی ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ توازنِ طاقت کا نہایت خطرناک کام تھا، لیکن اس نے بڑی مہارت سے اسے سرانجام دیا تھا اور حقیقی مالیاتی اقتدار کو کبھی اپنے ہاتھوں سے پھسلنے نہ دیا۔ تخت نشین ہو کر شیر سنگھ نے اس پر بھرپور اعتماد کا اظہار کر دیا۔ دینا ناتھ، مہاراجہ ہری سنگھ اور جواہر سنگھ دونوں کے ادوارِ حکومت میں بھی دربار میں اپنے عہدے پر قائم رہا اور مہارانی جنداں کور کی نیابت کی مدت کے دوران بھی رہا۔

پورے دس برس اس نے پنجاب کے خزانے پر تصرف رکھا اور یہ فرض اس نے انتہائی ایمانداری سے سرانجام دیا۔ ایک مقولہ جو اس سے منسوب ہے، یوں ہے: ''طمع مدام بڑھتی رہتی ہے، حتیٰ کہ طاقتور ترین شخص کو زوال آ جاتا ہے۔ اس لیے لالچ کو لگام دو اور سادگی کی شانتی کے مزے اُڑاؤ۔'' اس مقولے ہی سے بلا کام و کاست اس شخص کے بارے میں پتہ چل جاتا ہے جسے بعد ازاں انگریزوں نے بھی ہر طرح کا اعزاز بخشا۔

1845-46ء کی انگریزوں اور سکھوں کے مابین جنگ کے بعد انگریزوں نے اسے نابالغ بادشاہ، مہاراجہ دلیپ سنگھ کے لیے لاہور میں قائم کردہ مجلس نیابت کا رکن نامزد کر دیا۔ نومبر 1849ء میں اسے ''راجہ کلانور'' کا خطاب اور بیس ہزار روپے سالانہ کی جاگیر عطا کی گئی۔ جب 1849ء میں پورا پنجاب انگریزوں کے تصرف میں آ گیا تو دیوان دینا ناتھ انگریزوں کے ماتحت کام کرنے لگا۔ انہوں نے تقریباً پچاس ہزار سالانہ مالیت کی جاگیر کی توثیق کر دی۔

معاہدہ لاہور کی رُو سے سر ہنری لارنس لاہور میں برطانوی حکومت کا نمائندہ (ریذیڈنٹ) مقرر ہوا۔ اس معاہدے کے چند مہینوں بعد یہ دینا ناتھ ہی تھا جس نے فریبِ نظر سے آزادرانی جنداں اور لال سنگھ کو انگریزوں کے اصل ارادوں سے آگاہ کیا۔ ایک طرح سے وہی تھا جس نے سکھ حکمرانوں کو بتا دیا تھا کہ انگریزوں کا اب وہیں قیام کا ارادہ تھا۔

جب برطانوی نمائندۂ لاہور نے لاہور دربار کو کشمیر گلاب سنگھ کے حوالے کرنے کا حکم دیا تو لال سنگھ نے بالواسطہ کشمیر کے دربار کے مسلمان گورنر امام الدین کی مزاحمت کرنے پر حوصلہ افزائی کی۔ لال سنگھ کو برطانوی نمائندہ کے خلاف سازش کرنے کے جرم پر ریاست بدر کر دیا گیا۔ دیوان دینا ناتھ سارے معاملے سے لاتعلق رہا کیونکہ تکنیکی لحاظ سے ابھی خاتمہ بالخیر نہیں ہوا تھا۔

پنڈت دینا ناتھ، جواب راجہ کلانور کے عہدے پر بھی فائز تھا، کے برتے پر کشمیر سے سینکڑوں پنڈت نقل مکانی کر کے لاہور آ گئے۔ وہ ان تمام تازہ واردان کو مجتمع کرنے کا عامل بن گیا اور مدام کوششوں سے انہیں اثر انداز پیشوں سے منسلک کرنے میں مدد دی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لاہور میں پنڈت کالونیاں بن گئیں، ان میں سب سے معروف کرشن نگر اور سنت نگر ہیں۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ راجہ دینا ناتھ اور دیگر ممتاز پنڈت حضرات انگریز فاتحین کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی ان کی کھلے دل سے حوصلہ افزائی کی اور انہیں بے شمار ذمہ دارانہ اور باعزت مناصب پر فائز کیا جن پر اس سے قبل کبھی کسی ہندوستانی کو فائز نہیں کیا گیا تھا۔ تب تک بہت کم کشمیری پنڈت لاہور میں رہائش پذیر تھے۔ دیوان دینا ناتھ کا فروری 1857ء میں لاہور میں، جنگِ آزادی پھوٹ پڑنے اور ناکام ہونے سے ذرا پہلے، انتقال ہو گیا۔ اس کا کریا کرم موری دروازے کے بیرون ہوا اور اس کی خاک کو دریائے راوی کے سپرد کر دیا گیا۔

●○●○●○●

ڈاکٹر ہرلان کی جادوئی دوا

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے چالیس سالہ طویل دورِ حکومت میں جو تمام غیر ملکی مہم جُو لاہور آئے، ان میں بلاشبہ سب سے رنگارنگ شخصیت ایک پُراسرار امریکی ڈاکٹر کی تھی، جس کا نام جوسیا ہرلان تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے زیرک مہاراجہ کو اس کے تمام امراض کے علاج کے لیے جادوئی دوا دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔

جس وقت ''جادوئی دوا'' کی پیشکش کی گئی اس وقت تک ڈاکٹر ہرلان لاہور کی سیاست اور سازشوں میں ناموری حاصل کر چکا تھا۔ وہ مہاراجہ کے نہایت قابلِ اعتماد وزیر فقیر عزیز الدین کا قریبی دوست تھا اور فقیر خاندان ہی کی ملکیت کے ایک گھر میں رہائش پذیر تھا۔ اگر آپ کو راستہ آتا ہے تو بھاٹی دروازے کے اندر دروا قع تحصیل بازار اور بازارِ حکیماں کی نکڑ پر آسانی سے ایک پرانا مکان نظر آ جائے گا، جس پر برطانوی دور کی، فقیر خاندان میں سے کسی فرد کے نام کی تختی نصب ہے۔ اس گھر میں ڈاکٹر ہرلان رہتا تھا اور بہت جلد اس کی پریکٹس چمک اٹھی تھی۔

سکھ حکمران کے ڈاکٹر ہرلان کے ساتھ محبت اور نفرت کے ملے جلے تعلقات تھے جو اس دور میں واحد شخص تھا، جو مہاراجہ کو مساوی سطح پر ملا کرتا تھا۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ مغرور تھا۔ جب مہاراجہ نے اس سے اس سینہ زوری کے متعلق دریافت کیا تو ڈاکٹر ہرلان نے جواب دیا۔ ''کیونکہ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ہوں اور وہ بھی، پنسلونیا ریاست سے۔''

1824ء میں ڈاکٹر ہرلان بنگال فوج میں بھرتی ہوا کیونکہ برمی جنگ کے دوران سرجن ڈاکٹروں کی قلت ہو گئی تھی۔ یہ امریکن وہاں کیونکر اور کیسے پہنچا، اس کا کسی کو علم نہیں۔ اس نے 1823ء میں رنگون میں خدمات سرانجام دیں۔ پھر کمال میں ایک دیسی انفنٹری رجمنٹ میں کام کیا۔ 1826ء میں وہ لدھیانہ میں چھٹی پر تھا کہ اسے اطلاع دی گئی کہ برطانوی فوج کے ایک حکم کی رُو سے تمام عارضی سرجنوں کو برخواست کر دیا گیا تھا۔

1827ء میں ہرلان نے برطانوی حکام سے ستلج عبور کرنے کی اجازت طلب کی جو اسے دے دی

گئی۔ وہ مبینہ طور پر زمینی راستے سے سینٹ پیٹر برگ جانا چاہتا تھا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے آزاد شہری کے تفاخر سے درحقیقت وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج میں ملازمت کا خواہاں تھا، لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی حدودِ سلطنت میں ہرلان کو داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔

چنانچہ ہرلان نے ستمبر 1827ء میں بہاولپور، قندہار اور غزنی کے راستے کابل جانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے بنیادی طور پر شجاع شاہ کے جاسوس کی حیثیت سے کام کیا تھا جو افغانستان کا جلاوطن حکمران تھا اور برطانیہ کے زیرِ تسلط لدھیانہ میں رہائش پذیر تھا۔ ہرلان کا اصل مقصد کوشش کر کے ولیم مُور کرافٹ اور جارج ٹریبک کے کاغذات کی بازیابی تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے جاسوسی کرتے ہوئے شمالی افغانستان میں مزارِ شریف کے نزدیک قتل کر دیئے گئے تھے۔

وہاں امیر کابل دوست محمد خان کے سوتیلے بھائی، جبار خان نے جو قزلباش شیعہ تھا، ان کا استقبال کیا۔ جبار خان لاہور فوج میں تعینات فرانسیسی افسروں کا قریبی دوست تھا اور جو کچھ ہرلان کابل میں کرتا اس کی اطلاع یقیناً لاہور میں جرنیل آلارڈ کو ہو جاتی تھی اور یوں مہاراجہ رنجیت سنگھ کو بھی۔ ان کے ذریعے ہرلان نے لاہور جانے کا راستہ ہموار کر لیا۔ 1829ء کے اوائل میں ڈاکٹر ہرلان کابل سے روانہ ہو کر لاہور پہنچ گیا جہاں اس نے بازار حکیماں میں اپنی ڈاکٹری کی دکان قائم کر لی۔ آج بھی چند قدیمی رہائشی اس مکان کو ''امریکی حکیم دی ہٹی'' کے نام سے پکارتے ہیں۔

رنجیت سنگھ نے امریکی ڈاکٹر پر کڑی نظر رکھی۔ ایک روز اس نے اسے طلب کیا اور اسے او ایم ایس بریگیڈ کی کمان سنبھالنے کی پیشکش کی کیونکہ فرانسیسی کمانڈار فوت ہو گیا تھا۔ یہ اعلیٰ درجے کی رجمنٹیں راوی کے دائیں کنارے شاہدرہ کے مقام پر تعینات تھیں۔ ہرلان نے انکار کر دیا یہ کہہ کر کہ وہ ڈاکٹر ہے جنگجو فوجی نہیں اور یہ کہ وہ جلد امریکہ واپس جانے والا تھا۔ مہاراجہ نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا۔

مہاراجہ کا یہ احساس کہ وہ اسے فوجی افسر بننے پر آمادہ نہیں کر پایا، اُسے دسمبر 1829ء میں جموں اور کانگڑہ کے مابین دو راجپوت ریاستوں، نور پور اور جسروٹا، کا گورنر مقرر کر دیا۔ مارچ 1831ء کو وہ لاہور واپس آ گیا۔ مہاراجہ نے اس کے خلاف بڑھتی ہوئی شکایتوں کے پیشِ نظر اسے لاہور واپس بلا لیا تھا۔ لاہور میں وہ جنرل الارڈ کے پاس رہائش پذیر ہوا جس نے اسے حفاظت کی پیشکش کی تھی۔

مئی 1932ء میں رنجیت سنگھ نے اسے گجرات کا گورنر مقرر کر دیا اور اسے ایک خلعت (عزت دار لباس) عطا کی۔ اسے ایک ہاتھی بھی دیا گیا اور حکومت کرنے کے لیے ضروری حاکمیت کی سند بھی عطا کی۔ چند ماہ بعد ہی غضبناک زمینداروں کی شکایات پر اسے واپس لاہور طلب کر لیا گیا۔

1833-34ء میں اپنے کھوئے ہوئے تخت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے شجاع شاہ نے اپنی

قندہار کی تباہ کن مہم کا آغاز کر دیا۔ اس لڑائی سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو عسکری حریف کو مغالطے میں ڈالنے کی چال چلنے کا موقع مل گیا اور رنجیت سنگھ نے ہری سنگھ نلوا اور جرنیل کورٹ کو ان کے بہترین بریگیڈروں کے ہمراہ روانہ کر دیا۔ انہوں نے نہایت سُرعت اقدام سے پشاور شہر اور درہ خیبر تک صوبے کو دوبارہ فتح کر لیا۔ محمود غزنوی نے 1001-1005ء میں پشاور کو پنجاب سے الگ کر کے اپنی عملداری میں شامل کر لیا تھا۔

دوست محمد خان نے اس اقدام کے خلاف احتجاج کیا اور 1833ء میں اس نے کافر سکھوں کے خلاف جہاد کے ذریعے پشاور پر قبضے کے لیے اوّلیں کوشش کی۔ برطانوی جاسوسوں نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ اگر رنجیت سنگھ کی افواج کو شکست ہو جائے تو پنجاب کی مسلم آبادی سکھوں کے خلاف بغاوت کر دے گی۔ اس ممکنہ بات کو سمجھتے ہوئے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے درہ خیبر کے داخلی راستوں کے گرد گھیرا ڈالنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کی حکمت عملی تھی کہ حملہ آور افغانیوں کو خیبر کے راستے سے داخل ہونے دیا جائے اور پھر گھیرا ڈال کر ان کا مکمل صفایا کر دیا جائے۔ اس حکمتِ عملی پر عملدرآمد کے لیے اسے دوست محمد خان کو کابل میں مصروف رکھنے کے منصوبے کی ضرورت تھی۔ شاطر رنجیت سنگھ نے یہ طے کیا کہ خان کے پاس ایک وفد بھیجا جائے۔ اس کام کے لیے اس نے اپنے پُراعتماد وزیرِ خارجہ فقیر سیّد عزیز الدین اور اپنے پُراسرار امریکی گورنر ڈاکٹر جوسیا ہرلان کا انتخاب کیا۔ یہ 18 رمئی 1835ء کا ذکر ہے۔

اس تمام عرصے میں رنجیت سنگھ پھندے کو تنگ کرتا رہا۔ یکا یک دوست محمد خان کو اطلاع ملی کہ افغان فوج کو تقریباً چاروں طرف سے مکمل طور پر گھیر لیا گیا ہے۔ دوست محمد خان نے حکم دیا کہ فقیر عزیز الدین اور جوسیا ہرلان کو اس کے بھائی سلطان محمد خان کی تحویل میں دے دیا جائے تا کہ وہ انہیں یرغمال بنا کر رکھے۔ سلطان محمد خان پہلے ہی ڈاکٹر ہرلان کی تنخواہ پر کام کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے بڑی سادگی سے انہیں واپس پنجاب بھیج دیا۔ شاطر جاسوس نے ترپ کا پتہ پھینک دیا تھا۔

اپریل 1836ء میں جب مہاراجہ رنجیت سنگھ روز بروز بیمار رہنے لگا تو ہرلان نے اس کے لیے دوائی تیار کرنے کا وعدہ کیا جس کی قیمت ایک لاکھ بتائی اور یہ قیمت پیشگی ادا کرنا تھی، کیونکہ اسے مہاراجہ پر اعتبار نہیں تھا۔ اس فقرے سے مہاراجہ آگ بگولا ہو گیا۔ ڈاکٹر ہرلان کو اسی وقت معطل کر دیا گیا، اس کے واجبات ادا کر دیئے گئے اور اسے ستلج کے پار انگریزی حدود میں دھکیل دیا گیا۔

لدھیانہ میں اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنی خواہش سے آگاہ کیا کہ وہ کابل میں دوست محمد خان کی ملازمت اختیار کرنا چاہتا ہے۔ کمپنی کے ریکارڈ کے مطابق ''اس کی اعلانیہ نیت یہ ہے کہ وہ پشاور پر فوج سے حملہ آور ہو گا تا کہ اپنے سابق آقا رنجیت سنگھ کے ہاتھوں کھائے گئے زخموں کا بدلہ لے سکے۔'' ڈاکٹر ہرلان سفر طے کر کے کابل پہنچ گیا، جہاں اس نے سیکنڈ ریگولر انفنٹری رجمنٹ کی تربیت کی۔ راتوں رات امریکی ڈاکٹر ایک فوجی

شخصیت بن گیا تھا۔اس نے 1837ء میں پشاور پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے جنگ میں باقاعدہ حصہ لیا جوہری سنگھ نلوا کے غیر معمولی کارناموں کی وجہ سے محفوظ رہا۔نلوا جمرود کے مقام پر مہلک طور پر زخمی ہو گیا۔

جمرود کے بعد ہرلان 1839ء کے موسم بہار میں کابل واپس چلا گیا عین اس وقت افغانیوں اور انگریزوں کی پہلی جنگ کے انگریزی ہراوّل دستے سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ستمبر 1839ء میں جب کابل فتح ہو گیا تو ڈاکٹر ہرلان کو برطانوی افواج کے ساتھ لدھیانہ واپس بھیج دیا گیا۔اس کا تبادلہ کلکتہ کر دیا گیا اور پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کے خرچ پر امریکہ بھیج دیا گیا۔

ڈاکٹر ہرلان نے اپنے آئندہ تیس برس امریکہ میں بسر کیے۔امریکی سول جنگ 1861ء میں اس نے یونین فوج کے لیے ایک رجمنٹ تیار کی، جسے ہرلان کا گھڑ سوار دستہ کہا جاتا تھا۔بعد ازاں اسے ''ایلیونتھ کیولری'' کہا جانے لگا۔اس نے پوٹومیک کی فوج میں بطور کرنل خدمات سرانجام دیں، حتیٰ کہ خرابیٔ صحت کی بناء پر ریٹائر ہو گیا۔ہرلان سان فرانسسکو منتقل ہو گیا جہاں ایک بار پھر اس نے بطور فزیشن پریکٹس شروع کر دی۔اس کا وہیں اکتوبر 1871ء کو انتقال ہوا۔

●○●○●○●

لاہور بھنگیوں کی دسترس سے کیسے نکل گیا

لاہور پر بڑے بڑے عجیب وغریب لوگ حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ اصل راجپوت راجے جو سرتاپا بہادر اور سجیع تھے۔ لوٹ مار کرنے والے افغان گھڑسوار، مغلیہ حملہ آور، دیسی سکھ اور بالکل اجنبی ولایتی حکمران، تھوڑے عرصے کے لیے لاہور پر ایک جنس پرست عورت اور ایک عاقل خواجہ سرا نے بھی حکومت کی۔

لیکن یقیناً کوئی بھی حکمران اس قدر وحشی نہ تھا۔ جتنے تین بھنگی سردار جو 1799ء تک مسلسل دس برس لاہور کے حکمران رہے۔ انجام کار ساری آبادی نے سازش کر کے انہیں نکال باہر پھینکا۔ بھنگی حکمران چیت سنگھ، صاحب سنگھ اور مُہر سنگھ تھے اور وہ تینوں مل جل کر حکومت کرتے تھے۔ اپنے اپنے اثر ورسوخ کے حساب سے انہوں نے لاہور کو تین منطقوں میں بانٹ رکھا تھا جہاں وہ اکٹھے حکومت کرتے تھے۔ وہ کرتے صرف یہ تھے کہ بھنگ پیتے اور ایسی ایسی شوقینیوں میں مگن رہتے جو کبھی ان سے پہلے اس شہر میں اور نہ کبھی بعد میں دیکھنے کو ملیں۔ بھنگ کے لیے ان کی ترجیح کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ انہیں بھنگی کہنے لگے۔ ان کا قطعاً کوئی تعلق گجرات کے بھنگی قبیلے سے نہیں تھا اگرچہ وہ بھی کم غارت گر نہ تھے اور ملتان سے دہلی تک ہر ایک کے ناک میں دَم کیے رکھتے تھے۔

یہ تینوں بھنگی رنجیت سنگھ سے پہلے لاہور پر حکمرانی کرتے تھے۔ بالآخر لاہور کے اعلیٰ رُتبے کے حامل افراد، لاہور کے ارائیں میاں صاحبان نے رنجیت سنگھ کو باقاعدہ دعوت بھیجی کہ وہ حملہ آور ہو اور اپنی حکومت قائم کر لے۔ اس نے یہ دعوت بخوشی قبول کر لی۔ بھنگی سردار پکے شرابی تھے اور عورت باز، وہ ہر کس وناکس کو، جن پر بھی ان کا ہاتھ پڑ جاتا، لوٹ لیتے تھے۔ وہ بھنگ پینے کے رسیا تھے اور ایسا کرنے کے بعد وہ کئی کئی روز مسلسل سوتے رہتے۔ تینوں حکمران اپنے مشاغل میں اکٹھے مشغول رہتے تھے۔ چونکہ ان کو پتہ ہی نہیں تھا کہ حکومت کیسے کی جاتی ہے اس لیے انہوں نے ریاستی نظام لاہور کے دو میاں صاحبان میاں عاشق محمد اور میاں محکم دین، کے سپرد کر رکھا تھا۔ دونوں میاں صاحبان، بھنگی سرداروں کی نہایت وفاداری سے خدمت بجالاتے رہے اور کوشش کر کے لاہور کے اندرونِ شہر کے باسیوں کو بھنگیوں کی زیادتیوں سے اور ان کے اجڈ سکھ سپاہیوں سے جہاں تک ممکن ہوا تحفظ

دیتے رہے۔

لیکن پھر پانسہ پلٹ گیا اور بدتر صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ میاں عاشق محمد نے ایک اور متمول ارائیں میاں بدرالدین سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ بھنگی سرداروں نے ایک توجیہہ کے مطابق یہ فیصلہ دیا کہ چونکہ ان سے اس شادی کے بارے میں مشورہ نہیں کیا گیا، لہٰذا وہ بدسلوکی کے مرتکب ہوئے تھے۔ ایک اور توجیہہ کے مطابق سردار مُہر سنگھ خود اس جوان لڑکی سے شادی کا خواہاں تھا اور ایک اور توجیہہ کے مطابق لاہور کے ساہوکار کھتری بدرالدین کو پسند نہیں کرتے تھے، کیونکہ وہ اُن سے سُود پر قرض لینے کے سخت خلاف تھا اور بھنگیوں نے اندرون شہر کی تقریباً ہر جائیداد رہن رکھ کر قرض لے رکھا تھا۔ ایک ایسا مرحلہ آ چکا تھا کہ ساہوکار کھتریوں کے پاس حقیقتاً لاہور کی تقریباً ساری جائیداد رہن پڑی تھی۔ اس سے اچھا خاصا تناؤ پیدا ہو گیا تھا کیونکہ کھتریوں نے ریاستی معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی تھی۔ آخر کار آبادی کے ایک معتدبہ حصے میں بغاوت کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے اور وحشی بھنگی سپاہیوں نے سرکردہ منحرف گروہ کے خاندانوں کو آزار پہنچانا شروع کر دیا۔ بالآخر اندرونِ شہر کے پانچ مسلمان سرکردہ افراد، دو سکھ سردار اور بہت سے ہندو صاحبانِ علم نے رنجیت سنگھ کو لاہور پر قبضہ کرنے کی دعوت بھجوا دی۔ انہوں نے اُسے اچھی خاصی فوجی معلومات فراہم کیں کہ حملہ کس وقت کرنا اور کون کون سے کمزور پہلو تھے۔ شہر کے اندر سے بھی شہر پر قبضے کا منصوبہ تیار کیا گیا جس پر اس وقت عملدرآمد ہونا تھا جب ابھرتے ہوئے سکھ سردار نے شہر کی فصیل توڑ کر اندر داخل ہونا تھا۔

لاہور کے مسلمان، جو اس وقت اقلیت میں تھے، سرکردہ افراد نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی آمد پر جشن منایا۔ جواباً سکھ حکمران نے بھی یہ طے کیا کہ وہ سب سے پہلے بادشاہی مسجد جائے گا۔ اس اقدام سے اسے بے شمار فائدے پہنچے۔ بعدازاں اس نے انہی لوگوں سے اپنے آپ کو ''مہاراجہ'' کہلانے کا اعلان کرایا۔ وہ ٹھیک وقت پر لاہور شہر میں داخل ہوا یعنی دسویں محرم، 7 رجولائی 1799ء۔ یہاں صرف ایک دلچسپ مشاہدہ پیشِ خدمت ہے۔ رنجیت سنگھ کی فوج نے دو اطراف سے شہر پر حملہ کیا۔ لوہاری دروازے سے رنجیت سنگھ خود داخل ہوا جبکہ اس سے ذرا قبل اس کی بہترین حملہ آور سپاہ نے دہلی دروازے سے یلغار کی، جس کی کمان ایک غیر معمولی بہادر عورت رانی سدا کور کر رہی تھی، جو نہایت خوبصورت، تلوار کی دھنی عورت تھی اور جس کی قیادت مثالی تھی۔

رنجیت سنگھ کی زیادہ تر فوج لوہاری دروازے پہنچی اور دسویں محرم کی رات کو بیرونی دیوار کے ایک حصے کو، موری دروازے کے نزدیک، بارود سے اڑا کر توڑ ڈالا۔ شہر کے اندر فوجوں نے فوراً لوہاری دروازے کے محافظوں پر قابو پا لیا اور یوں سکھ سپاہ بغیر لڑائی کے اندر داخل ہو گئی۔ اسی لمحے رانی سدا کور اور اس کی حملہ آور سپاہ دہلی دروازے کے مسلمانوں کی مدد سے دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو گئی اور دروازہ کھول دیا۔ چنانچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوجیں بیک وقت جنوب اور مشرق سے شہر میں داخل ہو گئیں۔ چند ایک سپاہی جو دیوار کی حفاظت پر

مامور تھے قلعہ لاہور کی طرف بھاگ گئے اور حضوری باغ میں جمع ہو گئے۔ شہر کے روندے جانے کی خبر سن کر صاحب سنگھ اور مہر سنگھ نے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا اور چیت سنگھ کو اپنے علاقے کے دفاع کے لیے چھوڑ گئے۔ چیت سنگھ کے تقریباً پانچ سو سپاہیوں نے جب دیکھا کہ لڑنا بے سود ہے تو انہوں نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کیا، جبکہ چیت سنگھ بھنگی کو راوی کے پار فرار ہونے دیا گیا۔

چنانچہ لاہور کے مسلمانوں، بلکہ شہر کے ارائیں میاں صاحبان کی مدد سے مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنی پنجابی سلطنت اور بعد ازاں قوی ترین پنجابی فوج قائم کرنے کے قابل ہو گیا۔ کھتریوں کو نقصان اٹھانا پڑا کیونکہ تمام قرضے کالعدم قرار دے دیے گئے اور تمام صداقت نامے ریاست نے اپنی تحویل میں لے لیے۔ ارائیں صاحبان کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بڑی فراست سے ایک طرف کر دیا جیسا کہ ہر تختہ الٹنے والوں کے مددگاروں کے ساتھ آج تک ہوتا آیا ہے۔ رنجیت سنگھ نے اپنے امورِ سلطنت کے انتظام وانصرام کے لیے لاہور ہی کے دیگر خاندان، بازارِ حکیماں کے فقیر خاندان، کا انتخاب کیا۔

نیا مہاراجہ بھنگیوں کی حرکات کے بالکل الٹ سمت کا ثابت ہوا۔ ان کی ترجیح بالترتیب عورتیں، گھوڑے اور حاکمیت تھی۔ مہاراجہ نے اس ترتیب کو الٹ دیا اور اس کا باقاعدہ اعلان بھی کرا دیا۔ اس کے معاملات کے طریق کار کی ترجیح درست ثابت ہوئی۔ حتمی تجزیئے میں بھنگیوں نے انگریزوں کے جاسوس بن کر نمایاں کارکردگی دکھائی اور 1839ء میں رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھ سرداروں کے مابین پھوٹ ڈلوا دی۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ آج کل بھی ہو رہا ہے کہ کون بادشاہ ہے اور کون بادشاہ گر۔ لگتا ہے ان کی درمیانی لکیر نہایت باریک ہے۔

●○●○●○●

تین حکیموں کا تیس سالہ دورِ حکومت

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے 1799ء میں برسرِ اقتدار آنے سے قبل ایک تیس برس کا عہد ہے جسے تین حکیموں کا دورِ حکومت کہتے ہیں۔ یہ تین حکیم کون تھے اور ان کا لاہور کی تاریخ میں کیا کردار رہا ہے؟

تین حکیم بنیادی طور پر تین سکھ سردار تھے جنہوں نے لاہور میں قیام پذیر ہو کر اشتراکِ باہمی سے لاہور پر ایک انوکھے طرز سے سہ فریقی حکومت کی کہ ان کی بوالعجبیاں لاہور کی لوک کہانیوں کا حصہ بن گئیں۔ میری تحقیقی چھان پھٹک 2005ء میں شروع ہوئی جب لاہور کے ایک نواحی علاقے میں گرد اور گرمی سے بے حال ایک گلی میں سے گزرتے ہوئے میں نے ایک سبزی فروش کو اپنا سودا بیچتے ہوئے یہ صدا لگاتے ہوئے سنا۔ ''نہ لہنا سنگھ، نہ ڈیہنا سنگھ، ٹماٹر اصلی گجر سنگھ۔'' میرے چلتے ہوئے قدم رک گئے۔ کیا مزے کا جملہ تھا جو مجھے آٹھ برس قبل سننے کو ملا تھا۔ میں نے اس بوڑھے شخص سے پوچھا کہ اس نے سبزیاں فروخت کرنے کا یہ پیغام کہاں سے سنا تھا؟ تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ شالامار لاہور کے ایک قدیمی آرائیں خاندان کا ہے، جو پچھلی پانچ نسلوں سے سبزیاں بیچ رہے ہیں اور یہ جملہ خاندان میں عام مستعمل ہے۔ ''لیکن اس کا مطلب کیا ہے؟'' میں نے پوچھا، تو اس نے کہا۔ ''مجھے نہیں پتہ!''

جو لفظ یا جملے ہمیں ورثے میں ملتے ہیں ہمیں چاہیے کہ ہم ان کی تفتیش کریں کیونکہ یہ ہماری تاریخ کا حصہ ہوتے ہیں۔ آیئے ہم اس دور میں چلیں جب احمد شاہ ابدالی 67-1738ء اپنے تیس سالہ دورِ حکومت میں لاہور پر نو بار حملہ آور ہوا اور قبضہ کیا اور ہر بار غارت گری اور لوٹ مار کی اور جو عورتوں کی عصمت دری کی اور قتل کیے ان کا ذکر ہی نہ کریں کیونکہ ہر حملے میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔

ہر حملے میں ابدالی کی گرفت ڈھیلی ہوتی گئی کیونکہ اس کے اپنے دارالحکومت ہی کو خطرہ درپیش ہو گیا جس پر اس کا انحصار تھا۔ اس نے لاہور کو ایک بھنگی سردار لہنا سنگھ کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا، لیکن لہنا کوئی احمق نہیں تھا۔ اس نے لاہور کے اردگرد کے علاقے کو محفوظ رکھنے کے لیے دو اور سکھ سرداروں کو بھی شریکِ اقتدار کر

لیا۔ چنانچہ لہنا سنگھ، صوبہ سنگھ اور گجر سنگھ کی سہ فریقی شراکت نے لاہور اور اس کے گرد و نواح پر اقتدار قائم کر لیا۔ تیس برس تک انہوں نے عظیم ترین حکومت کی اور افغان حملہ آوروں اور ان کی اولاد کو اپنی عملداری سے دُور رکھنے کے لیے سالانہ خراج ادا کرتے رہے۔

قلعہ لاہور، اندرون شہر اور اس کے دروازے، لہنا سنگھ کے حصے میں آئے۔ وہ تمام تر مقاصد کے لیے لاہور کا گورنر تھا اور اسی حیثیت سے اس کی شناخت کی جاتی تھی۔ امرتسر اور لاہور یا یوں کہیے شالامار باغ اور لاہور کا درمیانی علاقہ گجر سنگھ کے حصے میں آیا۔ اس نے اپنے لیے ایک چھوٹا سا قلعہ تعمیر کیا جس کا نام ''قلعہ گجر سنگھ'' رکھا۔ آج بھی اس قدیمی قلعے کی چار دیواریں نکلسن روڈ اور ایمپریس روڈ کے درمیان ایک گلی میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ آج بھی قلعہ گجر سنگھ ہی کہلاتا ہے۔ صوبہ سنگھ کے حصے میں اندرون شہر کا جنوبی علاقہ آیا اور اس نے نواں کوٹ میں زبیدہ بیگم کے باغ میں قیام کیا جہاں اس نے بھی اپنے لیے ایک چھوٹا سا قلعہ بنا لیا۔ چنانچہ ان تین سرداروں نے بڑے سکون سے تیس برس تک حکومت کی اور ان برسوں میں ان کی بوالعجبیاں بہت سے سکھوں کے لطیفوں کا ہدف بن گئیں جو ہمیں آج بھی یاد ہیں۔ لیکن وہ ''تین حکیم'' کیوں کہلاتے تھے؟ تینوں سردار آپس میں شیر و شکر رہتے تھے اور اکثر عیش و عشرت کی محفلیں منعقد کرتے تھے جن میں رقاصائیں، یا انگریزوں کی زبان میں ''نوچ گرلز'' ان کا دل بہلاتی تھیں۔ ان محفلوں میں افیم کی تمباکو نوشی عام تھی۔ جب ان سے دریافت کیا جاتا کہ وہ افیم کیوں استعمال کرتے ہیں تو وہ ہنس کر ٹال دیتے تھے اور کہتے تھے کہ حکیموں نے اسے بطور دوا تجویز کیا ہے۔ چنانچہ لوگ انہیں تین حکیم کہنے لگے اور پھر ان کا یہی نام پڑ گیا۔

تینوں سرداروں نے افغانیوں سے تحفظ کے لیے بھاری رقوم کی ادائیگی کے بہانے لوگوں پر بھاری ٹیکس عائد کر دیئے۔ اس طریقِ عمل سے وہ پنجاب کے سارے خالصہ مثلوں میں متمول ترین سکھ سردار ہو گئے۔ ان کی افواج جلد ہی عوام الناس پر زیادتیوں کی وجہ سے مشہور ہو گئیں اور جلد ہی دیگر سکھوں نے ان کا تخت الٹنے کا منصوبہ تیار کرنا شروع کر دیا۔ لیکن دیگر سکھوں کی نسبت لاہور کی دولت افغانیوں کے لیے بھی باعثِ کشش ہونے لگی اور انہوں نے مزید بھاری محافظی معاوضے کا مطالبہ کر دیا۔ تینوں سرداروں نے اسے غربت کی بنیاد پر مسترد کر دیا اور انہیں دوبارہ حملہ آوری کے لیے یہ عذر کافی تھا۔

1797ء میں احمد شاہ ابدالی کے پوتے شاہ زمان نے لاہور پر قبضے کی غرض سے ایک بہت بڑی فوج تیار کی، لیکن وہ ناکام رہا اور اس طریقِ عمل میں اس کی چند بھاری توپیں دریائے جہلم میں گم ہو گئیں۔ اس مرحلے پر رنجیت سنگھ، جو گوجرانوالہ کی سکر چکریہ مثل کے سربراہ مہا سنگھ کا بیٹا تھا، افغانیوں کی مدد کو بڑھا۔ نوجوان شاطر سردار نے اپنے بڑوں کے مشورے کے برخلاف، لیکن اپنی ساس کے کہنے پر، اپنی فوجوں کے ذریعے افغانیوں کی بیس توپوں میں سے آٹھ توپیں دریائے جہلم سے نکال لیں اور انہیں بہترین حالت میں کابل واپس بھجوا دیا۔ اس

سے کابل دربار خوش ہو گیا اور فوراً رنجیت سنگھ کو لاہور کا گورنر ہونے کا پروانۂ اجازت دے دیا۔ اس وقت لاہور کا گورنر چیت سنگھ کا بیٹا، لہنا سنگھ تھا اور سہ فریقی حکومت کے لاہور کے گرد و نواح پر تسلط اور جاسوسی کے شاندار مربوط نظام کے ہوتے ہوئے یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔

رنجیت سنگھ کو احساس ہو گیا کہ افغان بے اثر ہو چکے تھے، چنانچہ اس نے اپنے جاسوس اندرونِ شہر بھیجنے کا آغاز کر دیا۔ اس اقدام کی منصوبہ بندی میں اسے دو برس لگ گئے۔ ان دو برسوں میں اس نے اپنی گھڑ سوار فوج کو انتہائی تیز رفتاری سے حرکت کرنے کی تربیت دی اور تیار کیا اور ساتھ ہی ساتھ اتنا گولہ بارود بھی تیار کر لیا جو اس کے لیے لاہور کے بھاری دفاع میں دھماکوں کے ذریعے راستہ بنا سکے۔ 1799ء میں اس نے لوہاری دروازے کے جنوب میں تقریباً ایک میل دُور اپنی افواج کی ایک عارضی فرودگاہ قائم کی۔ یہ پڑاؤ وزیر خان کی بارہ دری کے درمیان میں تھا جہاں آج کل عجائب گھر لاہور کی عمارت استادہ ہے۔ بارہ دری آج بھی قائم ہے اور آج کل پنجاب پبلک لائبریری کے زیرِ استعمال ہے۔

جاسوسوں نے دروازوں کے بہت سے محافظوں کو خرید لیا تھا اور یہ بھی افواہ پھیلا دی تھی کہ حملہ دلی دروازے سے ہوگا۔ رات کو ہر دروازے پر جھوٹ موٹ کے حملے کر کے آزمائش بھی کر لی گئی۔ اس سے گھرے ہوئے مکینوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ بالآخر جب اصلی حملہ ہوا تو یہ بلا مقابلہ فتح ثابت ہوئی کیونکہ جاسوسوں نے تقریباً سارے ہی محافظ خریدنے کا بندوبست کر لیا تھا اور جو چیت سنگھ کے وفادار تھے، وہ قتل کر دیئے گئے۔ تینوں حکیم فرار ہو گئے اور لاہور نے سکرچکریہ مثل کے سربراہ رنجیت سنگھ کا استقبال کیا۔ لاہور دربار کی بنیادیں استوار ہو چکی تھیں اور گوجرانوالہ کے جواں سال کی شاطرانہ حکمت عملیوں سے ایک مضبوط پنجاب ابھرنے کو تھا۔ تین حکیموں کے دور میں لاہور ایک تجارتی شہر کی حیثیت سے خوشحال ہو چکا تھا اور تاجر برادری کا زور و شور تھا۔ اگرچہ انہیں محافظی رقم کے حیلے سے زبردستی زیادہ سے زیادہ محاصل ادا کرنے پڑتے تھے۔ یہ تینوں اپنی طرزِ حکومت سے ایسے ایسے عجیب و غریب احکامات جاری کرنے میں مشہور ہو گئے کہ ان سے تمام سکھوں کا ایک ایسا پیکر قائم ہوا کہ وہ آج تک اس سے باہر نہیں نکل پائے۔ صبح سویرے شروع ہونے والی افیم پینے کی محفلیں سہ پہر تک اپنے عروج کو پہنچ جاتیں جسے جلد ہی ''نشے کا چوٹی کا وقت'' کہا جانے لگا، لیکن ان عیش و عشرت کی محفلوں کو الگ رکھ کر دیکھیں تو اس سہ فریقی حکومت نے حقیقتاً لاہور کو اس حد تک مضبوط بنا دیا کہ افغان لٹیروں کا جواء ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سر سے اتر گیا۔ اور رنجیت سنگھ نے اعلیٰ بنیادوں پر عالی شان سلطنت قائم کر لی۔

تاریخ اب بھی اِن تین حکیموں پر نامنصفانہ طور پر درشت رہی ہے، حالانکہ ان کے نام آج بھی گلی کے پھیری والے استعمال کر رہے ہیں۔

●○●○●○●

سلطان ٹھیکیدار پر عذابِ الٰہی

ہر سانحہ میں خوش نصیبی بھی شامل ہوتی ہے۔ لاہور کی ہر ایک گلی اور ایک ایک اینٹ موقع سے فائدہ اٹھانے والوں کی کہانیاں سناتی ہیں۔ ایک ایسی ہی کہانی محمد سلطان ٹھیکیدار کی بھی ہے جس کی لاہور کے لیے انوکھی خدمت اس کی جنگ کے کھنڈرات میں سے اینٹیں اکٹھی کر کے عمارتوں اور بازاروں کی صف آرائی کی قابلیت میں پنہاں ہے اور یوں اس نے اپنے لیے شہر کی تاریخ میں ایک منفرد مقام حاصل کر لیا۔

اس نے زندگی کا آغاز اندرون دلی دروازے میں رہائشی ایک غریب آدمی کی حیثیت سے کیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے آخری ایام میں وہ منڈیوں میں معمولی مزدوری کرتا تھا۔ سکھ دور میں سینکڑوں مساجد بوسیدہ اور نا قابلِ مرمت ہو گئی تھیں۔ بڑی وجہ تو یہ تھی کہ یا تو انہیں بطور اصطبل یا پھر گولہ بارود کے ذخائر کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا تھا۔ ایک دفعہ جب انگریزوں نے سکھوں کو مکمل شکست دے دی تو، اور یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے انتقال کے دس برس میں ہی ہو گیا تھا، انہوں نے لاہور چھاؤنی کی تعمیر شروع کر کے اپنے اقتدار کو مستحکم کر لیا۔ اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے والے ٹھیکیداروں میں سے ایک دلی دروازے کا محمد سلطان بھی تھا۔ یہ غیر معروف اور غریب مزدور ٹھیکیدار کیسے بن بیٹھا؟ انگریزی دور کے محققین کے لیے یہ مستقلاً اسطوری قصہ بنا رہا ہے۔ لیکن ایک کہانی کے مطابق اس نے دھوکے سے اپنے آپ کو بطور ٹھیکیدار ظاہر کیا تو اسے چھاؤنی میں سینکڑوں زیر تعمیر گھروں میں سے ایک کی تعمیر کا معمولی نوعیت کا کام سونپ دیا گیا۔

سلطان نے پھرتی دکھائی اور سب سے پہلے قدیم اندرون شہر کی چند ایک نا قابلِ مرمت مساجد کو خرید لیا اور ان کی تمام اینٹیں اکھیڑ لیں۔ حالانکہ بہت سے لوگوں نے اس طریقِ عمل کے خلاف احتجاج بھی کیا، لیکن اس نے بڑی تعداد میں غرباء کو کھانا کھلانے کا بندوبست کر دیا اور یوں بھوک سے مرتی آبادی کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ محمد سلطان قدیم مساجد کی تلاش کرنے اور چند ہی روز میں ان کو مسمار کر کے ہموار کرنے میں اس قدر ماہر ہو گیا کہ بے شمار لوگوں نے پیش گوئی کی کہ اس شخص پر جو مساجد شہید کرنے میں تخصیص

حاصل کر چکا ہے، جلد ہی عذابِ الٰہی نازل ہوگا۔ لیکن اس پر ایسا عذاب کبھی نازل نہ ہوا، بلکہ اس کی دولت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔

چھاؤنی میں جو نئے نویلے انگریزی بنگلے استادہ ہوئے وہ سلطان ہی کے تعمیر کردہ تھے اور اس کے کام کے معیار نے انگریزوں کو متاثر کیا تو انہوں نے اسے زیادہ سے زیادہ کام دینا شروع کر دیا۔ اس نے لاہور کی کئی مشہور عمارتوں کو گرا دیا جن میں پری محل، مسجدِ نیم بسمل، جہاں سرائے، چوک شہزادہ دارالشکوہ وغیرہ شامل ہیں۔ پھر اس نے دلی دروازے کے عین سامنے اپنی سرائے سلطان تعمیر کرنا شروع کر دی۔ اس سرائے کے ساتھ اس نے ایک چھوٹا سا بازار بھی تعمیر کیا اور یہ بازار اس قدر چھوٹا تھا کہ اندرون شہر کے لوگوں نے اسے لُنڈا بازار یعنی معذور بازو کا نام دے دیا۔ وہی بازار آج کل لَنڈا بازار کہلاتا ہے۔

سلطان ٹھیکیدار کی خصوصی استعداد یہ تھی کہ وہ اندرونِ شہر کے بڑے بزرگوں سے پرانی عمارتوں کے بارے میں دریافت کرتا رہتا تھا کہ وہ کس طرح تعمیر ہوئی تھیں۔ ایک بار جب اسے یقین ہو جاتا کہ معماری کا کام اچھا خاصا ہوا تھا اور عمارت کی ساخت سے ہی صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ اس کی بنیادوں میں بے شمار اینٹیں استعمال ہوئی تھیں تو وہ فوراً بنیادیں کھودنے میں جت جاتا تھا۔

ایک ایسی ہی عمارت وزیر خان کی حویلی بھی تھی جسے پری محل کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ اس کے باغ میں بہت سی آبی گزرگاہیں تھیں اور اس کی پوری بنیادیں ایک پیچیدہ آبی نالیوں کے نظام پر استوار تھیں۔ اس سے گرمیوں کے مہینوں میں بھی ہمیشہ غیر معمولی ٹھنڈا پانی دستیاب رہتا تھا اور یہ صاف شفاف مقطّر پانی ہوتا۔ اسی نوع کا مقطّر جو شالامار باغ کے باہر موجود تھا۔ اس عمارت کے باغات سے ہی سلطان کو اینٹوں کے بے شمار اور بے مثل ذخیرے ہاتھ لگے۔ ان اینٹوں سے جو صرف مٹی کے کیچ سے چنی گئی تھیں اور بآسانی اکھیڑی جا سکتی تھیں اس نے بے شمار دولت کمائی۔ اٹکل حساب سے ہر مزدور کو اپنی دیہاڑی اجرت کے لیے روزانہ کم از کم ایک ہزار اینٹیں نکالنا ہوتی تھیں۔

ان تمام اینٹوں اور جو اس نے پورے لاہور کی دیگر جگہوں سے ناقابلِ مرمت مساجد کو گرا کر نکالی تھیں، اس نے اپنی سرائے اور لنڈا بازار تعمیر کیے اور جو اعلیٰ درجے کی اینٹیں تھیِ وہ اس نے پرانی چھاؤنی کے بہترین مکانات کی تعمیر میں صرف کیں۔ نہایت دولتمند ہونے اور اس کے خوشامدی دوستوں کی فوج ظفر موج کے ہوتے ہوئے سلطان نے لمبی اُڑان بھری۔ جب 1876ء میں پرنس آف ویلز نے لاہور کا دورہ کیا تو پورے لنڈے بازار کا علاقہ سجایا گیا اور اس نے کثیر دولت صرف کر کے بہت سے گھر اور ریسٹ ہاؤس تعمیر کیے اور یہ سب اپنی گرہ سے کیا۔ بازار کی خالی دکانوں کی بھرائی کے لیے اس نے اندرون شہر کے دکانداروں کو خود دعوت دی اور کئی برس تک ان سے کرایہ بھی وصول نہ کیا۔ جس وقت شہزادے کی آمد ہوئی سلطان ٹھیکیدار اپنے عروج پر تھا۔

لیکن ہر پری کہانی کی طرح سلطان کی کہانی کو بھی زوال آ گیا۔ اس کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی اور اس کی بیوی اس کی زندگی ہی میں انتقال کر گئی تھی۔ ایک بار اس کی صحت گرنا شروع ہوئی تو اس کے الّلے تلّلے اور ٹھاٹھ دار طرزِ حیات اسے گھاٹے میں مُبتلا کر گیا، جس سے وہ کبھی خلاصی نہ پا سکا۔

جلد ہی اس کی جائیداد فروخت ہونا شروع ہو گئی۔ برطانوی حکومت نے پرانے قرضوں کی ادائیگی میں اس کی مدد کرنے کی کوشش کی، لیکن جب قسمت ہی ساتھ چھوڑ جائے تو کیا ہو سکتا ہے۔ اسے اپنے اثاثوں پر ہی اکتفا کرنا پڑا جنہیں اس نے مہاراجہ جموں کے پاس رہن رکھ دیا اور پھر کبھی واگزار نہ ہو پائے۔ انہی اساسوں میں اس کا قیمتی پری محل بھی تھا جو اب باغات سے محروم ہو چکا تھا۔ یہ افواہ عام ہو گئی کہ سلطان ٹھیکیدار کو مساجد مسمار کرنے پر عذابِ الٰہی نے آن لیا ہے۔

وہ مقروض ہی فوت ہوا اور اس کے چچا زاد بھائی کو چند پرانی دکانیں وراثت میں مل گئیں، جو ان اینٹوں سے تعمیر ہوئی تھیں جو لاہور کی قدیم مساجد کو مسمار کرنے سے حاصل ہوئی تھیں۔ خود اس کا انتقال نامعلوم حالات میں ہوا، چنانچہ دلی دروازے کے بزرگ لوگوں نے فیصلہ کیا کہ سلطان ٹھیکیدار کی دکانوں کی آمدن تین بیواؤں کو دی جائے گی تاکہ وہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کے کاموں پر اس کو معاف فرما دے۔ مقامی روایت کے مطابق یہ تینوں بیوائیں بھی مقروض ہو گئیں اور ایسی آمدن لینے سے منکر ہو گئیں۔ اسی میں ان کی نجات تھی۔ یہاں اس شخص کی کہانی کا خاتمہ ہوتا ہے جو تباہ شدہ سکھ سلطنت کی خاک سے اٹھا اور ناقابلِ مرمت مساجد کی اینٹیں فروخت کر کے امیر ہوا اور آپ یوں کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ وہ بالآخر اپنے کرتوتوں کی لعنت کی بناء پر مفلس کی حیثیت سے فوت ہوا، لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔

●○●○●○●

جس روز قصائیوں کو ناک کٹوانے پڑے

کسی بھی لحاظ سے یہ ایک وحشی منظر تھا۔ اگر آپ اندرون شہر کے دلی دروازے سے داخل ہوں تو بڑے پھاٹک سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر بائیں ہاتھ کو خم کھاتی ہوئی گلی کی نکڑ پر ایک قصائی کی دکان ہے۔ یہی محلّہ قصائیاں کا آغاز ہے، یعنی قصائیوں کا علاقہ۔ تقریباً دو سو اٹھائیس برس قبل اس مقام پر ایک بڑے قہر سے بچنے کے لیے لاہور کے قصائیوں کے ناک اور کان کاٹ دیئے گئے تھے۔

یہ بہیمانہ اقدام اس لیے اٹھانا پڑا کہ حصاری شہر لاہور کا سکھوں کی متحدہ افواج نے گھیراؤ کر رکھا تھا اور وہ دھمکیاں دے رہے تھے کہ اگر لاہور کے قصائیوں کو ان کے حوالے نہ کیا گیا تو وہ شہر پر حملہ کر کے اسے آگ لگا دیں گے۔ گورنر یا اس وقت جسے صوبیدار کہا جاتا تھا، اپنی قصائی رعایا کو خون کے پیاسے سکھوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا، سو اس نے ایک نرالے حل کا انتخاب کیا۔ اس نے چند ایک قصائیوں کو پکڑا اور ان کے ناک اور کان کاٹ کر ایک چاندی کی طشتری میں رکھ کر سکھوں کو پیش کر دیئے۔ پھر اس نے دلی دروازے کا پھاٹک کھول دیا اور لہولہان ناک اور کان کٹے قصائی سکھ افواج کے حضور پیش کر دیئے جو بھنگڑے ڈالتے ہوئے واپس چلے گئے اور ایک بہت بڑا بحران ٹل گیا۔

یہ حیرت انگیز واقعہ لاہور کی تاریخ میں اس وقت پیش آیا جب افغانی حملہ آور احمد شاہ ابدالی کا دورِ حکومت تھا، جس نے لاہور کا گورنر یا صوبیدار قبلائی مَل کو مقرر کر رکھا تھا۔ یہ واقعہ اس لیے پیش آیا کہ لاہور کے قصائیوں نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سکھوں کے خلاف نفرت کو عروج پر پہنچا دیا ہوا تھا کیونکہ سکھ ہر بار اِن سے متصادم ہوتے تھے۔ ہر بار جھگڑے غضبناک ہوا کرتے تھے اور اچھا خاصا خون بہہ جاتا تھا۔ قصائی کسی بھی شخص کو بآسانی دو حصوں میں کاٹنے کے ماہر تھے اور سکھ اسی بات سے خوف کھاتے تھے۔ سکھ محض تعداد میں زیادہ ہونے کی بناء پر ان سے جھگڑا مول لے کر مزہ لیتے اور پرانے زخموں کا بدلہ لیتے تھے۔ پانچ سو سالہ پرانی نفرت کا آخری تصادم 1947ء میں تقسیمِ پنجاب کے دوران ہوا جس سے اس افسوسناک کہانی کا خاتمہ ہو گیا، جسے اب

بھلا کر دفن ہی کر دینا چاہیے۔

اصل دشمنی کی شروعات اس وقت ہوئی جب قلعہ لاہور کی دیواروں کے عین بیرون راوی کے کنارے سکھ گرو ارجن کی موت واقع ہوئی تھی۔ سکھ لوک کہانی کے مطابق گرو ایک غیبی عمل کے ذریعے دریا میں غوطہ زن ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔ مسلمانوں کا خیال ہے کہ قلعہ لاہور میں ہونے والے تشدد کے زخموں کی وجہ سے وہ دریا میں نہاتے ہوئے ڈوب کر مر گیا۔ لیکن اس کی موت کا ذمہ دار شہنشاہ شاہ جہاں کو قرار دیا گیا جسے عوامی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ شاہی فوجوں نے پنجاب بھر سے گرو ارجن کے متشدد پیروکاروں کو گرفتار کر لیا تھا۔ ان میں سے تقریباً نو ہزار افراد کو زنجیروں میں جکڑ کر لاہور لایا گیا۔ شہنشاہ نے لاہور کے قصائیوں کو حکم دیا کہ ان تمام باغیوں کو یکی دروازے کے بیرون ذبح کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک ہفتے تک ان کو ذبح کیا جاتا رہا۔ اس قتلِ عام کو سکھ کبھی نہیں بھولے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس ذبیح کا بدلہ لاہور کی پوری قصائی برادری کو قتل کر کے لیا جائے۔ اسی قدیم دشمنی کی وجہ سے لاہور کا محاصرہ کیا گیا تھا۔

لاہور کے قصائیوں کے ہاتھ سکھوں کے ذبیح کے بعد لاہور کی ہندو آبادی نے شہنشاہ سے مطالبہ کیا کہ لاہور کے تمام قصائیوں کو، جنہیں وہ ''گاؤ ماتا کے کاٹنے والے'' کہتے تھے، شہر بدر کر دے۔ خاصی ہچکچاہٹ کے بعد شہنشاہ نے مطالبہ منظور کر لیا اور ان کو لاہور شہر سے بیرون ایک جگہ آباد کر دیا جہاں آج کل لاہور کی چمڑا منڈی ہے۔ شہنشاہ نے ان کی بھرپور مدد کی اور تقریباً سبھی لوگوں نے خوبصورت حویلیاں تعمیر کیں، جن میں سے چند ایک اب بھی قائم ہیں اور ایک خوبصورت مسجد بھی۔ یہ ازسرِنو تعمیر شدہ مسجد آج بھی چمڑا منڈی کے اندر جانے والی سڑک کی نکڑ پر واقع ہے۔ اس بندوبست سے کچھ عرصہ خیریت سے گزر گیا۔ معاملات اس وقت بگڑنا شروع ہوئے جب مسلمانوں کا اقتدار ختم ہو گیا اور سکھوں کی جارحیت بڑھتی گئی۔ اصل کُشتگان کے پڑپوتوں کا بدلہ لینے کا وقت آ گیا تھا اور انہوں نے حکومت کے بجائے قصائیوں کو اپنا ہدف قرار دے دیا۔

لاہور کے گردونواح کے سکھوں نے علاقے پر ہلّہ بول دیا اور قصائیوں نے جوابی حملے میں چُھریوں اور کلہاڑیوں سے کام لیا۔ ایک بہیمانہ مقابلہ ہوا جس کے نتیجے میں سکھوں کو بھاری نقصان اٹھا کر پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ ان کا اس قسم کے دشمنوں سے پہلے کبھی واسطہ ہی نہ پڑا تھا۔ اس واقعہ کے بعد سکھ مزید متحد ہو گئے اور اب کی بار انہوں نے قسم کھائی کہ وہ اصل قتلِ عام کا بدلہ ضرور لے کر رہیں گے۔ ایک اور بڑا حملہ کیا گیا۔ دوبارہ گھمسان کا رَن پڑا اور خون خرابہ ہوا۔ سکھوں کو خوفناک چُھروں اور کلہاڑوں کے مہیب استعمال کے باعث ایک بار پھر پسپا ہونا پڑا۔ اپنی جان کی خاطر لڑنے والے قصائیوں سے وہ اور کیا توقع کر سکتے تھے؟ مقامی روایت کے مطابق قصائیوں کی گھر والیاں بھی اپنے خاوندوں کے شانہ بشانہ لڑی تھیں۔

حواس باختہ صوبیدار قبلائی مَل کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس دشمنی کو کیسے ختم کرے۔ سکھ لاہور سے

قصائیوں کا مکمل صفایا چاہتے تھے اور وہ اس سے کم کسی بات پر راضی نہ تھے اور یہ ان کے نیم ہندو مذہب کا حصہ بھی تھا۔ مسلمان آبادی کا، جو تعداد میں زیادہ تھی، مطالبہ تھا کہ گوشت کھانا ان کا حق ہے اور اس کے لیے قصائیوں کا ہونا لازمی اَمر ہے۔ احمد شاہ ابدالی نے حکم دیا کہ قصائیوں کو دوبارہ اندرون شہر آباد کیا جائے۔ تب قصائیوں کی ساری آبادی محلّہ قصاباں میں آباد ہوگئی۔ لاہور کا محاصرہ چھتیس گھنٹوں سے زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ مسئلے کے اس حل سے وحشی سکھ مطمئن ہوگئے جنہوں نے محسوس کیا کہ قصائیوں کی سزا کے طور پر ان کی تذلیل کافی تھی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں صرف ایک واقعہ ہوا جب اس محلے پر حملہ ہوا اور گھروں کو آگ لگا دی گئی۔ شاطر سکھ حکمران نے حکم دیا کہ لاہور کے سکھ سربراہان یا تو خود گائے ذبح کریں یا قصائیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ اس کے بعد انہوں نے کبھی قصائیوں سے تعرض نہیں کیا۔ انگریزوں کے دور میں کسی جنونی فردِ واحد کے اِکا دُکا واقعات کے علاوہ کوئی خاص اہمیت کا واقعہ سرزد نہیں ہوا، لیکن بلاشبہ یہ اس وقت ضرور پھوٹ پڑے جب 1947ء میں لاہور میں نفرت کی آگ بھڑک اُٹھی۔

امرتسر میں لڑکیوں کے ایک ہاسٹل میں مسلمان لڑکیوں کی عصمت دری اور قتلِ عام کا واقعہ اندرون شہر میں سکھوں پر حملوں کا باعث بنا۔ انہوں نے جتھے بنا کر شاہ عالمی کے علاقے میں گھومنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں پر پہلا بڑا حملہ محلّہ قصاباں میں ہوا جہاں قصائیوں کو ذبح کر دیا گیا۔ اگلی رات قصائیوں نے بدلہ لینے کے لیے جوابی حملہ کیا۔ اس کے بعد خون بہنا اس وقت تک بند نہیں ہوا جب تک اس محبت اور شاعری کے شہر سے ایک ایک سکھ نے راہِ فرار اختیار نہ کر لی۔ ان کے چلے جانے کے بعد ایک پشتینی عداوت کا خاتمہ ہوگیا جس میں بلاوجہ سینکڑوں اور ہزاروں جانوں کا زیاں ہو چکا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ شہنشاہوں کو کبھی سمجھ نہ آئی کہ بدی کے اقدام کبھی موت سے ہمکنار نہیں ہوتے۔ میکیاوَلی نے شہزادے کو یہی مشورہ دیا تھا کہ اپنی حکومت کے استحکام کی خاطر کبھی کسی کو ذبح نہ کرنا۔ بہتر حل ہمیشہ ممکن ہوتے ہیں، لیکن لگتا ہے شہزادہ کبھی سبق یاد نہیں رکھتا۔

●○●○●○●

گھوڑا جس نے لاہور کو جنگ میں دھکیل دیا

یہ بات آج کتنی عجیب لگے گی کہ اندرونِ شہر کی ایک پوری گلی میں دو روز تک رگڑ رگڑ کر صفائی کی گئی تھی کیونکہ اس راہ سے ایک گھوڑے نے گزرنا تھا۔ یہ کوئی مذہبی تقریب نہیں تھی صرف ایک گھڑ سوار کا شدید جنون تھا۔ جو پیدل چلنے کے بجائے گھوڑے کی کاٹھی میں اپنے آپ کو زیادہ آرام دہ محسوس کرتا تھا۔ دو سو برس پہلے سکھ چکیہ گوجرانوالہ کے سربراہ رنجیت سنگھ نے دس محرم 1799ء کو جب لاہور پر قبضہ کیا اور خود ہی پنجاب کا مہاراجہ ہونے کا اعلان کر دیا تو کہا کہ ہر وہ شخص جسے کسی قسم کا گھمنڈ ہو اسے چاہیے کہ سب سے زیادہ ترجیح گھوڑوں، اپنے کاموں اور اپنی عورتوں کو دے اور اسی ترتیب کے ہمراہ۔ اگر آپ قلعہ لاہور گئے ہیں اور آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ اندر داخلے کے راستے کے بائیں جانب ایک انگریزوں کی فوجی بیرک بنی ہوئی ہے۔ انگریزوں کی اس بیرک کی تعمیر سے قبل اس جگہ لاہور دربار کا اصطبل ہوا کرتا تھا۔

کسی بھی ایک وقت میں اس اصطبل میں مہاراجہ کے تقریباً ایک ہزار بہترین نسل کے گھوڑے رکھنے کی گنجائش تھی۔ جب اسے جگہ کی تنگی محسوس ہوئی تو وہ انہیں حضوری باغ میں لے گیا اور جب وہ جگہ بھی کافی ثابت نہ ہوئی تو وہ بادشاہی مسجد میں داخل ہو گیا۔ ایسا جنون تھا اس شخص کا جس نے آہنی گرفت سے پنجاب پر مسلسل چالیس برس تک حکومت کی اور نہایت دانشمندی کے ساتھ! خوبصورت گھوڑے اور خوبصورت عورت کی خاطر وہ آخری حد تک جا سکتا تھا اور اگر کسی ''گھوڑی'' کو حاصل کرنے کا خیال اس کے سر میں سما جاتا تو پھر اس پر جنون طاری ہو جاتا تھا جو ہر پنجابی شاؤنی مرد کا شعوری اظہار لگتا ہے۔

لیکن لاہور اور پنجاب کی تاریخ میں ایک گھوڑا ایسا بھی تھا جس کی حیثیت دیگر تمام گھوڑوں سے کہیں ممتاز رہی تھی۔ مہاراجہ نے اس اساطیری گھوڑے کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اور قسم کھا رکھی تھی کہ وہ ہر قیمت پر اسے حاصل کر کے رہے گا۔ بالآخر وہ اُسے ''ساٹھ لاکھ روپوں اور بارہ ہزار سپاہیوں'' کے عوض حاصل ہو گیا۔ کم از کم یہ بات سیاح بیرن چارلز کو خود رنجیت سنگھ نے بتائی تھی۔ موجودہ سونے کے معیار کے حساب سے یہ

رقم بارہ ارب اور انفنٹری کی پوری ڈویژن کے مساوی ہے۔ لاہور کے بازار حکیماں کے فقیر خاندان کے کھاتے بھی اس رقم کی توثیق کرتے ہیں بلکہ حقیقتاً اس سے بھی زیادہ! آخر اس گھوڑے میں کیا خاص بات تھی کہ لاہور دربار اسے حاصل کرنے کے لیے جنونی ہو گیا تھا؟ بہر حال بحیثیتِ مجموعی مہاراجہ کے پاس عربی نسل کے گھوڑوں کا بہت بڑا اصطبل تھا اور اساطیری گھوڑوں کا تو ذکر ہی نہ کریں جن میں گوہر بہار اور سفید پری موجود تھے، جو دونوں ہی ''آندھی کی رفتار'' سے دوڑتے تھے۔ اس کے اصطبل میں کوئی گھوڑا بھی موجودہ زمانے کے بیس ہزار روپوں کے مساوی مالیت سے کم کا نہ تھا۔ لاہور میں اُن دنوں ایک لطیفہ چل رہا تھا کہ لاہور کی کُل جائیداد اور مہاراجہ کے گھوڑوں کی مالیت مساوی تھی۔

اس اساطیری گھوڑے کا نام ''اسپِ لیلیٰ'' تھا اور بارکزئی قبیلے کے سرداروں، دوست محمد یا یار محمد میں سے کسی ایک کی ملکیت تھا۔ لیکن اس کا پتہ بہت سی دستاویزات چھاننے کے بعد بھی نہیں چلا۔ یہ خالص ایرانی نسل کا، سیاہ چمکدار رنگت اور ''دیکھنے والی چیز'' تھا۔ اس کی رفتار پورے درّہ خیبر میں اساطیری تھی اور جس بات نے مہاراجہ کے دل میں زیادہ تجسس پیدا کیا وہ اس کی سمجھ بوجھ کا چرچا تھا۔ اس گھوڑے کی خبر 1822ء میں کسی وقت لاہور دربار میں پہنچی۔ اسی وقت رنجیت سنگھ نے اپنے جاسوس روانہ کر دیئے کہ پتہ کریں کہ گھوڑا کس جگہ رکھا گیا تھا۔ ایک بیان کے مطابق وہ جگہ پشاور میں تھی اور دوسرے کے مطابق، چونکہ بارکزئیوں کو بھی اپنے جاسوس کے ذریعے مہاراجہ کی اس گھوڑے میں غیر معمولی دلچسپی کا علم ہو چکا تھا، اس لیے انہوں نے گھوڑے کو کابل منتقل کر دیا تھا۔ اس ایک گھوڑے کی وجہ سے پنجاب اور افغانستان کے مابین مکمل جنگ کی نوبت آ گئی تھی۔

1822ء میں مہاراجہ نے اپنے خصوصی وزیر فقیر عزیز الدین کو خراج کی وصولی کے لیے یار محمد کے پاس پشاور بھیجا تو اس نے تحائف میں بہت عمدہ نسل کے گھوڑے بھی دیئے، لیکن اسپِ لیلیٰ ان میں شامل نہ تھا۔ پوچھنے پر یار محمد نے اسے بتایا کہ گھوڑا اس کی ملکیت میں نہیں۔ اس پر مہاراجہ آگ بگولا ہو گیا اور اس نے جاسوسوں کا ایک دستہ روانہ کیا کہ وہ گھوڑے کا سراغ لگائیں۔ ایک بار جب اسے یہ یقین ہو گیا کہ گھوڑا زندہ سلامت ہے اور یار محمد ہی کی ملکیت میں ہے تو اس نے خفیہ مذاکرات شروع کر دیئے۔ 1828ء میں مہاراجہ کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اس نے گھوڑے کے حصول کے لیے سردار بُودھ سنگھ کی سرکردگی میں ایک تادیبی فوج بھیجی۔ اس جنگ میں سردار بُودھ سنگھ کے ہمراہ سینکڑوں سپاہی ہلاک ہو گئے، لیکن جیت لاہور دربار کی ہی ہوئی کیونکہ بُودھ سنگھ کی کمک کے لیے دو فرانسیسی جرنیلوں، الارڈ اور وینچورہ، جو اَب پرانی انارکلی میں مدفن ہیں، کی کارکردگی میں روانہ کی گئی، ایک اور فوج نے پانسہ پلٹ دیا۔

جنگ میں ہتھیار ڈالنے کے موقع پر فرانسیسی جرنیلوں کو مطلع کیا گیا کہ اسپِ لیلیٰ وہاں نہیں تھا۔ غصے میں آ کر انہوں نے یار محمد کے بھائی کو گرفتار کر کے یرغمال بنا لیا۔ آخر کار غضبناک پٹھانوں نے فرانسیسی جرنیلوں کو

بتایا کہ گھوڑا مر چکا تھا۔اس پر مہاراجہ اور زیادہ آتشِ زیر پا ہو گیا اور جب اس کے جاسوسوں نے اسے مطلع کیا کہ اس وقت گھوڑا کہاں کھڑا ہے تو اس نے سردار کھڑک سنگھ کی سربراہی میں ایک اور تادیبی فوج پشاور روانہ کر دی۔ لیکن کھڑک سنگھ کے پشاور پہنچنے سے پہلے یار محمد کو، اس کے اپنے قبیلے نے، ایک گھوڑے کی خاطر جنگ چھیڑ نے پر، ہلاک کر ڈالا اور اس کا بھائی سلطان محمد اپنی جان بچا کر فرار ہو گیا۔

1830ء میں رنجیت سنگھ نے سلطان محمد کو پشاور کا گورنر مقرر کر دیا۔اس موقع پر جرنیل وینچورہ نے پھر اسپِ لیلیٰ کا مطالبہ کیا تو نئے گورنر نے حقارت سے رد کر دیا۔ جرنیل وینچورہ نے فوراً نئے گورنر کو اس کے اپنے محل ہی میں گرفتار کر لیا اور اسے مطلع کیا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ جرنیل وینچورہ وزیر آباد میں سینکڑوں ڈاکوؤں کو پھانسی دے چکا تھا اور بڑی خوفناک شہرت کا حامل تھا۔ چنانچہ انہوں نے معاملے کی سنگینی کو بھانپ لیا۔اس موقع پر سلطان محمد گھوڑے کی حوالگی پر رضامند ہو گیا اور ایسا کرتے وقت ''وہ بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔'' گھوڑے کو اسی وقت پانچ سو سے زائد سپاہ کی نگرانی میں ایک خصوصی بگھی میں لاہور روانہ کر دیا گیا۔

گھوڑا قلعہ لاہور کے مغربی جانب واقع اکبری دروازے سے لاہور پہنچا۔ وہ سڑک جو بادامی باغ کی طرف سے آتی ہے اسے اور قلعہ لاہور کے گرد تمام موڑوں کو دو روز قبل ہی سے رگڑ رگڑ کر اچھی طرح صاف ستھرا کیا جا چکا تھا اور حکم یہی تھا کہ گرد و غبار کا ایک ذرّہ بھی گھوڑے کے نتھنوں تک نہیں جانا چاہیے۔ اور یوں اسپِ لیلیٰ لاہور پہنچا اور مہاراجہ کی آنکھوں کو ٹھنڈک بخشی، جس نے کہا کہ ''واقعی ساری محنت کا پھل مل گیا ہے۔'' ایک بیان کے مطابق اس کا رنگ سیاہ چمکدار تھا جیسا کہ نام ''اسپِ لیلیٰ'' سے ہی ظاہر ہے۔ ایک دوسرے بیان کے مطابق اس کا رنگ گہرا بھورا تھا، لیکن رنگ سے کیا فرق پڑتا ہے۔ گھوڑے کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ خاص موقعوں پر اس کی گردن میں کوہِ نور ہیرا پہنایا جاتا تھا بلکہ خاص الخاص موقعوں پر ہی دیدار کرایا جاتا تھا۔ وہی آخری گھوڑا تھا جس پر مہاراجہ سوار ہوا۔ اسے شدید بیماری میں اٹھا کر گھوڑے کی کاٹھی پر بٹھایا گیا۔ ایک بار جب وہ بیٹھ گیا تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک دکھائی دے رہا تھا کیونکہ وہ فطری طور پر ایک گھڑ سوار تھا۔ اساطیر کے مطابق پوری تاریخ میں لاہور دربار کے حصول سے زیادہ خرچ اس گھوڑے کے حصول میں ہوا۔

●○●○●○●

موئیاں دی منڈی کی کہانی

مغلیہ سلطنت کے قریب الاختتام ایام اور سکھوں کے اقتدار میں آنے سے ذرا قبل شاہ عالمی دروازے سے بیرون نئی ابھرتی ہوئی مویشیوں کی منڈی، گوالمنڈی اور غضبناک آزاد خیال لوگوں کے گاؤں، مزنگ کے درمیان ایک چھوٹا سا خود مختار اور خوش وضع قطعہ، محلّہ خوجیاں کے نام سے معرضِ وجود میں آیا۔

خوجہ برادری ہمیشہ سے کاروباری افراد پر مشتمل رہی ہے۔ آج بھی یہ لوگ نہایت اعلیٰ درجے کے کامیاب تاجر ہیں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ اس وقت کتنے، غیر معمولی متمول لوگ تھے اور اب بھی ہیں۔ اندرون شہر کے غیر یقینی حالات کی وجہ سے ان متمول لوگوں نے فیصلہ کیا کہ حملہ آوروں اور جنونی حکمرانوں سے محافظت کے لیے انہیں اپنا ایک الگ چھوٹا سا خود مختار علاقہ ''محلّہ خوجیاں'' تعمیر کرنا چاہیے۔ اوّلیں اقدام کے طور پر وہاں مسجد کی تعمیر ہوئی جو ''خوجیاں دی مسجد'' کہلاتی تھی۔ اس مسجد کے اردگرد چند شاندار عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ باہر کی جانب نچلی دیواریں استوار تھیں جن کی نگرانی پر چوکیدار مامور تھے۔ اس طرح لاہور کے متمول تاجر حضرات، جن کی زیادہ تر دکانیں اکبری منڈی میں تھیں، نے اپنے لیے ایک محفوظ ٹھکانہ بنا لیا۔ ہر صبح جب تاجر گھوڑوں پر سوار آتے تو دروازے کھول دیئے جاتے کیونکہ پھر یہ اُٹھواں پُل بن جاتا تھا۔

اس بات پر کچھ اختلاف ہے کہ یہ محلّہ کہاں واقع تھا؟ ایک دستاویز کے مطابق یہ بیڈن روڈ اور ہال روڈ کے درمیانی علاقے میں تھا۔ دوسرے بیانیے کے مطابق یہ ٹمپل روڈ کے قریب عین ریگل چوک پر واقع تھا۔ اس کا نام اس لیے پڑا کیونکہ یہاں فری میسن والوں کا گرجا، ٹمپل تعمیر کیا گیا تھا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ انگریزوں کے دور میں نہیں بلکہ سکھوں کے دورِ حکومت کے آخری ایام میں اسے رنجیت سنگھ کی فوج کے ایک فرانسیسی افسر نے تعمیر کرایا تھا۔ محلّہ خوجیاں کی تباہی کی کہانی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جب امنِ عامہ کی صورت بگڑ جائے تو کاروباری برادری کس قدر بے بس ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ ریاست ہی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ میکیاولی کے مطابق ''جب تاجر کو دھمکی ملتی ہے تو وہ ایسا بندوبست کرتا ہے کہ ریاست ہی ختم ہو

جاتی ہے۔ کیونکہ اس کی قوتیں ریاست کی قوتوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔"

سکھوں کی ابھرتی ہوئی فوجوں نے محلے پر حملے کرنے شروع کر دیئے اور ہر بار خوجہ برادری کے بزرگ سرداروں سے بات چیت کرتے اور انہیں اچھی خاصی بھتہ رقم ادا کر کے خلاصی پا لیتے۔ اس سے جنونی سکھوں کو دُور رکھنے میں تھوڑا بہت عرصہ بیت جاتا۔ وہ تو جب اقتدار کے لیے سکھوں کی آپس میں ہی چھینا جھپٹی شروع ہوگئی تو ہر مثل دستے نے متمول خوجوں سے الگ الگ رقوم حاصل کرنا شروع کر دیں اور ہر کوشش میں کچھ نہ کچھ تو مل جاتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ دولت بتدریج کم ہونے لگی تو سکھوں کو خیال ہوا کہ "چالاک خوجے" ان کو دھوکا دے رہے ہیں۔

خوجوں نے فیصلہ کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ اپنے مؤقف پر ڈٹ جائیں اور جب بھنگیوں کی ایک مثل نے حملہ کیا تو ان کا واسطہ بہترین اسلحے سے لیس جواں سال خوجوں کے غضب سے پڑ گیا۔ سکھ پسپا ہو گئے اور آپس میں ملاقات کی تا کہ خوجوں کو سبق سکھایا جائے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ محلّہ خوجیاں کو ہی صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ چنانچہ تین قوی ترین مثل، بھنگی، رام گڑھیے اور کنہیا اکٹھے ہو کر ایک بہت بڑی فوج کی شکل میں محلّہ خوجیاں پر حملہ آور ہوئے۔ لاہور کے حکمران نے فیصلہ کیا کہ وہ اس معاملے سے الگ رہے گا ایسا نہ ہو کہ جنونی سکھ اندرون شہر میں ہی داخل ہو جائیں۔

سکھوں نے چاروں اطراف سے بڑے زور و شور سے بیک وقت حملہ کر دیا۔ اگرچہ انہیں اچھی خاصی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن جلد ہی انہوں نے پورے علاقے کو مکمل طور پر مغلوب کر لیا اور لاہور کے بے شمار چوٹی کے تاجروں کو قتل کر دیا۔ جواں سال افراد اپنی مسجد میں کنارہ گیر ہو گئے۔ سکھوں نے تمام حویلیوں پر قبضہ کر لیا اور چھتوں پر اپنی توپیں چڑھا دیں۔ مسجد کی چھت پر سے تمام خوجوں کو اتار کر ہلاک کر دیا گیا۔ پھر محاصرہ شروع ہو گیا۔ مسجد کا تمام کھانا بند کر دیا گیا اور پھر تمام محلے کی مکمل تلاشی لی گئی اور باقی ماندہ خوجوں کا بھی قتلِ عام کر دیا گیا۔ ایک کیفیت نگار کے مطابق جب انہوں نے بے شمار عورتوں کو اپنے سرداروں میں تقسیم کیا تو سکھوں کی آپس میں ٹھن گئی۔ اسی توضیح کے مطابق جب لُوٹ مچی تو اس محلے سے چاروں اطراف میں بیل گاڑیوں کی لمبی قطاریں روانہ ہوئیں۔ اسی توضیع کے مطابق آخر میں سکھ مسجد میں داخل ہو گئے اور ہر کسی کو ہلاک کر دیا۔ ایک اور توضیع کے مطابق چند ایک بچے کھچے خوجوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور شہر ہی چھوڑ گئے۔ یوں محلّہ خوجیاں ایک ویران جگہ بن کر رہ گئی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ جب اقتدار میں آیا تو اس نے حکم دیا کہ سارے محلے کو مسمار کر دیا جائے صرف مسجد کو ویسے ہی رہنے دیا گیا۔ چنانچہ جہاں کبھی متمول افراد کا ایک خودمختار اور خوش وضع محلّہ قائم تھا، وہاں گھمسان کی جنگ کے بعد اب صرف گولیوں سے چھلنی ایک ویران مسجد کھڑی رہ گئی۔ یہ مسجد تقریباً پچاس برس اسی طرح خالم

خالی رہی اور اس کے گرد علاقے کو ''مویاں دی منڈی'' یعنی ''مردوں کی مارکیٹ'' کہنے لگے۔ یہ محاورہ آج بھی اندرون شہر میں مروّج ہے کہ جب کسی جگہ کے متعلق کہنا ہو کہ وہاں تو کچھ بھی نہیں ہے تو یہ الفاظ ادا کیے جاتے ہیں۔

لیکن ابھی کہانی کا اختتام نہیں ہوا۔ مرنے والے اتنی آسانی سے نہیں مرجاتے۔ 1865ء میں جب انگریز 1857ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد اپنے آپ کو مستحکم کر چکے تھے تو ایک شریف آدمی نے، جس کا نام سیّد شمس تھا، ضلع کچہری میں انگریز حاکم کے روبرو پیش ہو کر دعویٰ کیا کہ یہ مسجد اس کی خاندانی ملکیت ہے۔ اس نے بہت سے گواہ پیش کیے۔ اس وعدے پر کہ وہ انگریزوں کا وفادار رہے گا، ڈپٹی کمشنر نے خیر سگالی کے طور پر وہ مسجد اس کی تحویل میں دے دی۔

دو برس تک سیّد شمس نے مسجد کی نمازوں کی امامت کی اور معائنے کے تمام شقوں پر عملدرآمد کیا۔ ایک بار جب مسجد کی صحیح حوالگی مکمل ہوگی اور جائیداد کے کاغذات پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے تو سیّد شمس نے اسے ایک گھر میں تبدیل کر لیا اور ایک انگریز جوڑے کو کرائے پر دے دیا اور جب انگریز جوڑا واپس اپنے وطن روانہ ہو گیا تو اس نے مسجد کو، جو اَب گھر میں تبدیل ہو چکی تھی، فروخت کر دیا۔ ایک اور توضیع کے مطابق اس گھر کو کئی برس کے استعمال کے بعد مسمار کر دیا گیا اور یوں محلّہ خوجیاں کی کہانی کا ابہام میں خاتمہ ہو گیا۔

●○●○●○●

وہ شخص جس نے تاج محل ڈیزائن کیا

تاج محل کس نے ڈیزائن کیا؟ کیا وہ اطالوی عمّار جیرینیم ویرونیکا تھا جس نے اس زمانے میں ہندوستان کا دورہ کیا تھا؟ یا وہ فرانسیسی سیمی گرآسٹن دوبوردو تھا جیسا کہ فرانس کے لوگ یقین رکھتے ہیں یا وہ لاہور کا استاد احمد تھا، جسے شہنشاہ شاہ جہان نے ''نادرالعصر'' یعنی اپنے وقت کا عجوبہ کا خطاب عطا کیا تھا۔

تاج محل کا اصل عمّار ہمیشہ ہی سے پراسرار پردوں میں اخفا رہا ہے۔ اس زمانے کی دستاویزات ''لاہور کے عمّار'' کی طرف اشارے کرتی ہیں۔ سترھویں صدی کے مسودے ''دیوانِ مہندس'' میں، جو 1930ء میں دریافت ہوا، اور جو قدیم ترین مسودہ ہے اور لُطف اللہ کی شاعری کا مجموعہ ہے، بے شمار اشعار شامل ہیں جن میں وہ اپنے والد ''لاہور کے استاد احمد'' کا تاج محل اور دہلی کے لال قلعے کے عمّار کی حیثیت سے ذکر کرتا ہے۔ استاد احمد ایرانی نژاد نجومی انجینئر (مہندس) تھا۔

ایک اور مآخذ کے دعویٰ کے مطابق استاد احمد لال قلعے کے عمّاروں میں سے ایک تھا۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں اچھی خاصی شہادتیں میسر ہیں اور اس حقیقت کو آج بھی حکومتِ ہند تسلیم کرتی ہے۔ دیگر بڑے بڑے منصوبوں، جن پر استاد احمد نے کام کیا تھا، کی مزید شہادتیں بھی موجود ہیں جو اس دعویٰ کی معقولیت کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ استاد بہت سے دیگر ناموں سے بھی معروف تھے، جیسے استاد خان افندی یا استاد محمد عیسیٰ خان اور عیسیٰ افندی۔

عام اتفاقِ رائے یہ ہے کہ تاج محل کا ڈیزائن کسی ایک ماہرِ تعمیرات کے نام نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح دیگر بڑے تعمیراتی کاموں کو کسی نہ کسی غیر معمولی ماہر کی تخلیقی اُپج کے نام کر سکتے ہیں۔ یہ کام ایک ارتقائی عمل کی پیداوار معلوم ہوتا ہے۔ حتمی نتیجہ، جیسا کہ ایک تحقیقی مقالے میں بیان کیا گیا ہے، یہی ہے کہ ''مغلیہ تعمیر کی ترقی کا کامل مرحلہ ہے۔'' لیکن وہ کون شخص تھا جس نے یہ سارا عمل شروع کیا اور عمارت کو موجودہ صورت عطا کی؟ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ شخص لاہور کا استاد احمد تھا۔ وہی تھا جس نے مغلیہ دربار کو مشورہ دیا کہ کہاں سے بہترین کاریگر

ملیں گے جو ''فی الواقعی کرّۂ ارض پر موجود تھے۔'' اور یہ کہ ان کی تلاش کس طرح کرنا ہوگی اور ان کو کیسے تاج پر کام کرنے پر آمادہ کرنا ہوگا۔ اس کی حکمتِ عملی نے کمال کر دکھایا اور دنیا نے نتیجہ دیکھ لیا۔

ترکی سے اسماعیل خان آیا جو ''نیم کرہ'' بنانے کا ڈیزائنر تھا اور ''گنبد بنانے میں جوہرِ قابل تھا۔'' لاہور ہی کا ایک اور ماہر استاد کاظم خان سفر کرتا ہوا آگرہ پہنچا تا کہ خالص سونے کے کلس کی ڈھلائی کر سکے جو ترک استاد کے گنبد کا ایک ممتاز جزو تھا۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ کاظم ہی نے استاد احمد کو ترک استاد ماہرِ تعمیر گنبد کی خدمات برائے تاج محل حاصل کرنے کا مشورہ دیا ہو۔ دلی کے مقامی نگینہ ساز چرنجی لال کو بطور سنگتراش سربراہ منتخب کیا گیا۔ شیراز کا امانت خان خطاطِ اعلیٰ مقرر ہوا اور اس حقیقت کا ثبوت تاج کے صدر دروازے پر موجود ہے جہاں اس کا نام کندہ ہے۔ ایک اور لاہوری محمد حنیف ''معماروں کا نگران'' مقرر تھا جبکہ لاہور کا ایک کشمیری میر عبدالکریم مالی امور کو سنبھالتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ یہ سب لوگ لاہور میں استاد احمد کے ساتھ کام کرتے رہے ہوں اور وہ بھی ان کی ہنرمندی کا مداح تھا۔

لیکن مغلیہ دربار نے شیراز کے مقّرمیت خان کو روزانہ پیداواری بندوبست کا سربراہ مقرر کر دیا۔ سنگتراش بخارا سے، خطاط شام اور ایران سے، کندہ کار جنوبی ہندوستان سے، پتھر چیرنے والے بلوچستان سے، آرائشی مناروں کی تعمیر کے ماہرین ایک اور کندہ کاری کا ماہر جو صرف پتھر کے پھول تراشتا تھا، مختلف پیشہ جات کے 37 ماہرین اس تخلیقی مرکزہ کے خالق تھے۔ ان میں سے 12 کا تعلق لاہور سے تھا۔ اس مرکزی حصے کے ساتھ 20 ہزار کاریگروں کی نفری منسلک تھی جو بہترین تھے اور اینٹوں کے معمار جو پُورے شمالی ہندوستان سے اکٹھے کیے گئے تھے۔ ایسی زبردست منصوبہ بندی کی گئی تھی تاج محل کی تعمیر کے لیے!

ہماری دلچسپی تو استاد احمد ''نادرالعصر'' میں ہے۔ یہ شخص کون تھا؟ نصابی کتب میں اس کا زیادہ ذکر نہیں ملتا لیکن جو تھوڑا بہت ہماری تحقیق سے سامنے آیا ہے، کے مطابق وہ موچی دروازے کا رہائشی تھا۔ جہاں اس کا چھوٹا سا لیکن خوبصورت گھر تھا۔ اس چوک کے نزدیک جسے آج کل چوک نثار حویلی کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں اس علاقے میں ایک چھوٹا سا خوبصورت باغ تھا جس کے درمیان میں ایک فوارہ نصب تھا۔ اس کے اردگرد اینٹوں کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے خوبصورت گھر تھے۔ یہ بلاشبہ ایک دلکش منظر ہوا کرتا تھا۔ خوبصورت اور صاف ستھرا اور کم گنجان آباد، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید گھر تعمیر ہوتے گئے اور مسلسل بیرونی حملوں کی وجہ سے لوگ حفاظت کی خاطر اندرون شہر آباد ہونے کو ترجیح دیتے تھے۔

اگر ہمیں 1883ء میں کی گئی مردم شماری پر یقین ہو، جو انگریزوں نے کرائی تھی، جس کے مطابق اندرون شہر لاہور کی آبادی ترانوے ہزار نفوس تھی۔ آج کے سرکاری اعداد و شمار پچاس لاکھ سے اوپر کے ہیں۔ اگرچہ بعض لوگ اسے ستّر لاکھ بھی بتاتے ہیں۔ اگر ہمیں ایک سو بیس برس کی آبادی بڑھنے کی رفتار کا اندازہ ہوتا تو

یقیناً آبادی کبھی پچاس لاکھ سے تجاوز نہ کرتی۔اس لحاظ سے لاہور باغوں، تعلیم یافتہ افراد، فنونِ لطیفہ، موسیقاروں، شاعروں اور ادیبوں سے عبارت تھا۔ یہ ایک مثالی دنیا تھی اور اسی لیے انگریزی اوّلیں شاعر چَوسر نے اپنی رزمیہ نظم میں لاہور کا اسی طرح ذکر کیا ہے۔

ایسے ماحول میں استاد احمد پیدا ہوا ہوگا جو اس شہر کے اب تک کے پیدا ہونے والے عمارین میں عظیم ترین عمّار تھا۔ ہمیں اس شخص کے بارے میں مزید کھوج کرنے کی اشد ضرورت ہے تا کہ اس کے تاج محل سمیت تمام کارہائے نمایاں کو مناسب تناظر میں رکھا جا سکے۔

●○●○●○●

لاہور کے یہودیوں کی پُراسراری

اندرون شہر میں بغدادی چور کی اصطلاح آج بھی ایک زیرک سوداگر کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ ''سنیچر تیلی'' کا محاورہ اب مستعمل نہیں رہا، لیکن چالیس کی دہائی تک تھا۔ لاہور کے قحبہ خانوں میں ایسی طوائفیں موجود تھیں، جنہیں ''یہودی کی لڑکی'' کہا جاتا تھا۔

ہم میں سے بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ شہنشاہ اکبر کے ایّام میں لاہور میں چھوٹی سی یہودیوں کی برادری موجود تھی۔ جنہوں نے بہت جلد اپنے آپ کو عیّار تاجروں اور ساہوکاروں کی حیثیت سے مستحکم کر لیا تھا۔ جب انگریزوں کی رخصتی کا وقت آیا تو یہودی عروج پر تھے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں انہوں نے لاہور کی معاشرت پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے لاہور کی تجارت اور مالیاتی حلقوں میں اپنی گرفت مضبوط کر لی ہوئی تھی۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ ان کی عصمت فروشی کے دھندے پر بھی مضبوط گرفت تھی۔ جو اُن دنوں اور آج بھی اپنے انوکھے طریقِ کار سے ''مقتدر طاقتوں'' پر کچھ نہ کچھ گرفت ضرور رکھتی ہے۔ تقسیم کے اعلان سے چند ماہ پہلے ہی یہ لوگ لاہور چھوڑ کر بمبئی (اب ممبئی) چلے گئے تھے، جہاں پانچ ہزار پانچ سو یہودی آج بھی آباد ہیں۔ اسرائیلی یہودی، ان کی ''ہندوستانی یہودی'' کی حیثیت سے درجہ بندی کرتے ہیں۔

یہ یہودی کون تھے اور کہاں سے آئے تھے؟ برصغیر میں یہودیوں کے تین نمایاں فرقوں کی میراث پائی جاتی ہے۔ بنی اسرائیل، کوچن یہودی اور یورپی سفید فام یہودی۔ ہر فرقہ، یہودیت کے اہم عناصر پر عملدرآمد کرتا تھا اور ان کے اپنے اپنے فعال صعومے تھے۔ ان ہندوستانی یہودیوں میں پرتگالی رسوم زیادہ فائق تھیں۔ یہودیوں کے بارے میں ایک تحریر میں، جو 1903ء میں شائع ہوئی تھی، بنی اسرائیل (اسرائیل کی اولاد) بنیادی طور پر بمبئی، کلکتہ، پرانی دِلّی، احمد آباد اور لاہور میں رہائش پذیر تھے۔ بنی اسرائیل کی پیدائشی زبان مراٹھی ہے، اسی لیے بہت سے پنجابی ان کو گجراتی میمن سمجھ بیٹھتے ہیں۔ جنوبی ہندوستان کے کوچن یہودی ملائیلم زبان بولتے ہیں، جبکہ سفید فام یہودی بنیادی طور پر انگریزوں کے ساتھ چلے آئے تھے اور چند ایک سکھوں کی قریب الاختتام

حکومت کے ایّام میں یورپ سے آئے تھے۔

لاہور کے یہودیوں پر کچھ تحقیق کرنے پر برسٹو کے چند دلچسپ مشاہدات سامنے آئے ہیں۔ وہ اپنے مقالے ''یہودی اور سفید فام غلامی'' کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''یہودیوں کی عصمت فروشی کا کاروبار پورے یورپ کے علاوہ دنیا بھر میں پھیلا ہوا تھا۔ جہاں بعض اوقات یہ فرانسیسی، اطالوی، چینی اور دوسرے کاروباری حلقوں سے متجاوز کر جاتے تھے۔ پنجاب کے دارالحکومت لاہور میں طوائفوں کے دلال اپنی کسبیوں کو پیسے پیسے کا محتاج کر کے چھوڑ کر چلے جانے کے عادی تھے اور دوبارہ اُسی وقت واپس آتے تھے جب ان کسبیوں نے کچھ رقم پس انداز کر لی ہوتی تھی۔'' اس دعویٰ کی تصدیق کے لیے میں اندرون شہر کے اندر واقع تحصیل بازار میں ایک پرانے دوست کو ملنے گیا۔ اس نے بتایا کہ جنگِ اوّل کے خاتمے کے بعد، یہودی ساہوکار اور دلال بڑی تعداد میں لاہور میں رہتے تھے۔ کسی شخص کی یہودی کی کسّی سے چھیڑ چھاڑ کی جرأت نہ تھی اور کسی کسبی کی بھی جرأت نہ تھی کہ وہ یہودی کو دھوکا دے۔

اندرون شہر کے چند عمر رسیدہ بزرگوں کے مطابق یہودیوں کی معبدگاہ تحصیل بازار میں ہوا کرتی تھی۔ میں نے اپنے طور پر پوری کوشش کی کہ اس جگہ کی نشاندہی کر سکوں، لیکن کامیاب نہ ہو پایا۔ سوائے اس امکان کے کہ یہ جین منزل میں ہی ہو جو اَب بھی وہاں استادہ ہے۔ اس بات کو کھنگالنے کی ضرورت ہے کہ یہ لاہور کے یہودی کون تھے؟

بنی اسرائیل کا دعویٰ ہے کہ وہ اُن یہودیوں کی نسل میں سے ہیں جو دوسری صدی قبل از مسیح گیلیلی میں ایذا رسانی سے بچ کر فرار ہو گئے تھے۔ بنی اسرائیل غیر یہودی مراٹھی لوگوں سے صوری طور پر اور رسم و رواج میں مشابہت رکھتے ہیں، جس سے یہودیوں اور ہندوستانیوں کی آپس میں شادیوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ بنی اسرائیلی یہودیوں نے بہرطور اپنے قوانینِ خورد و نوش، ختنے کرانے اور یومِ سبت منانے، یعنی بروز ہفتہ چھٹی کرنے کے رسم و رواج پر عملدرآمد قائم رکھا۔

بنی اسرائیل کا کہنا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد گیلیلی میں تیل نکالنے کا کام کرتے تھے اور وہ ایک بحری جہاز کی تباہی کے بعد زندہ بچ رہنے والے افراد کی اولاد ہیں۔ اس سے ''سنیچر تیلی'' کی اصطلاح کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں بغداد سے آنے والے یہودیوں نے انہیں ''دریافت'' کیا جس سے دوسری اصطلاح ''بغدادی چور'' کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ سرائے اکبری دروازہ کے بہت سے حوالوں میں عرب سرزمین سے تعلق رکھنے والے یہودیوں کا ذکر ملتا ہے جہاں مغرب سے آنے والے اونٹوں کے قافلے ٹھہرا کرتے تھے۔ اس وقت تک بنی اسرائیل یہودی مذہب کے چند ایک ظاہری حلیے والی رسومات پر ہی عملدرآمد کیا کرتے تھے (اسی لیے تو ان کی پہچان ہو پائی)، مگر ان کا اپنا مذہبی عالم کوئی نہ تھا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی

عیسوی میں بغداد اور کوچن کے یہودی اساتذہ نے ان کو رائج الوقت یہودیت کی تعلیم دی۔

یورپ سے یہودی تاجروں نے تجارت کی غرض سے قرونِ وسطیٰ (پانچویں سے لے کر پندرھویں صدی کا درمیانی زمانہ) میں ہندوستان کا سفر کیا، لیکن یہ واضح نہیں کہ آیا انہوں نے جنوبی ہندوستان میں کوئی مستقل آبادکاری بھی کی یا نہیں؟ ایک تحقیق کے منبع کے مطابق ''یہودیوں کے ہندوستان میں رہائش پذیر ہونے کی پہلی قابلِ اعتبار شہادت گیارھویں صدی کے اوائل میں ملتی ہے۔ یہ یقینی بات ہے کہ اوّلیں یہودی بستیاں مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ مرکوز تھیں۔ ابراہیم ابنِ داؤد کا بارھویں صدی میں ہندوستانی یہودیوں کا حوالہ بدقسمتی سے مبہم ہے اور ہمیں ہندوستانی یہودیوں کے بارے میں مزید حوالے کئی صدیوں بعد ملتے ہیں۔''

کوچن کے اوّلیں یہودی عرفِ عام میں ''کالے یہودی'' کہلاتے تھے، جو ملایلم زبان بولتے تھے۔ سفید فام یہودی بعد میں ہالینڈ اور سپین سے آ کر ہندوستان میں آباد ہوئے۔ ہسپانوی اور پرتگالی یہودیوں کی پندرھویں صدی میں قائم ہونے والی ایک نمایاں بستی گوا تھی، لیکن یہ بستی بالآخر غائب ہوگئی۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ اور سپین سے یہودی آبادکاروں کی کوچن میں وفور آمد ہوئی۔

کوچن کے یہودیوں کا کہنا ہے کہ وہ ستّر سنِ عیسوی میں عبادت خانے کی تباہی کے بعد کرینگانور (ہندوستان کا جنوب مغربی ساحل) چلے آئے تھے۔ درحقیقت کئی صدیوں تک ان کی اپنی ریاست تھی، حتیٰ کہ پندرھویں صدی میں دو بھائیوں کے مابین سربراہی کا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا۔ 1524ء میں کالی کٹ کے حکمران نے کرینگانور کے یہودیوں پر یہ بہانہ کر کے، کہ وہ کالی مرچ کی تجارت میں ملاوٹ کر رہے تھے، حملہ کر دیا۔ زیادہ تر یہودی کوچن بھاگ گئے اور وہاں کے ہندو راجہ کی پناہ میں آ گئے۔ اس نے انہیں قصبے کے لیے زمین عطا کر دی جس کا بعد ازاں نام ''یہودی ٹاؤن'' پڑ گیا اور آج بھی اسی نام سے پہچانا جاتا ہے۔

کوچن کے یہودیوں کی بدقسمتی کہ پرتگالیوں نے اسی اثنا میں اس جگہ پر قبضہ کر لیا اور یہودیوں کی ایذا رسانی میں مشغول ہو گئے، حتیٰ کہ ولندیزیوں نے انہیں نکال باہر کیا۔ پروٹسٹنٹ ولندیزی خاصے رواداری والے لوگ تھے، چنانچہ یہودی خوشحال ہوتے گئے۔ 1795ء میں کوچن انگریزوں کے دائرۂ اثر میں آ گیا۔

سولہویں اور سترھویں صدی عیسوی میں بڑے پیمانے پر نقل مکانی ہوئی اور ایران، افغانستان اور وسطی ایشیا سے آنے والے یہودیوں نے شمالی ہندوستان اور کشمیر میں اہم بستیاں آباد کیں۔ سو سے زائد یہودی لاہور آ گئے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں یہودی برادری کی سب سے بڑی آبادی بمبئی میں تھی۔ بنی اسرائیلی، ایرانی اور بغدادی یہودیوں کی طرح، بمبئی میں رہائش پذیر تھے۔

اٹھارویں صدی کے بعد ہندوستانی یہودیوں کا ایک تیسرا فرقہ سامنے آیا۔ یہ مشرقِ وسطیٰ کے یہودی تھے جو بذریعہ تجارت ہندوستان چلے آئے تھے انہوں نے ایک جال بچھا دیا جو ایسپو سے بغداد تک، بصرہ سے

سورت تک، بمبئی سے کلکتہ، رنگون، سنگاپور، ہانگ کانگ تک پھیلا ہوا تھا اور بالآخر کوبے جاپان تک سلسلے تھے۔ ان تمام مقامات پر تاجروں میں پکّے خاندانی بندھن تھے۔

لاہور آنے والے یہودیوں میں زیادہ تعداد بغدادی یہودیوں کی تھی اور وہ تقریباً تمام کے تمام ساہوکار اور تاجر تھے۔ جلد ہی وہ دیگر پیشوں میں بھی دخیل ہو گئے اور خاصا اثر ورسوخ اور اعتماد حاصل کرنے کے بعد عصمت فروشی کے دھندے میں آ گئے۔ جب انگریزوں نے بساط لپیٹی تو سب سے پہلے یہودی چلے گئے اور اپنے پیچھے صرف دھاگوں کی طرح الفاظ چھوڑ گئے جن کے ٹکڑے جوڑ کر کہانی بنائی جا سکتی ہے جو ہماری تاریخ کا ایک حصہ ہے اور ایک روز ہمیں یہ کہانی آپ کو سنانی پڑے گی۔

●○●○●○●

شہر کا سب سے بڑا دھماکا

اس میں کوئی شک نہیں کہ حصاری اندرونِ شہر لاہور پچھلی صدیوں میں کئی بار آگ سے خاکستر، لوٹ مار کا شکار اور کھنڈرات میں تبدیل ہوا، لیکن ہر بار یہ اَز سرِ نو زندگی بحال کر لیتا تھا۔ اگرچہ بیرونی عوام ان مصیبتوں کا باعث ہوتے تھے۔ لیکن ایسا وقت بھی آیا کہ اندرونی عوامل ہی نے اپنے باسیوں کو اچھی خاصی مصیبت میں مبتلا کر دیا۔

1809 سن عیسوی یا 1864 سن بکرمی جیت، میں لاہور کی تاریخ کا سب سے بڑا دھماکا ہوا۔ لاہور اور پنجاب کا حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ تھا اور اس نے ہر محفوظ مقام کو اسلحہ خانے اور حربی آلاتِ جنگ کے گودام میں تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ تمام بڑی بڑی مساجد، بشمول قلعہ لاہور کے مدمقابل مشہور و معروف بادشاہی مسجد، فوجی استعمال میں لائی جا چکی تھیں۔ ایک فرانسیسی مصنف کے مطابق دنیا کے کسی بھی شہر میں لاہور کے حصاری اندرونِ شہر سے زیادہ آلاتِ جنگ کے فوجی گودام نہ تھے۔

مہاراجہ مکمل طور پر اسلحے سے لیس تھا اور اس کے پاس اسلحے اور گولہ بارود کے اتنے ذخائر تھے کہ وہ مشرق اور جنوب میں تیزی سے پھیلتی ہوئی انگریزی افواج سے اور ساتھ ہی ساتھ شمال مغرب سے غیر متوقع افغانیوں سے بھی طویل جنگ آزمائی کر سکتا تھا۔ اس کے زمانے کی سیمابی صورتِ حال کے پیشِ نظر اس کی احتیاط سمجھ میں آتی تھی۔ لاہور کی دو سب سے وسیع حویلیوں میں سے بلاشبہ حویلی میاں صاحب وسیع ترین تھی۔ کنہیا لال کی ایک تحریر کے مطابق یہ حویلی دو مربع میلوں سے زائد رقبے پر محیط تھی۔ شاہ جہان کے عہد کی ایک تحریر کے مطابق اس کا پھیلاؤ ''چار کوس'' تھا، جو لوگ اندرونِ شہر سے واقف ہیں اس کا صرف ایک حصہ، تین منزلہ حویلی کا مردانہ حصہ، رنگ محل کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ اس دور سے رنگ محل کا نام چلا آتا ہے۔ مغلیہ دور میں تعمیر شدہ اس حویلی کے ایک حصے پر رنجیت سنگھ نے قبضہ کر لیا اور اسے اسلحہ اور گولہ بارود کا گودام بنا دیا۔ لیکن اس نے دوسری وسیع حویلی کو مکمل طور پر اپنی تحویل میں لے لیا ''پتھروں والی حویلی'' پتھروں سے تعمیر کردہ موچی دروازے کے

حویلی نواب میاں خان پر سکھ حکمران نے قبضہ کر کے اس کا استعمال بطور اسلحہ ساز کارخانہ شروع کر دیا۔اس کے بڑے بڑے کمروں کو توپوں کے بارود اور بم بنانے اور اسلحہ خانے کے دیگر مواد کے گودام بنا دیئے۔ پوری جگہ پر ''غیر ملکی'' ماہرین مامور تھے جو جدید ترین توپوں کے گولے اپنی زیر نگرانی تیار کراتے تھے اور پورے علاقے پر سخت پہرہ ہوتا تھا۔ اندازہ کیجئے کہ اس زمانے کا پورے اندرون شہر میں دوسرا وسیع ترین گھر ہونا کیا معنی رکھتا تھا جبکہ شہر کی کل آبادی صرف تہتر ہزار نفوس تھی۔ اس کا رقبہ ایک تخمینے کے مطابق ''اگر ارد گرد پیدل چلیں تو تقریباً ایک کوس بنتا تھا۔'' 1809ء میں، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت کے دسویں سال میں، اس کے ایک کمرے میں دھماکا ہوا جس سے ایک ایسا زلزلہ آیا کہ پورا شہر اس طور سے ڈولنے لگا جس کا انہیں پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اس کے بعد کبھی پھر ایسا ہوا۔ ساری حویلی فضا میں بھک سے اُڑ گئی اور اس کے پتھر شہر کے تقریباً ہر مکان پر آ کر گرے۔ ایک تخمینے کے مطابق پانچ سو سے زائد لوگ ہلاک ہوئے۔

کنہیا لال کے مطابق تقریباً دو سو افراد کا فوری طور پر انتقال ہو گیا اور ہزاروں افراد بری طرح زخمی ہوئے۔ موچی دروازے کا پورا علاقہ عرصہ دراز تک بم زدہ جگہ کا منظر پیش کرتا رہا اور کئی برس تک لق و دق ویران رہا۔ ''حویلی سے پتھر پانچ کوس دور تک جا کر گرے۔'' دھماکے کے بارے میں ایک تحریر میں بیان میں بتایا گیا تھا۔ اس دھماکے سے سینکڑوں گھر زمین بوس ہو گئے اور اُڑتے ہوئے پتھروں نے اس دھماکے کی حدود کے ارد گرد پورے علاقے کو نقصان پہنچایا۔

جنرل وینچورہ کی یادداشتوں کے مطابق اس دھماکے میں دو فرانسیسی انجینئر اور ایک توپ خانے کا ماہر روسی انجینئر اور بے شمار تربیت یافتہ پنجابی کاریگر ہلاک ہوئے، اس دھماکے نے لاہور کی خوبصورت ''حویلی نواب میاں خان'' یا عرف عام میں ''پتھروں والی حویلی'' کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ دھماکے کے دو برس بعد ہی لوگوں نے حویلی کے حصوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس مشہور عمارت کے تمام آثار ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گم ہو گئے۔

حویلی نواب میاں خان کے دھماکے سے اندرون شہر کے اندر واقع آبادیوں والے علاقوں میں اسلحے کی ذخیرہ اندوزی کی حکمتِ عملی میں واضح تبدیلی آ گئی۔ سکھ حکمران نے بڑی بڑی مساجد کو، ماسوائے مسجد وزیر خان، اس کام کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ تقریباً تمام گولہ بارود کے ذخائر رہائشی علاقوں سے نکال لیے گئے اور سکھ مثل سرداروں کو ان مکانوں میں آباد کر دیا گیا۔ اس کا دوہرا فائدہ ہوا ایک تو اس کے حلیف خوش ہو گئے۔ دوسرے حرم کے راستے سے دور آبادی کے لیے یہ ایک بڑی تنبیہ بھی تھی۔ اگرچہ مسلمان آبادی نے، جو

اَب اکثریت میں تھی، اس بات کا برا منایا تھا۔ جب انگریزوں نے لاہور پر قبضہ کیا تو انہوں نے اس جگہ کا، جہاں کبھی حویلی ہوا کرتی تھی، معتد بہ حصہ اپنے قریب ترین کابلی حلیف کو تحفتہً دے دیا۔ تمام علاقے کو پرانے آثار کے خطوط پر اَز سرِ نو تعمیر کیا گیا اور زیادہ تر نقصان شدہ عمارات کی بھی مرمت کی گئی۔ چنانچہ اس کا شمار اندرونِ شہر کے اعلیٰ ترین رہائشی علاقوں میں ہونے لگا۔ اس علاقے کے لوگوں کو علم ہونا چاہیے کہ ان کے گھر، جہاں اب قائم ہیں، اس جگہ پر تعمیر ہوئے تھے جہاں لاہور کی تاریخ کا سب سے بڑا دھما کا ہوا تھا۔

●○●○●○●

بھگت سنگھ اور خونی دائرہ

لاہور کے بارے میں ایک کہانی مجھے عزیز از جان ہے اور وہ ہے بھگت سنگھ کی کہانی، جو لاہور اور اس برصغیر کا عظیم حریت پسند تھا۔ فرقہ وارانہ نفرت کی کتنی بھی بڑی مقدار اس شخص کی یاد دماغ سے محو نہیں کر سکتی، جو لاہور کی گلیوں میں فخر سے سر بلند کر کے چلتا تھا اور جسے سینٹرل جیل میں، جو اَب ڈھے چکی ہے، پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

جب ہم چھوٹے بچے تھے تو ہم نے بھگت سنگھ کے بارے میں ایک عجیب کہانی سنی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ اس کی آتما (روح) شاہ جمال علاقے کے گرد اور بابا شاہ جمال کے مزار کے قریب چکر لگاتی رہتی تھی۔ بہت سے لوگوں کا کہنا تھا کہ انہوں نے بزرگ صوفی کے پرتو کو بھگت سنگھ سے باتیں کرتے اور وعدہ کرتے دیکھا ہے کہ اس کے ساتھ جو سخت ناانصافی ہوئی ہے، اس کا ازالہ کریں گے۔ میں نے یہ کہانی اپنے باورچی سے سنی تھی جو اکثر شاہ جمال کے مزار کی زیارت کو جایا کرتا تھا۔ میرے والد خود ایک اعلیٰ پیمانے کے کہانی کار تھے۔ انہوں نے کبھی اسے سچ تسلیم نہیں کیا، اگرچہ میں نے انہیں کافی تنگ کیے رکھا۔ انہوں نے شک کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھا۔ ''ہو سکتا ہے یہ سچ ہو اور ہو سکتا ہے نہ ہو۔ تمہیں انتظار کرنا ہوگا اور ایک روز سچ سامنے آ جائے گا۔'' اور سچ ایک روز آشکار ہو ہی گیا۔

کم لوگوں کے علم میں ہے کہ شادمان اور شاہ جمال کا علاقہ کبھی ''لہنا سنگھ دی چھاؤنی'' یعنی لہنا سنگھ کی چھاؤنی کہلاتا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں لاہور کے سہ فریقی سردار حکمرانوں میں سے ایک سردار لہنا سنگھ، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے برسر اقتدار آنے سے قبل، حکومت کرتا تھا اور انگریزوں کی توسیع پسندی کو دریائے ستلج تک محدود رکھنے کی خاطر اپنی سلطنتِ پنجاب کو استوار کر رکھا تھا۔ اس چھاؤنی کے عین وسط میں ایک بڑا وسیع و عریض گھر تھا، تقریباً عین اس جگہ جہاں آج کل جیل روڈ سے آتے ہوئے دوسرا گول چکر واقع ہے۔ یہ چوراہا بابا شاہ جمال کے مزار سے نزدیک ترین ہے۔ صوفی بزرگ اس مقام سے صرف دو سو گز دور محوِ خرام ہیں۔ اسی بناء پر اس علاقے کا یہی نام بھی ہے۔

عوامی روایت کے مطابق قصور کے خان صاحبان نے، جو لاہور دربار کا تخت الٹنے کی سازش میں

انگریزوں کے ہم شریک تھے، ایک ایلچی بھیجا تا کہ وہ ایک سکھ سردار سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے قتل کی سازش کے بارے میں بات چیت کرے۔ بحث و تمحیص کے دوران کچھ گڑ بڑ ہوگئی اور ایلچی کا سر قلم کر کے قصور بھیج دیا گیا۔ قصور کے غدار پٹھان حکمران غداروں سے ہی پٹ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک صاحبِ بصیرت نے اس وقت پیش گوئی کی تھی کہ ایلچی کی روح اسی جگہ پر انتقام لے گی اور یہ کہ انتقام کا دائرہ ایک ہلاکت سے مکمل نہیں ہوگا۔ جھرجھری پیدا کرنے والی بات ہے نا! لیکن پھر بعد میں پیش آنے والے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ پیش گوئی سچ تھی اور بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ غداری کا دائرہ اب بھی رواں ہے۔

سکھ حکمران انگریزوں سے شکست کھا گئے اور قصور کے حکمران اس سارے عرصے میں غداری کا کردار ادا کرتے رہے۔ انہوں نے اپنے سامنے، ملّا حضرات کی مدد سے، بزرگ صوفی بلھے شاہ کو تنگ کیا اور انہیں اپنے تعصب کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔ لہنا سنگھ کا گھر اور اس کی چھاؤنی مسمار کر دی گئی اور اس کی جگہ پنجاب کی سب سے بڑی جیل تعمیر کر دی گئی جہاں لمبی مدت کے قیدیوں اور موت کے سزا یافتہ قیدی رکھے جاتے تھے۔ اس جگہ جہاں لہنا سنگھ کا گھر تھا وہاں پھانسی گھاٹ بنا دیا گیا اور یہاں کئی حریت پسندوں کو پھانسی پر چڑھایا گیا۔ موت کی جگہ اپنا مقصد مسلسل پورا کرتی رہی۔

1928ء میں جب انگریزی اقتدار سے ہمارے وطن کو آزاد کرانے کی کوشش زور پکڑ رہی تھی تو لاہور میں جلوس کے دوران عجائب گھر کے عین سامنے، ایک مشہور و معروف حریت پسند، لالہ لاجپت رائے کو پولیس لاٹھی چارج کے دوران سر پر لاٹھی پڑی جس کے نتیجے میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اس سے پورے ہندوستان میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور ایک اکیس سالہ نوجوان انقلابی نے، جس کا نام بھگت سنگھ تھا، انتقام لینے کا ذمہ اٹھالیا۔ 17/ نومبر 1928ء کو اس نے گورنمنٹ کالج لاہور کے نیو ہاسٹل کی پہلی منزل کی کھڑکی میں پوزیشن لے لی اور وہیں سے اس نے ایک پولیس افسر کو مسٹر سکاٹ سمجھ کر اس پر فائر کھول دیا۔ مسٹر سکاٹ کے بجائے اے ایس پی لاہور مسٹر سانڈرز کی ہلاکت ہوگئی۔ بھگت سنگھ فرار ہو کر کلکتہ چلا گیا اور پھر آگرہ لوٹ آیا، جہاں اس نے مبینہ طور پر بم بنانے کا کارخانہ کھول لیا۔ اسے قانون ساز اسمبلی پر، جو ڈراؤنے تجارتی اختلافات کا قانون پاس کرنے والی تھی، بم پھینکتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا۔ ایک تحریر میں رقم ہے کہ اس نے چیخ چیخ کر یہ کہتے ہوئے سپردگی دے دی کہ انگریز اسے کبھی ہلاک نہیں کر سکتے اور یہ کہ اسے تاریخ کو تفویض کر دیا گیا تھا اور یہ کہ اگر اسے ہلاک کیا گیا تو اس کا بہنے والا خون سرخ تر ہوگا۔

بھگت سنگھ پر مقدمہ چلا اور اسے 7/ اکتوبر 1930ء کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ انگریز اس جواں سال شخص سے اس قدر خائف تھے کہ پورے ہندوستان میں کوئی مجسٹریٹ اس کی موت کے پروانے پر دستخط کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ آخر کار انہوں نے قصور کا رخ کیا جہاں انگریزوں کے ایک وفادار مجسٹریٹ نے، جس کا نام نواب محمد احمد

خان تھا جو بعد ازاں قصوری کہلایا، ضروری کاغذات پر دستخط کر دیئے اور پھانسی پر عملدرآمد کی نگرانی کی۔ نڈر اور برصغیر کی آزادی کے نعرے لگاتا ہوا راوین بھگت سنگھ (ایک تحریر میں اسے نیشنل کالج کا طالب علم لکھا گیا ہے) کو 23/مارچ 1931ء کو لاہور سینٹرل جیل کے اس مقام پر پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا گیا جہاں کبھی لہنا سنگھ کی رہائش گاہ تھی اور جہاں پنجاب سے غداری کا مرتکب نواب محمد احمد خان قصوری کا ایک رشتہ دار ہلاک ہوا تھا۔ بزرگ کہتے ہیں کہ اس روز سوگ میں پورے ملک میں ایک بھی چولہا نہ جلا تھا۔

اب اس خونی کہانی میں ایک عجیب موڑ آتا ہے۔ 1975ء میں اب ایک معروف قاتلانہ حملے کی کوشش اس نواب محمد احمد خان قصوری کے بیٹے پر کی جاتی ہے، وہی قدیم مجسٹریٹ جس نے بھگت سنگھ کو پھانسی دینے کا حکم جاری کیا تھا، خود عین اسی مقام پر بندوق کی گولی سے ہلاک ہو گیا جہاں لہنا سنگھ کے آدمیوں نے قصور کے ایک غدار کا سر قلم کیا تھا اور جہاں بھگت سنگھ کو اسی مجسٹریٹ نے پھانسی لگوائی تھی۔ اس مشہور قتل کی وجہ سے مشہور پاکستانی وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی، تاکہ خون بہنے کا دائرہ رواں رہے۔ یہ کہاں رکے گا؟ ہمیں نہیں معلوم۔ ہو سکتا ہے کوئی صاحبِ بصیرت آئے اور ہمیں بتا پائے۔

●○●○●○●

گیونچی سے موصولہ خط

اندرونِ شہر لاہور میں قدیم ترین عبادت گاہ ''جین مندر'' کی تحقیق کے سلسلے میں جو بالآخر میں نے بازارِ حکیماں سے شروع ہونے والے تحصیل بازار کے آخری سرے پر تلاش کر لیا، بھاٹی اور لوہاری دروازوں کی حدود کے شمالی کنارے پر میں اللہ بخش سے ملا۔

پچانوے برس کی عمر میں وہ بظاہر خوش باش شخص تھا۔ وہ اپنے بیٹوں اور پوتوں کے ہمراہ رہتا ہے اور علاقے میں ہر شخص اس کی عزت کرتا ہے کیونکہ ان کے مطابق اس کا تعلق ''پہلی بڑی جنگ'' کے زمانے سے ہے۔ جب اسے یقین دلا دیا گیا کہ اسے مجھ سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تو اس نے اپنے باپ کی جانب سے موصول شدہ براؤن رنگت کا ایک پوسٹ کارڈ دکھایا۔ اس کا باپ جو کبھی واپس نہیں آیا۔ اُسے یہ آخری خط گیونچی کے مقام سے موصول ہوا تھا۔ اس پر دسمبر 1914ء کی تاریخ ثبت تھی اور یہ انگریزی زبان میں تھا۔ اس کا باپ اس زبان سے نابلد تھا۔ لکھنے والا لاہور ڈویژن کا، سپاہی امیر بخش تھا، جو فرانس کے پادو کیلے میں گیونچی کے مقام پر تعینات تھا۔ بہت مختصر سا پوسٹ کارڈ اس کی صحت کے بارے میں بتاتا ہے جو ٹھیک ٹھاک تھی اور یہ کہ ''ہم جلد ہی محاذِ جنگ پر جانے والے ہیں۔ برائے مہربانی میرے لیے دعا کریں۔''

اندرونِ شہر ایک دلفریب جگہ ہے کیونکہ ان دیواروں کے اندر لوگ اُن یادوں کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں جو جدید لاہور کی حقیقت سے نوری میل دُور ہیں۔ ہمارے لیے گیونچی ایک مشہور پرفیوم ہے اور اللہ بخش کے لیے یہ ایک قیمتی یاد ہے۔ فرانس میں کیلے کے نزدیک ایک قدیم میدانِ جنگ سے اس کے باپ کے آخری الفاظ۔ جب تک اللہ بخش کی ماں زندہ رہی، اسے گیارہ روپے کی قلیل پنشن ملتی رہی۔ وہ برصغیر کی تقسیم کے ہنگاموں میں تحصیل بازار میں اس وقت انتقال کر گئی تھی، جب سکھوں کے مٹر گشت کرتے ہوئے ایک جتھے نے اُسے بڑی سفاکی سے ذبح کر دیا تھا۔ بدلے میں مسلمان قصابوں کے ایک گروہ نے اگلے ہی روز اسی بازار میں دو سکھ عورتوں کو ذبح کر ڈالا۔ چنانچہ اللہ بخش کے ماں باپ دونوں قطعی مختلف حالات میں اور مختلف مقامات پر متشدد

موت کا شکار ہوئے۔ عجیب سا لگتا ہے!

گیونچی سے موصول ہوئے اس خط نے مجھے مسحور کر دیا اور میں اس تحقیق میں مشغول ہو گیا کہ لاہوری کیسے فرانس میں اتنی دور جا کر جنگیں لڑتے رہے۔ اس گاؤں کے متعلق ویب سائٹ کا کہنا ہے: ''جنگِ عظیم اوّل کے بالکل اوائل میں 18 ردسمبر 1914ء کے روز، فرانس کے پادو کیلے میں اساطیری اہمیت کے حامل گیونچی گاؤں پر قبضے کے لیے لاہور ڈویژن اور جرمنی کی فوجوں کے درمیان گھمسان کا رَن پڑا۔ پانچ روزہ دست بدست جنگ میں چار ہزار سے زائد ہٹیلے لاہوری شہید ہو گئے۔ جرمنی کی افواج کی بھی دو ہزار نفوس سے زائد ہلاکتیں ہوئیں۔''

اٹھارہ سے بائیس دسمبر 1914ء تک لڑی جانے والی جنگِ گیونچی میں ایک اساسی پیش قدمی ہوئی۔ انگریزی فوج کو فرانس کے پادو کیلے میں، جو انگریزوں کے زیرِ تسلط تھا، گیونچی گاؤں کے اردگرد خندقوں میں مورچہ بند، مضبوطی سے قدم جمائے، جرمنی کی فوج (اور جوابی حملے میں) کی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ آراس کے مقام پر فرانسیسی سخت دباؤ میں تھے۔ اسی لیے حکم جاری کیا گیا کہ انگریزی فوج انہیں اس دباؤ سے نجات دلانے کی خاطر گیونچی کے اردگرد موجود جرمن فوجوں پر حملہ کر دے تا کہ آراس کی جانب، کم از کم وہاں سے جرمن فوج کمک بھیجنے سے باز رہے۔ اس کام کے لیے لاہور ڈویژن کا انتخاب کیا گیا اور انہیں جنگ میں جھونک دیا گیا۔ سلطنتِ برطانیہ کی توپوں کا بہترین ایندھن۔ انیس دسمبر کو لاہور ڈویژن کی پنجابی سپاہ نے حملہ کر دیا اور جرمن خندقوں کی دو قطاروں پر کامیابی سے قبضہ جما لیا۔ بہرصورت ان کی یہ فتح عارضی ثابت ہوئی۔ فوری اور جارحانہ جوابی حملے میں پنجابی سپاہ کو ایک بار پھر پیچھے دھکیل دیا گیا۔

اگلے روز گیونچی کے گرد و نواح کی جرمن افواج نے، جنہیں کمک پہنچ چکی تھی، ایک بھاری حملے میں برطانوی فوج کو اچانک آ لیا۔ جرمن فوج نے پوری طاقت ان خندقوں پر مرکوز رکھی جس پر لاہور ڈویژن کی سپاہ نے ایک روز قبل حملے کے آغاز میں ہی قبضہ کر لیا تھا۔

لاہور ڈویژن کی خندقوں میں دفاعی حکمتِ عملی کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ پانچ روز تک لاہوری، بغیر سوئے سخت سردی میں، پانی سے بھری خندقوں میں کھڑے رہے نتیجتاً ہزاروں کی تعداد میں جرمن سپاہ نے سینکڑوں لاہوریوں کی اس دفاعی دیوار کو سنگینوں سے توڑ دیا اور گیونچی کے ایک حصے پر قبضہ کر لیا۔ اس پسپائی پر برطانوی محفوظ پیدل فوج کے دو تازہ دم دستوں کو حرکت میں لایا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 20 دسمبر کو گاؤں دوبارہ انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔ اگلے روز ایک تازہ کمک سپاہ نے لاہوریوں کی لاہور ڈویژن کو عیوضی کے ذریعے ڈیوٹی سے برخاست کر کے پیچھے بھیج دیا اور ''لائن'' پہلے والی پوزیشن میں آ گئی۔

16 راگست 1914ء کو وار کونسل نے ہندوستان کی انگریز حکومت کو دو پیدل فوجی ڈویژنوں اور ایک کیولری بریگیڈ کو مصر روانہ کرنے کا حکم دیا۔ لاہور اور میرٹھ ڈویژنوں کا انتخاب کیا گیا۔ بعدازاں سکندرآباد کیولری

بریگیڈ کی روانگی پر سب کو ملا کر انڈین آرمی کور بنا دی گئی۔ لاہور ڈویژن کے اوّلیں عناصر پہلے ہی محاذِ جنگ کی راہ پر گامزن تھے۔ ان کا نیا پڑاؤ مارسے تھا، جہاں وہ ستمبر کے اواخر میں پہنچ گئے۔ فرانس جاتے ہوئے لاہور ڈویژن اپنا ایک بریگیڈ نہر سویز کے پاس چھوڑ گئی اور جب جالندھر بریگیڈ کے چند دستے ستمبر کے آخر میں ہندوستان سے عازمِ سفر ہوئے تو صرف فیروز پور بریگیڈ اپنی نفری میں مکمل تھا جو پیچھے رہ گیا تھا۔

مارسے سے لاہوری شمال کی طرف اور لے عین چلے گئے۔ جالندھر بریگیڈ کی سنتالیسویں سکھ رجمنٹ محاذ کی طرف جاتے ہوئے 20/اکتوبر 1914ء کو سینٹ عمر کے قریب پہنچ گئی۔ 22/اکتوبر 1914ء کو فیروز پور بریگیڈ بھی ''نوزائیدہ'' ای پرے سیلیاں پہنچ گیا۔ انہیں شمال میں ھولیبیک اور جنوب میں میسی نیز کے درمیان میں واقع خندقوں میں بھیج دیا گیا۔ لاہور ڈویژن کی پہلی بٹالین جو محاذِ جنگ پر گئی، 57ویں وائلڈز رائفلز تھی (آج بھی والٹن روڈ پر جاتے ہوئے کیولری گراؤنڈ کے چوراہے کے نزدیک اس رجمنٹ کا نام ایک معدوم ہوتی ہوئی دیوار پر لکھا دیکھا جا سکتا ہے۔) وہ وجز شیٹ اووسٹاورن کے مقام پر تعینات تھیں۔ بعد ازاں پوری لاہور ڈویژن اس میں جُت گئی۔

57ویں وائلڈز رائفلز اور 129ویں بلوچ رجمنٹوں کو اکتوبر 1914ء کے آخری دو دِنوں میں بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ (لیپر کی پہلی جنگ میں) وائلڈ رائفلز کی 750 میں سے 300 کی نفری ہلاک ہو گئی۔ بلوچیوں کے 240 سپاہی ہلاک ہوئے، زخمی ہوئے یا پھر قیدی بنا لیے گئے۔ لیپر کی دوسری جنگ میں لاہور شہر کی 47ویں سکھ رجمنٹ 27/اپریل 1915ء کو اکیلے ہی لڑتی رہی اور اس کے کُل 444 میں سے 348 نفوس کام آئے۔ ان لاہوری سکھوں کا آج بھی مال روڈ طفیل روڈ کے چوراہے پر نصب یادگاری تختی پر قابلِ تکریم ذکر موجود ہے۔ بلجیم کی کتھولک یونیورسٹی کے ڈاکٹر جون میئر اپنی کتاب ''جنگِ عظیم اوّل اور لیپر اور اس کے گرد و نواح کی یادیں'' میں رقمطراز ہیں: ''1915ء میں 24/اپریل اور یکم مئی کے مابین ایک ہفتے کے عرصے میں لاہور ڈویژن کی بھرتی شدہ تیس فیصد سپاہ ختم ہو گئی تھی۔ زخمی ایشر سنگھ نے اپنے ایک دوست کو یکم مئی 1915ء کے خط میں لکھا کہ لاہور ڈویژن کا صفایا ہو چکا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ دونوں اطراف میں کوئی بھی زندہ نہیں بچا۔ جب کوئی بھی نہیں ہو گا تو پھر امن کا بول بالا ہو گا۔'' (صفحہ 352) مغربی محاذ پر فرانس اور بلجیم میں چودہ مہینوں کی جنگ میں انڈین کور کے 34252 نفوس ہلاک ہوئے۔ لاہوریوں کے بارے میں ڈاکٹر میئر لکھتا ہے: ''جرمنوں نے اپنے ہیڈ کوارٹرز ایک مشہور پیغام میں لکھا: یہ لاہور ڈویژن کے جنونی لوگ پسپائی اختیار نہیں کرتے جب وہ گھیرے میں آ جاتے ہیں تو وہ فی الحقیقت ہماری سنگینوں کو مبینہ دعوت دیتے ہیں۔''

بہت سال پہلے 1972ء میں جب میں طالب علم تھا تو بلجیم کے لیپر شہر میں مینن گیٹ میموریل پر موجود تھا، تو میں خندقوں اور یادگاری تختی کو دیکھ کر سکتے میں رہ گیا تھا۔ یورپ کے ان ہلاکت خیز جنگی میدانوں

میں میرے شہر اور وطن کے جرّی جوان مارے گئے اور مدفون تھے اور آج انہیں کوئی یاد تک نہیں کرتا۔ ہاں، اللہ بخش ہے جس کے پاس گیونچی سے ارسال کردہ خط موجود ہے۔ لیکن پاکستان آرمی کو چاہیے کہ وہ اپنے اسلاف کی یاد میں ہر سال 22 ردسمبر کو بلجیم میں مینن گیٹ کے لیے لاہور کے خوبصورت اور سرخ گلاب کے پھولوں کا گلدستہ ضرور بھیجا کرے۔ ہمیں اپنے ''گمنام سپاہیوں'' کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔

●○●○●○●

لاہور اور کوماگاٹا مارو

میرے والد ہمیشہ حیرت انگیز واقعات سے لبریز رہتے تھے۔ ایک روز جب، اور یہ 1960ء کی دہائی کا زمانہ تھا، ہم دونوں موچی دروازے کے اندر ایک پتلی سی گلی میں سے پیدل گزر رہے تھے تو وہ ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے رکے اور کہا۔ ''یہ جگہ ہے جہاں وہ شخص رہتا تھا، جس نے کوماگاٹا مارو کو کرائے پر حاصل کیا تھا۔ ایک روز ہمیں اسے اور اس کے ساتھیوں کو اپنے سچے ہیرو تسلیم کرنا پڑے گا۔''

کوماگاٹا مارو میرے شعور میں کئی برس تک موہوم سا خیال رہا۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں کو یہ علم ہی نہیں ہوگا کہ جنگِ عظیم اوّل کے شروع ہونے سے پہلے پنجابیوں کے ایک گروہ نے، جو مغربی دنیا میں کیلیفورنیا میں سونے کی کان کی تلاش میں اور برطانوی حکومت کے خلاف جنگِ آزدی میں شرکت کے لیے مغرب میں جا بسے تھے، مجتمع ہو کر اپنے مادرِ وطن کے لیے کچھ کرنے کا ارادہ کیا۔ ان لوگوں میں سے اکثریت کا تعلق جالندھر، لدھیانہ اور لاہور سے تھا۔ آج بھی کیلیفورنیا کے کسانوں کی خاصی بڑی تعداد لاہور اور اس کے نواحی علاقوں کے پنجابیوں پر مشتمل ہے اور یہ لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کامیاب کسان ہیں۔ اب امریکہ میں ان کی پانچویں نسل رہ رہی ہے۔

امریکہ کے سچی روایت والے ''باغی'' تارکینِ وطن جنہوں نے بالآخر برطانوی طوق کو گلے سے اتار پھینکا تھا اور آزادی حاصل کر لی تھی اور جو ہندوستان یا برصغیر کے تارک الوطن تھے، نے فیصلہ کیا کہ وقت آ گیا تھا کہ وہ امریکہ سے روانہ ہو کر مادرِ وطن پہنچیں اور اپنی سرزمین کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرائیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ اس وجہ سے ہندوستان سے نقل مکانی کر کے امریکہ آ گئے تھے کیونکہ انگریزوں نے غریب کسانوں کو ان کی آبائی زمینوں سے بے دخل کر دیا تھا۔ سونے کے ڈلوں کی فرضی کہانیاں لاہور کے روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ میں چھپتی رہتی تھیں۔ اس لیے بہت سے تعلیم یافتہ لاہوریوں نے امریکہ نقل مکانی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پچھلی صدی کے آخر تک دس ہزار سے زائد پنجابی امریکہ پہنچ چکے تھے۔ اگر ایک لاہوری مچھلی اور آلو کے

قتلے فاک لینڈز میں فروخت کرسکتا ہے تو ان سے مغربی امریکہ پہنچنے کی توقع کیوں نہیں کی جاسکتی؟

ریاست کیلیفورنیا، خصوصاً سان فرانسسکو ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں وہ مقام تھا جہاں نسلی طبقے ہر قسم کے اوٹ پٹانگ اور ناقابلِ فراموش کام کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر چائنا ٹاؤن میں رہا کرتے تھے۔ پنجابی مہاجرین نے، جنہیں اچھے خاصے نسلی امتیازات کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس ملک کی، جہاں وہ رہ رہے تھے، تاریخ سے متاثر ہوکر، جو وہ تھے، ایک انقلابی فوج تشکیل دینے کا فیصلہ کیا۔ ایک منصوبے کے تحت، جو یقیناً دوراز کار تھا، انہوں نے ہندوستان میں بحری راستے سے حملہ آور ہونے کا فیصلہ کیا۔ اندازہ کیجئے سال 1913ء کا ہو اور سلطنتِ برطانیہ اپنے اقتدار کے عروج پر ہو اور ''نیک نیت محبِّ وطن'' لوگوں کا چھوٹا سا گروہ جنوبی ایشیا پر حملہ آور ہوکر اسے انگریزوں سے آزاد کرانے کا فیصلہ کررہا تھا۔ جن پنجابیوں نے اس تحریک کا بندوبست کیا تھا انہوں نے اسے ''غدر'' کا نام دیا، جس کے معنی ہیں ''کھلی بغاوت'' یا احتجاج۔

1915ء میں ان کا منصوبہ مکمل تیار ہوگیا۔ کیلیفورنیا کی بہت سی بندرگاہوں سے پانچ بحری جہاز جو ہتھیاروں اور پراپیگنڈہ سے لیس تھے، بحری سفر پر روانہ ہوگئے۔ برطانوی جاسوس اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ ان لوگوں کو دراصل جرمنی نے جنگ کرنے کی کوشش کرنے پر مالی امداد دی تھی۔ یہ باغی لوگ ہر قسم کے ہتھیار اکٹھے کر رہے تھے اور اپنے آپ کو فوجی خطوط پر منظّم کررہے تھے۔ دلیل یہ تھی کہ اگر امریکی مہاجرین ایسا کرسکتے تھے تو سخت کوش پنجابی بھی کرسکتے ہیں۔ 1913ء میں ''غدر پارٹی'' کا قیام عمل میں آگیا تھا، جس کی ایک ہی مجوزہ تجویز تھی کہ صرف مسلح جدوجہد سے ہی برطانیہ کا تخت الٹا جاسکتا ہے۔ 1913ء میں پہلا اجتماع اسٹوریا کے مقام پر ہوا۔ جہاں لاہور کا سوہن سنگھ بھکنا کو غدر پارٹی کا سربراہ چن لیا گیا۔ لاہوریوں کے پاس قصد کرنے کے بعد اس کے مخفی معنوں پر غور کرنے کا وقت نہیں ہوتا۔ لہٰذا لفظ ''غدر'' اس سرزمین اور عوام کی روایتوں کے مطابق تھا جہاں وہ رہتے تھے۔

قریبی ہمسایہ ملک کینیڈا میں 1914ء کے موسم گرما میں مشہور کوماگاٹا مارو رزمیہ داستان کا راز کُھل گیا۔ ہندوستان کے ایک متمول تاجر کلدیپ سنگھ نے کوماگاٹا مارو کو کرائے پر لے لیا تھا اور وہ مال بردار بحری جہاز ہانگ کانگ سے وینکوور روانہ ہوگیا تھا۔ اس پر 376 پنجابی سوار تھے جن میں سے 340 سکھ تھے جو آدھے سے زیادہ لاہور کے رہنے والے تھے۔ وہ کینیڈا کی جانب رواں تھے جہاں امید تھی کہ وہ مستقل آباد ہوکر ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ جب کوماگاٹا مارو وینکوور پہنچا تو بہت سے مسافروں کو جہاز پر ہی روک دیا گیا۔ انہوں نے دو ماہ انتظار کیا اور ہندوستانی برادری اور محکمہ تارکینِ وطن کے اہلکاروں کے مابین ملک میں داخلے پر جھگڑا جاری رہا۔

کینیڈا کی حکومت کو برطانوی حکومت نے خبردار کردیا تھا، جو اجتماع امریکہ میں اور کینیڈا میں غدر پارٹی کی تشکیل کے مابعد مہاجرین کے اجتماعات کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ ان کوششوں کے باوجود جب

عدالتِ عالیہ نے ان کی تمام درخواستیں مسترد کر دیں تو جھگڑا ہی ختم ہو گیا۔ چنانچہ کوما گاٹا مارو واپس جانے پر مجبور ہو گیا۔ اسے زبردستی کلکتہ بھیج دیا گیا۔ وہاں پہنچنے پر مشکوک برطانوی حکام نے منتظمین کی نیت بھانپ کر پہلے ہی سے خبردار کی ہوئی پولیس نے آلیا۔ جونہی مسافر بحری جہاز سے اترے پولیس نے بلاوجہ فائر کھول دیا اور بیس مسافروں کو ہلاک کر دیا۔

بغاوت میں مدد دینے کے لیے ایک تخمینے کے مطابق آٹھ ہزار ''غداری'' ہندوستان لوٹے تھے۔ بہرصورت انگریزوں کو غداریوں کے منصوبوں کا علم ہو گیا اور 1914ء میں ایک فرمان جاری کر دیا گیا جس کی رُو سے صوبائی حکومتوں کو ہندوستان میں داخل ہونے والوں کی گرفتاری کا اختیار دے دیا گیا۔ غداری لوگ جو بڑے بڑے بحری جہازوں جیسے کوما گاٹا مارو، نام سنگ اور ایس ایس کوریا میں آئے، سب دھر لیے گئے۔ بہت سے دیگر غداری لوگ کولمبو، بمبئی اور مدراس کی بندرگاہوں کے ذریعے آئے۔ بغاوت کی تاریخ 21 رفروری 1913ء مقرر کی گئی تھی جسے آخری لمحات میں کم کر کے 19 رفروری کر دیا گیا کیونکہ انگریزوں کو ان کے منصوبوں کا پتہ چل گیا تھا۔

حکام نے بڑی تیزی سے عمل کر کے اور کوہاٹ، بنوں اور دیناپور کے گریزنوں میں تعینات ہندوستانی سپاہیوں کو بے ہتھیار کر کے قید میں ڈال دیا۔ غدار پارٹی کے سینکڑوں قائدین کو گرفتار کر کے لاہور میں جیل میں ڈال دیا گیا۔ اوّلیں لاہور سازش مقدمے میں 24 پنجابیوں کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ بہرحال عوام کے زبردست احتجاج کے بعد وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے بذاتِ خود مداخلت کر کے ان میں سے سترہ لوگوں کی سزا کو عمر قید میں تبدیل کر دیا۔ جن سات غداریوں کو پھانسی دی گئی ان میں جوشیلا انقلابی کرتار سنگھ سرابا بھی شامل تھا۔ جس کا تعلق لاہور کے موچی دروازے سے تھا۔ انہیں لاہور سینٹرل جیل میں پھانسی پر لٹکایا گیا اس جگہ پر آج کل شاہ جمال کا بڑا چوراہا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ کم از کم 145 غداریوں کو تختۂ دار پر کھینچا گیا اور لاہور کے پانچ سازشی مقدمات میں 304 سے زائد غداریوں کو 14 برس سے زائد سزائیں سنائی گئیں اور وہ تمام کے تمام ''کالے پانی'' میں انتقال کر گئے جیسا کہ اس زمانے میں جزائر انڈیمان کو کہا جاتا تھا۔

●○●○●○●

اس نے شکست پر موت کو ترجیح دی

ذرا یہ منظر ذہن میں لائیں کہ لاہور اندرون شہر کی دیواروں سے بالکل بیرون، بھٹی اور موری دروازے کا درمیانی علاقہ ہے۔ سن ہے 996 عیسوی۔ پنجابی حکمران سر سے پاؤں تک گھی میں شرابور بیرونی حملہ آوروں کے ہاتھوں پے در پے شکست کے بعد اپنے وجود کو آگ لگا لیتا ہے۔

ہمارے ملک اور خاص طور پر لاہور کی تاریخ میں دو پنجابی حکمران بہت ممتاز رہے ہیں۔ پہلا لاہور کا راجہ جے پال تھا، دوسرا مہاراجہ رنجیت سنگھ جو سکھ حکمران تھا جو تقریباً آٹھ سو برس بعد 1799ء میں آیا۔ ہمیں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بارے میں تو بہت کچھ معلوم ہے کہ وہ نہایت عقلمند اور زیرک حکمران تھا کہ اس نے انگریزوں کو اپنے علاقے سے دور رکھا۔ لیکن ہماری معلومات جے پال کے بارے میں بہت کم ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ اس حقیقت کی بناء پر ہو کہ ہمارے نزدیک ایک ہزار سے قدیم تاریخ ہماری تاریخ ہی نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی مدّت ہے جس پر ہم نے خود ساختہ احتساب نافذ کر رکھا ہے۔ لیکن تاریخ تو تاریخ ہوتی ہے وہ کہیں اور جگہ بالکل نہیں جاسکتی۔ لاہور کے عوام تو محض قیادت کے لیے ترستے ہیں کجا ایسے رہنما جو خوددار اور باوفا ہوں۔

لاہور کے راجہ جے پال کی سلطنت ''سرہند سے لغمان اور کشمیر سے مولتان (اس دور کے وقائع نگاروں نے اسے اسی طرح لکھا ہے) تک تھی۔ مسلمان مؤرخ فرشتہ کے مطابق 682 سن ہجری میں پشاور اور کرمان کے افغانوں نے لاہور دربار کے حکمران کو، جو اُن دنوں ایک راجپوت چوہان شہزادہ تھا، للکارنا شروع کر دیا۔ ایک تحریر کے مطابق صرف پانچ ماہ کے عرصہ میں تقریباً ستر لڑائیاں لڑی گئیں اور افغانی کھیوڑا اور میانوالی کے گکھڑوں کی اعانت سے لاہور کی افواج سے ان کی قلمرو کا ایک وسیع خطہ جبراً ہتھیانے میں کامیاب ہوگئے۔

975ء سن عیسوی میں سبکتگین، جو اِن دنوں خراسان کا گورنر تھا، کی افواج نے فیصلہ کیا کہ وہ دریائے سندھ عبور کر کے برصغیر فتح کریں اور مالِ غنیمت لوٹ لیں۔ اس میں انہیں لاہور حکومت کی افواج کا سامنا کرنا پڑتا تھا، جو مغرور راجپوت حکمران راجہ جے پال کی زیرِ قیادت تھیں۔ بھٹ راجپوت آبادی کا معتدبہ حصہ تھے اور

لاہور دربار میں بے حد اثر رسوخ رکھتے تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ وحشی افغانیون کو دُور ہی رکھا جائے اور ان سے جنگ نہ کی جائے۔ لہٰذا مذاکرات شروع ہو گئے اور فیصلہ ہوا کہ امن ہی جان چھڑانے کا بہترین راستہ ہے جیسا کہ راجہ جے پوری کی توجیہہ تھی کہ وہ خواہ مخواہ لڑائی کیوں کریں۔ بھٹ برادری نے حملے کو ٹالنے کا انتظام کر لیا۔

جب سبکتگین غزنی کے تخت پر بیٹھا تو اس نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان کی دولت میں اس قدر کشش ہے کہ اسے نظر انداز کیا ہی نہیں جا سکتا۔ چنانچہ اس نے حملوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا جس سے برصغیر کی صورت ہی بدل گئی۔ جب سبکتگین نے اپنا پہلا حملہ کیا تو راجہ جے پال نے لغمان کے مقام پر اس کا سامنا کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ روایتی ہاتھیوں سے لیس لاہور فوج کے لیے تیز رفتار افغانی گھڑ سوار ناقابلِ برداشت تھے۔

حکمران جے پال کو شکست ہو گئی لیکن اس نے ایک بار پھر امن کے لیے مذاکرات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس دلیل پر کہ سبکتگین نے اپنے وعدے کا پاس نہیں کیا تھا، لیکن شکست کے بعد اور ایک ''بے پناہ'' فوج کے خلاف دلیل اور وعدے کا کیا زور ہو سکتا ہے۔ ایسے مواقع پر کچھ نہ کچھ ادا کرنا پڑتا ہے اور راجہ جے پال نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہ ادائیگی بھی کر دے گا۔ سبکتگین نے اپنے ایلچی اندرونِ شہر بھیجے تا کہ راجہ نے جو مالِ غنیمت دینے کا وعدہ کیا تھا اسے لا سکیں۔ راجہ نے ایلچیوں کو اپنے قلعے میں قید کر لیا اور وعدے کے مطابق تاوان دینے سے انکار کر دیا اور ایک بار پھر جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے بعد جو خونی تصادم ہوئے اس میں سبکتگین نے راجہ جے پال کی فوجوں کو شکست دے دی اور اسے مجبور کیا کہ وہ دریائے سندھ کے مغرب میں واقع قلمرو اس کے حوالے کر دے۔ یہ دوہری شکست تھی اور خستہ حال جے پال لاہور لوٹ آیا۔ ایک تحریر سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس نے ساری رات جاگ کر یہ سوچنے میں بسر کر دی کہ وہ اب کیا کرے۔ اور یہ صبح کا وقت تھا جب خوددار راجہ کی اپنے آپ کو جوہر کرنے کی حتمی رسم ادا کرنے کی تیاریاں تکمیل کو پہنچیں۔ یہ دراصل جنگ کے دیوتاؤں کو جاں نثاری کا حتمی نذرانہ پیش کرنے کا عمل ہوتا ہے۔ پورے جنگی لباس میں ملبوس اور اپنے نگینے جڑی تلوار سمیت راجہ جے پال بھاٹی دروازے کے بیرون خالی میدان میں آ گیا جہاں بائیں جانب موری دروازہ واقع ہے۔ اس نے اپنے پورے جسم پر گھی انڈیلا اور ایک خادم نے اسے جلتی ہوئی مشعل تھمائی جس سے خوددار راجہ نے اپنے آپ کو آگ لگا لی۔ لوک رِیت کے مطابق راجہ کے منہ سے درد بھری ایک بھی آواز نہیں نکلی صرف اس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ وہ غیر ملکی افواج سے ذلت کا بدلہ ضرور لے۔

چنانچہ اس طرح ایک ہزار برس قبل جے پال کا طویل اور دانشمندانہ دورِ حکومت اختتام پذیر ہو گیا۔ جے پال کا بیٹا اپنے باپ کے الفاظ پر قائم رہا اور پشاور میں افغانیوں سے جنگ آزما ہوا، لیکن اسے بھی شکست ہو گئی۔ اس کے بیٹے کا نام بھی جے پال تھا، لیکن تاریخ میں اسے نرجن پال کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔ وہ لاہور

پر حکمرانی کرتا رہا حتیٰ کہ 1022ء میں سبکتگین کا بیٹا، جسے بہتر طور پر محمود غزنوی کے نام سے جانا جاتا ہے، کشمیر سے آ کر بغیر کسی جنگ کے لاہور پر قابض ہو گیا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو لوٹ مار کی کھلی چھٹی دے دی۔ سات دن اور سات راتیں لوٹ مار اور عصمت دری کا بازار گرم رہا۔ راجہ جے پال دوم اجمیر بھاگ گیا اور لاہور اور پنجاب کی راجپوت حکومت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ یہ تو آٹھ سو برس بعد کی بات ہے، جب پنجابی افغانوں سے اپنی آزادی واپس چھیننے میں کامیاب ہو پائے۔ لیکن بعد ازاں صرف پچاس برس کے عرصے میں ایک بار پھر انگریزوں کے ہاتھوں آزادی گنوا بیٹھے۔ ہر بار جب آپ کا سرکلر روڈ پر موری دروازے کے نزدیک سے گزر ہو تو تھوڑی دیر رک کر ایک پیپل کے درخت پر نظر ضرور ڈالیں جو ایک باغیچے میں اب بھی استادہ ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اسے جے پال پیپل کہا جاتا تھا۔ کچھ لوگ اسے ''جوہر درخت'' بھی کہتے ہیں۔ ایسا درخت جو قدیم زمانے کی رسم کی مجسم مثال ہے۔

●○●○●○●

ذہن سے مَحو جان لیوا کھیت

اگر آپ روشنائی دروازے سے مشرقی جانب یکّی دروازے کی طرف جائیں تو سڑک اندر کی جانب بل کھا جاتی ہے۔ یہاں کسی زمانے میں دریائے راوی بہتا تھا۔ عین اس جگہ جہاں سڑک اندر کی جانب مڑتی ہے ایک مقام ہے جہاں تقریباً چار سو برس قبل ایک شخص کا انتقال ہوا تھا۔ اس کی موت شمالی ہندوستان اور خاص طور پر پنجاب کی تاریخ کا ایک فیصلہ کن مرحلہ ثابت ہوئی۔

وہ 30 رمئی 1606ء کا دن تھا جب بہت سے پابہ زنجیر اور نڈھال قیدیوں کو قلعہ لاہور کے گہرے زمین دوز سنگین قید خانوں سے لایا گیا تھا تا کہ نہانے کا از حد ضروری عمل ادا کر سکیں۔ اُس شخص کا صرف قصور یہ تھا کہ اس نے ایک معزز مہمان، شہزادہ خسرو جو شہنشاہ جہانگیر کا بھائی تھا، کی میزبانی کا فرض ادا کیا تھا۔ جب خسرو کو خاموش کرا دیا گیا تھا اور جہانگیر مستحکم طور پر تخت پر براجمان ہو چکا تھا تو اس کی خواہش تھی کہ اس طویل قامت خوبرو شخص کو میزبانی کی سزا دے۔

وہ شخص سکھوں کا چوتھا گرو ارجن مل تھا۔ ارجن پر اس بری طرح تشدد کیا گیا کہ وہ کھڑا ہونے کے قابل نہ رہا۔ جونہی وہ ٹھنڈے پانی میں اترا اسی لمحے اس طویل قامت تنومند شخص کی جان نکل گئی۔ قلعہ لاہور کی دیواروں کے بیرون ارجن کی موت نے نانک کے نوزائیدہ ''امن'' کے مذہب کو ''ہر حال میں امن'' سے ہٹ کر ایک ایسے مذہب میں بدل دیا جو کسی قسم کی بھی ناروا داری کے خلاف اپنے دماغ میں ڈٹ جانے والا بن گیا۔ بعد ازاں احمد شاہ ابدالی کے نو حملوں کے دوران اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا۔ حتمی نتیجہ یہ نکلا کہ سکھوں نے پنجاب میں اپنی پہلی اور آخری حکومت قائم کر ڈالی جو کابل سے دِلّی اور کشمیر سے ملتان تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس غیر معمولی شخص، جسے دریائے راوی کے ٹھنڈے پانی نے ایذا رسانوں سے نجات دلا دی، نے اس قدر گہرا اثر اپنے پیچھے چھوڑا تھا۔

اس وقت تک سکھوں کا ایسی تحریک سے تعلق تھا جسے گرو نانک نے شروع کیا تھا۔ تا کہ وہ ''ہٹ دھرم برہمن'' یا بنیاد پرست ''مُلا'' سے دُور رہیں۔ اس کا ایمان تھا کہ صرف ایک ہی مالک ہے اور وہ اللہ ہے۔ وہی اوّل

وآخر ہے۔ارجن کے ''قتل'' نے اس سارے نظام کو بدل کر رکھ دیا اور سکھ ''نہ تو ہندو رہے اور نہ ہی مسلمان بلکہ انہوں نے اپنا ایک الگ تیسرا مذہب اختیار کرلیا۔'' پنجاب کے دوآبے کی جٹ برادی نے گرو ارجن کی موت کا بدلہ لینے کا مصمم ارادہ کرلیا اور یوں متشدد پنجابی نے جنم لیا۔اس کے بعد سے اب تک بے بہا خون بہہ چکا ہے۔

اگر آپ قلعہ لاہور کی دیوار کے اس مقام پر تھوڑی دیر کے لیے رکیں جہاں سے وہ قدیمی اندرون شہر کی جانب اندر کی طرف خم کھاتی ہے تو صرف یہ خیال کریں کہ اس جگہ سے جہاں ارجن کی موت واقع ہوئی تھی، لاکھوں افراد سر دمہری سے ذبح ہونے کے راستے سے گزرتے رہے تھے۔صرف اس مقام پر کھڑے ہو کر سوچیں کہ تاریخ کی بے شمار پرتیں ہی پرتیں ان بڑی بڑی دیواروں سے اگلے مقام سے گزری تھیں۔لاکھوں مرد عورتیں اور بچے گزرے ہوں گے جو تمام کے تمام مارے گئے، کیونکہ اسی طرح سے اسی مقام پر ارجن کو مار ڈالا گیا تھا۔

1739ء سے 1747ء کے درمیان لاہور کے مسلمان حکمران ذکریا خان نے سکھوں کے سر جمع کرنے کو پسندیدہ کھیل بنالیا تھا۔اس نے ایک سکھ کی کھوپڑی کے لیے پچاس روپے کی گراں قدر رقم کی پیشکش کر رکھی تھی۔ ہزارہا سکھوں کو قید کر کے پابہ زنجیر لاہور لایا جاتا تھا۔وہ سب کے سب اس مقام سے گزرتے تھے جہاں ارجن کی موت ہوئی تھی۔ان سب کو ''نکاس'' یا گھوڑا منڈی لے جایا جاتا تھا جو موجودہ یکی دروازہ کے بیرون واقع تھی۔ جہاں انہیں سرعام ذبح کر دیا جاتا تھا اور ان کے سر نیزوں میں پرو کر شہر بھر میں پریڈ کی جاتی تھی۔آج بھی اندرونِ شہر کے بزرگ اس خوفناک جگہ کو ''شہید گنج'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ایک قوم کی حیثیت سے پاکستانیوں کے پاس غیر مذاہب کے شہیدوں کے لیے کوئی وقت نہیں ہے۔وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ سب لوگ بھی ہماری اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔

14/اکتوبر 1748ء کو سربت خالصہ نے ارادہ کیا کہ پنجابی گھڑ سواروں کے چھوٹے چھوٹے جتھوں کو پچیس گھڑ سوار رجمنٹوں میں تشکیل دے دیا جائے۔ان کا مقصد تھا کہ خاموشی سے زبردست حملہ کریں اور غنیم کو اچھا خاصا نقصان پہنچا کر الٹے قدموں لوٹ کر غائب ہو جائیں۔پھر سکھوں نے مغلوں اور دیگر حملہ آوروں سے مقابلے کرنے شروع کر دیئے اور دشمنوں کو اس حد تک تھکا دیا کہ بالآخر سکھوں نے اپنی ہی سلطنت بنالی۔

1746ء میں جب سکھوں نے حکومت کو لگان دینے سے انکار کر دیا تو ان سب کو، جو لاہور اور اس کے گردونوح کے علاقوں کے رہنے والے تھے، گرفتار کرلیا گیا۔دریائے راوی کے کناروں پر شمال کی جانب بہت سی رجمنٹوں کو گھیرا ڈال لیا گیا۔سات ہزار سے زائد سکھ ہلاک ہوئے اور تقریباً 3200 افراد کو پابہ زنجیر اس مقام سے گذارا گیا جہاں ارجن کا انتقال ہوا تھا۔

آٹھ دن اور آٹھ راتوں تک لاہور کے تمام قصاب ان 3200 سکھوں کو شہید گنج کے مقام پر گلے کاٹ کاٹ کر ذبح کرتے رہے۔جون 1746ء کے اس سانحہ کو ''گلوگھارا'' یا ہولوکاسٹ (قتل عام) کہا جاتا

ہے۔ ہندوستان بھر کی پوری تاریخ میں، صرف پنجاب ہی نہیں، نسلی گروہ کی سفّاکانہ صفائی کی اتنے وسیع پیمانے پر مشق کسی اور جگہ نہیں کی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ دریائے راوی کے کنارے محمود بوٹی گاؤں سے لے کر یکی دروازے تک ان سکھوں کی کھوپڑیاں اور ڈھانچے لاہور کے گرد کھیتوں میں سو برس تک ملتے رہے تھے۔

اس کے باوجود لاہور میں بہت کم لوگوں کو ہمارے خونی اور ہولناک ''ہولوکوسنٹ'' کے بارے میں علم ہوگا۔ ان سکھوں کے خون سے ایک قوی اور متشدد پنجابی قومی عصبیت پیدا ہوئی۔ ہم اسے اس لیے نظر انداز کر دیتے ہیں، کیونکہ سکھوں نے لڑائیوں کا رخ حملہ آوروں اور غیر ملکیوں کی جانب کر دیا تھا۔ آج بھی راوی پر محمود بوٹی بند کے قریب سبزیاں اُگانے والے کسانوں کو کھیتوں میں معمول سے زیادہ کھدائی کرنے پر کھوپڑیاں اور انسانی ڈھانچے ملتے ہیں۔ انگریزوں کی تعمیر کردہ ریلوے لائن یکی دروازے کے بیرون شہید گنج کو محمود بوٹی اور قریب ہی بہتے دریائے راوی سے جدا کر دیتی ہے۔ ایک زمانے میں ٹھنڈا پانی شہر کے عین ساتھ بہتا تھا۔ ان کے درمیان ہی جان لیوا کھیت ہیں جہاں ارجن کے عقیدت مند کئی صدیوں تک ہزاروں کی تعداد میں ذبح کیے گئے تھے۔ حضرت میاں میرؒ نے ارجن کی سفارش اور دلالت کی، لیکن بے سود، اس دور کی ایک نظم میں سارا احوال بیان کیا گیا ہے:

جو یہ سمجھتے ہیں کہ جَٹ کا خون رائیگاں جائے گا نہیں جانتے کہ مالک
اس دل کو پسند کرتا ہے جو خالص ہو...
شہنشاہ صرف اس وقت تک حکومت کرتے جب تک وہ زندہ رہیں لیکن یہ
جَٹ اس وقت تک حکومت کرے گا جب تک لوگ فخر سے سر بلند کرتے
چلتے رہیں گے....

●○●○●○●

بغداد اور لاہور میں نسل کشی

آج کل ہم ٹیلیویژن پر بغداد میں جو طے شدہ نسل کشی دیکھ رہے ہیں اس کے ہوتے ہوئے کسی اور چیز کے بارے میں سوچنا از حد مشکل ہے۔ ایسا دن رات ہو رہا ہے اور ہم سب فقط دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ اس کا خاتمہ ہو جائے۔ جب فلسطین میں ایسا ہو رہا ہو تو ہمیں ایک طرح سے ایسی نسل کشی متوقع تھی۔ نسل کشی آخر نسل کشی ہوتی ہے۔ ہمیں چنگیز خان کی یاد آ جاتی ہے جس نے تقریباً نو سو برس قبل بغداد اور لاہور میں لوٹ کھسوٹ اور عصمت دری کا بازار گرم کر دیا تھا۔

میں ایک پرانی پسندیدہ کتاب پڑھتا رہتا ہوں جس کا نام ''دانائی کے سات ستون'' ہے، جو ٹی ای لارنس کی تصنیف ہے جسے لارنس آف عریبیہ بھی کہا جاتا ہے۔ جس نے سعودی عرب اور تیل کی دولت برطانیہ کے حوالے کی تھی۔ وہ لکھتا ہے۔ ''میں سو برطانوی ڈیون سپاہیوں کے ہمراہ، جو سب جواں سال، صاف ستھرے اور خوش باش تھے، دریائے دجلہ تک جا پہنچا۔ ہم انہیں ایسی دہکتی ہوئی آگ میں دھکیل رہے تھے جہاں خوفناک حد تک موت ہی موت تھی۔ جنگ جیتنے کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ ہم اناج، چاول اور میسو پوٹامیا کے تیل کے ذخائر کے مالک بن سکیں۔''

یہ اس کی نپی تلی رائے تھی جسے برنارڈ شا نے صاد کیا تھا۔ ایک ایسے نقطۂ نظر پر برسرِ اقتدار ہیئت انتظامیہ نے ٹی ای لارنس کو کبھی معاف نہیں کیا۔ انہوں نے بالآخر اسے ''ایک غلیظ ہم جنس پرست'' قرار دے دیا اور اسے کراچی کے ہوائی مستقر کے سپرد کر دیا۔ لیکن لارنس ایک غیر ذمہ دار شخص تھا جو صحرا کا عادی تھا اور شہوانی خواہشات کا اسیر تھا۔ کم از کم ان کا کہنا یہی تھا کیونکہ اس کی تحریروں میں انسانی وجود کے شہوانی پہلوؤں کا مسحور کن حصہ شامل ہوتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی بہانے ہوائی مستقر سے کسی ڈانواں ڈول جہاز میں پرواز کرتا ہوا لاہور آ جاتا تھا ''جہاں زندگی حساس اور باشعور تھی۔ جہاں عورتیں اور مرد زندگی کے قرینے میں مہذب تھے۔ وہ اپنے آکسفرڈ کے ایک پرانے دوست کے ہاں گڑھی شاہو میں قیام پذیر ہوتا تھا اور وہیں اسے سکون ملتا تھا۔''

لارنس اساطیری روایتوں میں لارنس آف عریبیہ کی حیثیت سے زندہ رہے گا جس نے عربوں کے تیل کے ذخائر پر جھپٹنے کے لیے بڑے جنونی انداز میں کارروائی کی۔ جس نے اسرائیل کے خطرناک مذہبی تخیلی سپنے کی تعبیر کے لیے بنیاد فراہم کی۔ اتنا ظالمانہ خیال کہ جس نے ناجائز دست درازی کر کے ایک پوری قوم کو غصہ سے بھڑکا رکھا ہے۔ حالیہ نسل کشی اسی ناجائز دست درازی کو مزید وسعت دینے کی وعید ہے۔ انسانی طمع کی کوئی حد نہیں ہوتی، لیکن جیسے لارنس لاہور آیا تھا، اُسی طرح چنگیز خان بھی آیا تھا اور اس کے بعد چنگیز خان بغداد بھی گیا تھا تا کہ تمام کتابوں اور ان کے علم کو نذرِ آتش کر سکے۔ عرب بطور قوم ہمیشہ سے ہی نہایت اعلیٰ درجے کے مہذب رہے ہیں اور حملہ آوروں نے ہمیشہ ان کو غریب تر کر کے چھوڑا ہے۔ ان کو شکست دینے کا صرف ایک طریقہ تھا کہ ان کی کتابوں کو نذرِ آتش کر دیا جائے۔ بالکل یہی کام اس نے لاہور میں بھی کیا۔

چنگیز خان جس کا اصل نام تموجن (1167-1227ء) تھا، یسوکائی کا بیٹا تھا جو منگولوں کا سردار اور دریائے آمور اور عظیم دیوارِ چین کے مابین ایک نہایت وسیع علاقے کا حکمران تھا۔ تیرہ برس کی عمر میں تموجن اپنے باپ کی جگہ قبیلے کا سردار بنا۔ 1206ء تک تموجن تقریباً پورے منگولیا کا مالک بن چکا تھا۔ اسی سال مفتوحہ قبائل کے ایک اجتماع میں اُسے منادی کر کے ''چنگیز خان'' قرار دے دیا گیا۔ (چینی زبان میں ''چنگیز'' کا مطلب ہے ''قیمتی جنگجو'' اور ترکی زبان کے لفظ ''خان'' کا مطلب ''آقا'' ہوتا ہے۔) یعنی متحدہ منگول اور تاتار قبائل کا قائد۔ قراقرم شہر کو اس کی سلطنت کا پایۂ تخت قرار دیا گیا۔ خان نے چین کو فتح کرنا شروع کر دیا۔ 1208ء تک اس نے دیوارِ چین کے اندرون قدم جما لیے تھے۔ 1213ء میں اس نے اپنی فوجوں سے جنوب اور مغرب میں واقع علاقوں میں، جہاں چوچن چن (یا کن) کا شاہی خاندان (1122-1234ء) حکمران تھا، حملہ کر دیا اور شینگ تنگ جزیرہ نما تک جا پہنچا۔ 1215ء میں اس کی افواج نے ین کنگ (موجودہ بیجنگ) پر قبضہ کر لیا، جو شمالی چین میں چن بادشاہ کا آخری محفوظ اور مستحکم ٹھکانہ تھا۔ 1218ء میں کوریا کا جزیرہ نما بھی منگولوں کے قبضے میں آ گیا۔

1219ء میں چند منگول تاجروں کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے، جو حملہ آوری کا عمومی بہانہ ہوتا تھا اور ایسے قتل عمداً بھی کرائے جاتے تھے، چنگیز خان نے اپنی فوجوں کا رخ مغربی جانب موڑ دیا اور وسیع تر ترک سلطنت پر حملہ کر دیا۔ جس میں موجودہ عراق، ایران اور ترکستان کا مغربی حصہ شامل تھا۔ غارت گری اور قتلِ عام کرتے منگول ترکستان میں سے گزر کر بخارا اور سمرقند کے شہروں کی لوٹ مار کرتے رہے۔ اس کے بعد اس نے پشاور اور لاہور کے شہروں کو فتح کر لیا۔ لاہور میں ایک ایسی رسم ادا کی گئی جو اس سے قبل بغداد میں کی جا چکی تھی۔ اس نے حکم دیا کہ اس سے پیشتر کہ مردوں کو ذبح کیا جائے اور عورتوں کی عصمت دری کی جائے، لاہور کی ہر کتاب کو نذرِ آتش کر دیا جائے۔ چنگیز خان کی نسل کے دو اور حملہ آوروں تیمور لنگ اور بابر نے بھی لاہور کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ حملہ آوروں کے سلوک میں وقت نے بہت کم تبدیلی کی ہے۔ چاہے وہ لارنس ہو جس نے ترکوں کو

تارکِ وطن کر کے خطۂ عرب سعود خاندان اور ملوکیت کے حوالے کر دیا، خواہ چنگیز خان ہو جس نے بغداد اور لاہور کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ کیونکہ وہ کتابوں اور شائستہ سلوک کو اپنی طرزِ حیات کے لیے خطرے کا باعث سمجھتا تھا۔ آج ہم انہیں نسل کشی کے حوالے سے ہی یاد کر پاتے ہیں۔

اور یوں نسل کشی جاری رہتی ہے اور اس نسل کشی ہی کی خاطر انہیں تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔ بالکل ریڈ انڈین لوگوں کی طرح، افریقہ سے لائے گئے اور حالیہ دور میں ویت نام سے لائے گئے غلاموں کی طرح۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ عراق کے بعد نیا چنگیز خان ہو سکتا ہے لاہور کا رخ کر لے۔ لیکن ہمارے پاس تو تیل ہی نہیں؟ اور کون چودہ کروڑ پاکستانیوں کو پالنے پوسنے کا ذمہ لینا چاہے گا؟ ایک طرح سے تو کچھ بھی نہیں بدلتا نسل کشی جاری رہتی ہے صرف طریقِ کار زیادہ مہذب ہو جاتے ہیں اور اس عمل کی وضاحت میں ریشمی سرسراہٹ ہوتی ہے، لیکن پھر مشہور اصلی امریکی ___ جسے ریڈ انڈین کہتے ہیں ___ کی کہاوت یاد آتی ہے۔ ''جو دو شاخہ زبان سے بات کرتا ہے اسے کوئی افسوس نہیں ہوتا۔'' ہم نہایت دکھ بھرے دور میں زندہ ہیں۔

●○●○●○●

نادرشاہی مجموعی روگ

جب کابل کا خلّی خان، عرفِ عام میں نادرشاہ، مئی 1738ء میں لاہور پر حملہ آور ہوا تو اس نے سو دن سے بھی کم مدت میں دو لاکھ سے زائد افراد کو تہِ تیغ کر ڈالا۔ ایسا ذبیحہ جس کی برصغیر کی تاریخ میں پہلے کوئی مثال نہیں ملتی اور اس کے مرتکب کون تھے؟ اس کے فارسی زبان بولنے والے تاجک، قزلباش قازق اور جنوبی قفقازی جارجیائی تھے۔

جب نادرشاہ اوسط فروری 1738ء میں لاہور سے دہلی روانہ ہوا تو اس نے قسم کھائی کہ وہ پنجاب، دہلی سمیت، کے عوام کو وہ سبق سکھائے گا کہ ان کی آنے والی نسلیں بھی کبھی بھول نہ پائیں گی۔ اس کو روکنے والا پہلا شخص محمد شاہ تھا۔ جس نے کرنال کے نزدیک ایک جنگ میں جنونی نادرشاہ کو اپنی دو لاکھ نفری والی فوج کو لڑاتے دیکھا تھا۔ سینکڑوں قیدیوں کو ذبح کر ڈالا گیا اور ان کے سروں کو چھکڑوں پر لاد کر پنجاب کے دیہاتوں میں چکر لگوائے۔ ایسے سو سے زائد چھکڑے لاہور شہر کی بیرونی دیواروں کے آگے کھڑے کر دیئے گئے۔ حکم تھا کہ کٹے ہوئے سروں کو دفنایا نہ جائے تا کہ دہلی سے واپسی پر شہر کے لوگ اس کی راہ میں روڑے نہ اٹکائیں۔ شالامار باغ سے بادامی باغ تک جی ٹی روڈ کی دونوں اطراف پر یہ چھکڑے کھڑے کر دیئے گئے۔ آج بھی شہر لاہور کے بزرگ لوگ اس دور کو ''نادرشاہ دا سکّہ'' کہتے ہیں۔

جب کابل کا خون کا پیاسا بادشاہ 8/مارچ 1738ء کو دہلی پر حملہ آور ہوا تو وہ مشہور چاندنی چوک کے قریب واقع دہلی کی جامع مسجد کے بڑے گنبد پر چڑھ گیا اور اپنی تلوار ہوا میں بلند کرتے ہوئے حکم دیا کہ جب تک وہ تلوار کو میان میں واپس نہ رکھ لے ذبیحہ جاری رہے۔ یہ ناشنیدہ العباد کا قتلِ عام تھا۔ جب ایک لاکھ سے زائد باشندے ذبح کیے جا چکے تو بادشاہ کے مصاحب میں سے ایک ذی عقل شخص بادشاہ کی قدم بوسی کرتے ہوئے معافی کا خواستگار ہوا۔ بادشاہ نے تلوار میان میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا خون اب بھی جوش مار رہا ہے کیونکہ میری پیاس ابھی بجھی نہیں۔'' پورے دو ماہ تک نادرشاہ نے بڑی بے دردی سے اپنے آپ کو مستحکم بنایا اور جس کسی نے

اس کے خلاف زبان کھولی اسے قتل کر دیا گیا۔ پورا ملک سکتے میں تھا۔ پھر لوٹ مار شروع ہوئی جو اس سے پہلے کسی نے نہ دیکھی تھی۔ مئی 1738ء میں اس کی افواج کی دِلّی سے بتدریج واپسی شروع ہوئی اور لاہور کا رخ کیا۔ وہ اپنے ہمراہ اس قدر زیادہ مالِ غنیمت لایا کہ آج بھی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

ایک برطانوی مؤرخ کے تخمینے کے مطابق نادر شاہ اپنے ہمراہ آٹھ کروڑ ستر لاکھ سٹرلنگ (برطانوی سکّہ) نقد رقم لوٹ کر لایا جو موجودہ دور کے حساب سے دس ارب برطانوی پاؤنڈ کے مساوی ہے۔ اس کی افواج کے سالاروں اور سپاہیوں نے اس رقم سے الگ ایک کروڑ بیس لاکھ سٹرلنگ لُوٹے جو موجودہ دور کے حساب سے تقریباً دو ارب برطانوی پاؤنڈ کے برابر رقم بنتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک ہزار ہاتھی، سات ہزار عمدہ نسل کے گھوڑے، دس ہزار اونٹ، ایک سو تیس مصنّفین، دو سو معمار، تین سو پتھر تراش اور دو سو بڑھئی بھی لے لیے گئے۔ یہ تمام مال و اسباب مئی 1738ء میں لاہور پہنچ گیا اور یوں جب تک وہ یہاں مقیم رہا، لاہور دنیا کا امیر ترین شہر بنا رہا۔

لاہور میں اس نے اپنے پیچھے مستقلاً بہت سے منتظمین اور سپاہی چھوڑ دیئے، جن میں سب سے نمایاں قزلباش قبیلہ تھا۔ نادر شاہ کی بدولت اور بعد ازاں ان کی سکھ حکمرانوں اور ان کے بعد انگریزوں کے ساتھ وفاداری کی بدولت آج بھی لاہور اور اس کے گردونواح کی بہت سی اراضی اور جائیداد پر ان کا قبضہ چلا آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب نادر شاہ مئی 1738ء میں کابل روانہ ہوا تو اس کی سپاہ کو دریائے راوی کی طغیانی سے واسطہ پڑ گیا۔ اس وقت سے دریائے راوی میں سونے کے سکّے اور دیگر خزانوں کی موجودگی کی افواہیں لاہور کی لوک کہانیوں کا حصہ بن چکی ہیں۔

لیکن نادر شاہ کی بربریت اور درندگی سے پنجابی وطن پرستی کا ظہور ہو گیا، جس نے بعد ازاں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی منفرد ذات میں اپنی بلندیوں کو چھو لیا۔ پورے چالیس برس اس نے لاہور دربار سے حکومت کی اور لوگوں کو ہم آہنگ کر کے ایشیا کی بہترین فوج تشکیل دے ڈالی۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ درندگی کا جواب بنیادی طور پر درندگی سے دیا جانا تھا۔ اس کے بعد برسہا برس تک امن، چین اور انصاف کا دور دورہ رہا اور یہ سب اس لیے وقوع پذیر ہوا کہ بالآخر ذی عقل مہاراجہ کو احساس ہو گیا تھا کہ صرف لادینی اندازِ نظر ہی سے کام چل سکتا ہے۔ ایک طرح سے انگریزوں کے لیے بھی، ناشنیدہ بربریت، درندگی اور قتل و غارت کے بعد، یہی اندازِ نظر سچ ثابت ہوا۔

نادر شاہ، مہاراجہ رنجیت سنگھ اور انگریزی راج کا موازنہ دلچسپی سے خالی نہیں ہو گا۔ ان سب نے انتہائی درندگی سے آغاز کیا۔ کابل سے آنے والے تمام لٹیروں کی طرح ان کا مفاد فقط لوٹ مار میں تھا اور اس مقصد کے لیے انہیں قتل و غارت اور عصمت دری کرنا پڑتی تھی۔ شمال مغربی صوبہ سرحد کی ایک کہاوت ہے کہ

افغانستان آج اس لیے غریب ہے کیونکہ دوسو برس سے زائد عرصہ بیت چکا ہے کہ وہ برصغیر پر حملہ آور اور غارت گری نہیں کر پایا۔

نادرشاہ کی لوٹ کھسوٹ نے رنجیت سنگھ کو جنم دیا۔ انہوں نے حکمتِ عملی وضع کر کے لٹیروں کو لوٹا اور اتنے امیر ہو گئے کہ لاہور فتح کرنے کے لیے اپنی فوج کھڑی کر لی۔ بالآخر، چونکہ ان کا تعلق اسی سرزمین سے تھا، انہیں احساس ہو گیا کہ فقط انصاف کرنے سے ہی ان کی حکومت دراز ہو سکتی ہے۔ انگریز آئے تو انہوں نے بھی وہی کیا جو اِن سے پیشتر سکھ کر چکے تھے۔ بالآخر میانہ روی اور انصاف ہی غالب رہے۔

●○●○●○●

آزادی کی جنگ دائمی ہوتی ہے

5/ستمبر 1945ء کو ہٹلر کی خودکشی کے عین تیسرے روز روسی فوج برلن میں داخل ہوئی تو ایک 'پُرجوش پنجابی کو، جو پوری جرمنی فوجی وردی میں ملبوس تھا، ہٹلر کے مورچے سے صرف پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر گرفتار کر کے بے ہتھیار کیا گیا۔ جب روسیوں نے اسے گرفتار کیا تو وہ نعرے لگا رہا تھا۔ ''اللہ کرے انگریزوں کو موت آ جائے۔ ہم ہندوستان کو لازماً آزاد کرائیں گے۔'' ایسا لگتا تھا کہ اس کی شکست خوردہ فوج کو جس خوفناک بدنصیبی کا سامنا تھا، وہ اس کے حوصلے کو پست نہیں کر سکی تھی۔

اس ثابت قدم جواں سال ''نازی'' جنگجو کا شجرہ امرتسر میں جلیانوالہ باغ کے خونیں قتلِ عام سے جا ملتا ہے۔ بریگیڈیئر جنرل آر ای ایچ ڈائر کے زیر قیادت فوجیوں نے بیساکھی میلے کے شروع ہونے سے ذرا پہلے معصوم مسلمانوں اور سکھوں پر 13/اپریل 1919ء کے دن، فائر کھول دیا۔ برطانوی قیادت کے ماتحت سپاہیوں نے اس قتلِ عام میں 379 افراد کو ہلاک کر دیا اور دو ہزار سے زائد کو بری طرح گھائل کر دیا، لیکن اس واقعہ نے ہندوستان کی تاریخ کا رُخ موڑ دیا۔ ہلاک ہونے والوں میں امرتسر کے سیّد خاندان کے فرد سیّد خیر شاہ بھی تھے۔ سیّد خاندان اس عظیم نقصان پر غم سے نڈھال ہو گیا۔ اپنے ملک کی آزادی کے لیے انہوں نے قسم کھائی کہ وہ انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے اپنی جانیں تک قربان کر دیں گے۔ سیّد خیر کا پوتا اس قتلِ عام کے پانچ برس بعد پیدا ہوا اور انگریزوں کے خلاف نفرت کے ماحول میں پرورش پائی۔ سیّد وزیر علی شاہ نے سخت محنت کر کے میٹرک پاس کیا اور 1939ء میں یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لیے علی گڑھ چلا گیا کیونکہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی وہی ایک امید تھی۔

دہلی میں اس کے ایک رشتہ دار نے، جو جی ایچ کیو دہلی میں ملازم تھا، آسٹریا کی ریڈ کراس تنظیم کے تحت جنگی قیدیوں کے ایک کیمپ میں بطور مبصر اس کی تقرری کروا دی۔ زندہ دل، جواں سال شاہ نے آسٹریا والوں کو متاثر کر دیا اور جلد ہی اسے بذریعہ بحری جہاز اٹلی بھیج دیا جہاں سے وہ بذریعہ ریل آسٹریا پہنچ گیا۔ پورا

ایک سال اس نے اس امر کو یقینی بنانے میں صرف کیا کہ قیدیوں کی دیکھ بھال اچھی طرح سے ہو سکے۔ لیکن پھر اپنے وطن کی آزادی کی تڑپ نے، جو اس کے دل میں گہری مدفون تھی، سر اٹھایا تو اس نے ہندوستان سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں کے ایک چھوٹے سے گروہ کی تشکیل کی اور فیصلہ کیا کہ جرمنوں کی جنگی کوششوں میں شرکت کی جائے۔ یہ فیصلہ انہوں نے اس سرزمین کی خاطر کیا تھا جس سے ان کا تعلق تھا۔ نازیوں نے انگریزوں کے خلاف پراپیگنڈہ جنگ کے لیے ہندوستانی باشندوں پر مشتمل ایک ٹیم تیار کر رکھی تھی۔ یہ حکمتِ عملی سیّد وزیر علی کو اپنے لیے اور اس کی ہندوستان کی آزادی کی جنگ جیتنے کی عظیم خواہش کے حسبِ حال لگی۔

1941ء میں وزیر علی نے اپنی پراپیگنڈہ جنگ کا آغاز کر دیا اور جہاں کہیں جرمن افواج جاتیں وہ بھی ان کے ہمراہ متحرک رہتا۔ اس نے جنگ کو دوسری جانب سے دیکھا۔ کام کرتے اور جنگ لڑتے ہوئے اٹلی، فرانس، روس، ہالینڈ، پولینڈ اور دیگر تمام ممالک میں جہاں جہاں جنگِ عظیم دوم جاری تھی، انہوں نے پراپیگنڈہ میں مہارت حاصل کر رکھی تھی اور وہ بلا کم و کاست کہہ دیتا تھا۔ سیّد وزیر علی کے ساتھ پرتاپ سنگھ نام کا ایک سکھ بھی تھا، جس کا تعلق لاہور سے تھا۔ ''وہ بڑا جوشیلا تھا۔ ریڈیائی نشریات کے دوران ہی وہ اکثر ٹھیٹھ پنجابی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتا تھا اور بڑی مشکل سے اس کو اس سے باز رکھا جاتا تھا۔'' انگریزوں کے خلاف اس قدر گہری نفرت تھی کہ جرمنوں نے اس امر کو یقینی بنائے رکھا کہ جب بھی ان کا سامنا برطانوی سپاہ سے ہوتا خصوصاً جب اس میں ہندوستانی فوجی شامل ہوتے تو یہ جرمن ہندوستانی گروہ باقاعدہ فوج اور گوریلا فوجیوں کے ساتھ ساتھ متحرک رہتے، اس نیت سے کہ برطانوی ہندوستانی سپاہیوں میں بددلی پھیل جائے اور وہ ہتھیار ڈال دیں اور انگریزوں کے خلاف جنگ کریں۔ اگرچہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جرمن اس کوشش میں بری طرح ناکام رہے لیکن یہ حریت پسند اس کوشش میں لگے رہے کہ جرمن یقینی طور پر یہ جنگ جیت جائیں تاکہ ہندوستان کو آزاد کرایا جا سکے۔ آج کے دور میں یہ دلیل کج لگتی ہے، لیکن سیّد وزیر علی جیسے لوگوں کے لیے ''ہر ہندوستانی حریت پسند کا یہی طرزِ عمل تھا۔''

گرفتاری کے بعد وزیر علی کو پولینڈ کے جنگی قیدیوں کے ایک کیمپ میں منتقل کر دیا گیا۔ روسی فوج کا حکم تھا کہ ان تمام قیدیوں کو گولی مار دی جائے۔ یہ محض خوش قسمتی تھی کہ شاہ جی زندہ بچے گئے اور 1948ء میں امریکی فوج کے حوالے کر دیئے گئے۔ امریکیوں نے انہیں ایک برس اپنے پاس رکھا اور اس کی کہانی اور اس کے جرمن پراپیگنڈہ نظام کار اور آسٹریا کی ریڈ کراس تنظیم کے ریکارڈ کی تصدیق کرنے کے بعد اسے برطانیہ کے حوالے کر دیا۔

''انگریز مجھے اپنے قبضے میں پا کر خوشی سے نہال ہو گئے اور یوں جنگ میں میرے کردار کے سلسلے میں اگرچہ مکمل کارنامے میں کتنا ہی کم اہم کیوں نہ رہا، پھانسی دینے کے لیے کارروائی کا آغاز کر دیا۔'' لیکن تب تک

ہندوستان آزاد ہو چکا تھا اور پنڈت نہرو ''ان معزز ترین حریت پسندوں'' کی واپسی کے خواہشمند تھے۔ چنانچہ مایوس برطانیہ کے پاس کوئی چارہ نہ رہا تو بادل نخواستہ انہیں اپنے اٹلی کے جنگی قیدیوں کے ایک کیمپ سے بحری جہاز میں سوار کر کے نومبر 1951ء میں بمبئی کی بندرگاہ پر اتار دیا۔

''بحری جہاز کے تختوں پر بینڈ بج رہے تھے اور ہندو اور سکھ حریت پسندوں کو پھولوں کے ہار پہنائے جا رہے تھے۔ نہرو بذاتِ خود ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ ہم نے پاکستان جانے کا انتخاب کر رکھا تھا چنانچہ ہمیں جہاز سے اترنے کی اجازت نہیں تھی۔'' پھر باقی ماندہ صرف دو مسلمان حریت پسندوں کو، لاہور کے سیّد وزیر علی شاہ اور کیمبل پور (موجودہ اٹک) کے اکرام صاحب، واپس سسلی (اٹلی) قیدیوں کے کیمپ میں جانا پڑا۔ ایک برس بعد ان کو پاکستان جانے والے ایک بحری جہاز میں سوار کرا دیا گیا۔ اس کے بعد جو بھی ہوا اس پر ہم سب کو شرم آنی چاہیے، کیونکہ اسے پڑھ کر تلخی کا احساس ہوتا ہے۔

1952ء میں کراچی کی بندرگاہ پر سیّد وزیر اور اکرام کو اترتے ہی فوراً گرفتار کر لیا گیا، انہیں ملتان جیل میں ڈال دیا گیا اور ان پر غداری کا مقدمہ شروع کر دیا گیا، جس کی سزا موت ہوتی ہے۔ یہ تو قسمت تھی جو ہمارے دو معزز حریت پسندوں کے انتظار میں تھی۔ اس سرزمین پر جسے آزاد کرنے کی خاطر وہ اتنی جگیں لڑتے رہے تھے۔ ''مجھ سے اپنے وطن میں اسے آزادی دلانے کی کوشش پر مجرموں جیسا سلوک کیا گیا۔'' سیّد وزیر علی کہتے ہیں۔ آخر کار اس نے عدالتی کارروائی کی حکم عدولی کرتے ہوئے علمِ بغاوت بلند کر دیا اور کہا۔ ''میں تو ایک حریت پسند ہوں اور میں آپ جیسے لوگوں سے ڈرتا نہیں جن کے خلاف میں لڑتا رہا ہوں۔ تم مجھے پھانسی نہیں دے سکتے۔ سو جو چاہے آپ کا جی کرے وہ کریں اور جلدی کریں۔'' آج بھی اگرچہ عمر نے اسے تھوڑا سا نحیف کر دیا ہے اس کا جذبہ ویسا ہی ہے۔ ''پاکستانی فوج نے مجھے آزاد کر دیا لیکن مجھ پر ہر قسم کی سرکاری ملازمت کی پابندی عائد کر دی۔'' وہ بغیر کسی تلخی کے کہتا ہے۔

چنانچہ 1954ء میں وزیر علی لاہور آ گیا۔ تباہ و برباد اور چیتھڑوں میں ملبوس۔ ''یہاں کوئی میری مدد کرنے والا نہیں تھا۔ غربت اور غصہ، بس یہی میرے پاس کُل پونجی تھی لیکن پھر جرمن جذبے کے ساتھ میں نے اپنی بقاء کی جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا اور وہ بھی پوری دیانت داری اور سخت کوشی کے ساتھ۔'' اس نے اس جگہ ایک نکڑ میں بیڑیوں کی دکان کھول لی اور اس کا نام برلن رکھ دیا، جہاں سے اتحادی افواج نے اسے گرفتار کر کے قیدی بنایا تھا۔ اس کا دادا جلیانوالہ باغ میں شہید ہو چکا تھا، جس طرح اس کے خاندان کے باقی اراکین بھی شہید کیے جا چکے تھے۔ پوری جنگِ عظیم دوم میں وہ اپنے وطن کی آزادی کے لیے لڑتا رہا اور جب اس کے اپنے ملک نے اس کو بے عزت کیا تب بھی اس نے ہمت نہ ہاری اور اپنی بقاء کی جنگ لڑتا رہا۔ اس نے اپنے لیے بہت اچھا کیا، لیکن اداس ہے کہ اس کا ملک دیانت داری اور مناسب سلوک جیسے اوصاف کو بھلا بیٹھا ہے۔ ''یہ ایک خوبصورت ملک

ہے اور ہم اگر اب بھی دیانتداری سے کوشش کریں تو تھوڑے سے عرصہ میں کمالات دکھا سکتے ہیں۔'' لیکن پھر سیّد وزیر علی جیسے شخص کی بات پر کون دھیان دیتا ہے۔ یا کوئی شخص یہی تکلیف نہیں کرتا کہ اس شخص کی توقیر کرے جس نے پوری زندگی اپنے جدِّ امجد کی سرزمین پر رہنے کے لیے خون میں ادائیگی کی نذر کر دی تھی۔ وہ ایک خاص الخاص نسل کا آخری فرد ہے اور وہ اب بھی بادِ مخالف سے نہیں گھبراتا۔

●○●○●○●

غول بھاروچہ کا آم کا درخت

1913ء میں ایک جواں سال پارسی ڈاکٹر بمبئی میں ایک میڈیکل کالج سے فارغ التحصیل ہو کر لاہور آیا اور اندرون شہر میں سید مٹھا بازار میں آباد ہو گیا۔ یہ اساطیری روایت کے ڈاکٹر ایڈلجی پسٹونجی بھاروچہ کا آغاز تھا، ایک ایسا نام جو ہر لاہوری نے اعتماد اور عزت کے لیے سیکھ لیا۔

لاہور کے پارسی نسلی گروہ کو کئی صدیوں پر محیط اپنے خلاف تعصبات کا اچھا خاصا سامنا کرنا پڑا ہے۔ بارہ سو برس قبل عربوں کے زمانۂ عروج میں ایران پر حملے کے دوران اصلی زرتشتیوں نے اپنا مذہب ترک کرنے سے انکار کر دیا تھا اور بری اور بحری راستوں کے ذریعے ایران کو خیر باد کہہ کر مشرق کی جانب رخ کر لیا تھا۔ وہ روایتی کاٹھ کباڑ کے ساتھ آئے۔ بحرِ ہرمز کو ایران کے جنوب سے عبور کیا اور بمبئی کے شمال میں تقریباً ایک سو پینتالیس کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ایک مقام ''سنجن'' پر اُترے۔ وہ پہاڑوں کی طرف سے بھی فرار ہو کر افغانستان پہنچے اور بالآخر بلوچستان اور پنجاب کا رخ کیا۔ جہاں کہیں بھی وہ پہنچے ہندو راجپوت حکمرانوں نے ان کی آؤ بھگت کی اور انہیں پناہ دے دی۔

ایک روایتی تحریر کے مطابق جو ''قصۂ سنجن'' میں مرقوم ہے، عربوں کی ایران پر فتح کے بعد موجودہ ہندوستان پارسیوں کے جدِّ امجد نے تقریباً ایک سو برس تک خراسان کے کوہستان کے پہاڑی اصلاع میں پناہ لیے رکھی۔ اس کے بعد وہ ایران کے بندرگاہی شہر پُرمز چلے گئے اور بالآخر جنوبی سواشٹرا کے جزیرے، دیو پر اتر گئے۔ عربوں کی جانب سے حملے کی ایک مؤثر دھمکی کے پیشِ نظر پارسی جزیرۂ دیو کو خیر باد کہہ کر ہندوستان کے مغربی ساحل کے ایک مقام پر پھیل گئے جو بعد ازاں سنجن کہلانے لگا۔ یہیں سے برصغیر کے پارسیوں کی کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔

مقامی ہندو راجپوت راجہ نے جو جدّی رانا کہلاتا تھا، پارسیوں کو اپنی سلطنت میں آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ روایت بتاتی ہے کہ راجپوت حکمران راجہ کی طرف سے پارسیوں کو تحفتہً دودھ بھیجا گیا

تو انہوں نے دودھ میں چینی ملانے کے بعد واپس بھیج دیا۔ اس سے مراد یہ لی گئی کہ وہ برصغیر کے لوگوں کی زندگی میں شیرینی بھر دیں گے۔ اس عہد پر پارسی ہمیشہ عمل کرتے رہے۔ لاہور میں راجپوت حکمران، راجہ جے پال نے بھی اُن کو خوش آمدید کہا اور انہیں اپنا ''آتش کدہ'' تعمیر کرنے کی اجازت دے دی۔ روایت کے مطابق یہ سید مٹھا بازار کے نزدیک تھا۔ یہیں ڈاکٹر بھاروچہ آیا اور تب سے اس نے اور اس کی برادری نے اپنی دیانتداری اور سخت کوشی سے لاہور کی زندگیوں کو رسیلا بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر بھاروچہ وہاں سے انارکلی بازار میں آ گیا اور پھر میکلورڈ روڈ پر منتقل ہو گیا۔ جہاں کہیں بھی وہ گیا اس کے گاہک اس کے پیچھے پیچھے گئے۔ اس کی شیریں فطرت اساطیری تھی۔ جدی رانا سے کیا گیا وعدہ قائم رہا۔ جب پاکستان بنا تو اس وقت لاہور میں کُل 56 پارسی خاندان تھے جو 312 افراد پر مشتمل تھے۔ آج ان میں سے صرف 25 خاندان بچے ہیں جن کی کُل آبادی صرف 45 رہ گئی ہے۔ حال ہی میں سات افراد پر مشتمل پورا پسٹونجی خاندان آسٹریلیا نقل مکانی کر گیا ہے۔ ان پچیس خاندانوں میں سے دس خاندان فردِ واحد پر مشتمل ہیں جو سب کے سب مناسب رشتے نہ مل سکنے کی وجہ سے کنوارے رہ گئے۔ چنانچہ بنیادی طور پر صرف پندرہ خاندان رہ گئے ہیں اور تقریباً ان سب کے جواں سال بچے امریکہ اور آسٹریلیا نقل مکانی کر چکے ہیں۔

پینتالیس پارسیوں میں سے تقریباً اسّی فیصد ساٹھ برس سے زائد عمر کے ہیں۔ بزرگ ترین مسز مانک بائی فرام روز کُوپر ہیں، جو مئی 2008ء میں سو برس کی تھیں۔ وہ غالباً معمّر ترین حیات لاہوری ہیں۔ ان کی بیٹی پیرن بوگا تعلیمی اور ڈرامائی حلقوں میں جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ کاروباری حلقوں میں، جہاں ایک زمانے میں پارسیوں کا نمایاں راج تھا، کانڈا والا اور دیگر خاندان ملک چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ ڈاکٹر بھاروچہ کی قائم کی گئی روایت لگتا ہے دھیمی پڑتی جا رہی ہے۔ لاہور میں قدیم ترین جدید طرز کی پرچون کی دکان سرور روڈ چھاؤنی میں ڈنشا جمشید جی سٹور تھا۔ آج کل اس کے پوتے سروش چلّہ، زیادہ تر جائیداد فروخت کرنے کے بعد، کا کاروبار مکھن، پنیر، دودھ کی کریم بنانے والے ایک کارخانے تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کی بیوی آبان لاہور میں بہترین روایتی پنیر بناتی ہے، جو راج کے دنوں سے یکسر مختلف ہے۔

لیکن بھاروچہ خاندان نے پارسیوں کی تنظیم کا بندوبست کر لیا ہے۔ رستم بھاروچہ ایک پکا لاہوری، کاروں کی انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے انگلستان گیا اور لی لینڈ کمپنی میں کام کرتا رہا۔ وہ بھی آج کل اپنی برادری کو مکمل بدنظمی میں دیکھ کر راضی برضا ہو کر بیٹھ رہا ہے، لیکن اس کی غُول رستم بھاروچہ ایک نبرد آزما عورت ہے۔ وہ کوئٹہ میں پیدا ہوئی تھی جہاں اس کا والد کنٹرولر ملٹری اکاؤنٹس کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ جب وہ آٹھ سال کی تھی تو اس کے والد کا کوئٹہ سے امرتسر تبادلہ ہو گیا۔ کوئٹہ سے روانگی 31 رمئی 1935ء کو ہونا تھی، لیکن اُس کی جگہ تعینات ہونے والے اہلکار کو ایک روز بعد کوئٹہ پہنچنا تھا لہٰذا روانگی اسی وجہ سے ایک روز بعد طے پائی۔ لیکن عین

اسی روز ایک زبردست زلزلے نے کوئٹہ کو آلیا۔ غُول کا پورا خاندان اس کے دونوں والدین اور تینوں بہنیں اس روز کے المیہ واقعہ میں ہلاک ہوگئے۔ ننھی غُول اکیلی رہ گئی اور اسے کراچی لایا گیا۔

اس نے بڑی کٹھن زندگی گزاری، لیکن اپنے لیے بہت کچھ کرلیا۔ غُول، رستم باروچہ سے شادی کرنا چاہتی تھی اور اسے تیرہ برس انتظار کرنا پڑا تب والدین راضی ہوئے۔ 1965ء میں شادی سے تین دن پہلے پارسی روایت کے مطابق اس نے آم کا ایک پودا کراچی میں ایک گملے میں لگایا۔ وہ گملا لاہور لے آئی اور بالآخر جب اس کے خاوند نے نئے نئے منصۂ شہود پر آنے والے گلبرگ میں ایک گھر خریدا تو اس نے اس پودے کو اپنے لان میں لگا دیا۔ چند برس پیشتر اس نے یہ گھر مدر ٹریسا ٹرسٹ کو فروخت کر دیا، لیکن ایک وعدہ لینے کے بعد کہ آم کا درخت کبھی نہیں کاٹا جائے گا۔ نیک دل خریدار نے وعدہ کیا کہ وہ شاندار آم کے درخت کو کبھی نہیں کاٹے گا۔ آج غول بھاروچہ کا آم کا درخت غالباً لاہور میں سب سے بڑا اور عمدہ ترین ہے۔ اس میں ہر دوسرے برس پھل آتا ہے اور اس کے آم بے حد میٹھے ہوتے ہیں۔

لاہور کے بقیہ پینتالیس پارسیوں کو ابھی مزید گھٹتے رہنا ہے۔ جو ماحول ہم انہیں فراہم کر رہے ہیں اتنا دلکش نہیں ہے کہ وہ اپنے لائق بیٹوں اور بیٹیوں کو مغربی دنیا سے واپس لاہور لا سکیں۔ میں یہ کہنے کی جرأت نہیں کروں گا کہ سید مٹھا بازار کے ڈاکٹر بھاروچہ کی روایت اس وقت تک قائم رہے گی جب تک غُول بھاروچہ کا آم کا درخت استادہ ہے، لیکن اس کا خیال مجھے رنجیدہ کر دیتا ہے۔ بے حد رنجیدہ!

●○●○●○●

جب مغربی محاذ ابھی خاموش نہیں ہوا تھا

پہلی مرتبہ ایسا 1972ء میں ہوا جب میں لاہور سے مختلف گاڑیوں میں مفت لفٹ لے کر لندن عازمِ سفر تھا۔ دوسری مرتبہ پچیس برس بعد ایک ولندیزی دوست کے ساتھ اور تیسری مرتبہ بروز بدھ 7/اگست کے دن میں ایکبار پھر وہاں موجود تھا۔ ایک لاہوری زائر کی حیثیت سے اپنے قدیم شہر کے مدفونوں کو دیکھنے گیا ہوا تھا۔ ہر بار یہ ایک غیر معمولی رقت انگیز لمحہ ہوتا ہے اتنا زیادہ کہ میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

بلجیم کے شہر ایپرے میں وہ چونسٹھ ہزار سے زائد مدفن ہیں۔ ہندوستانی افواج کی لاہور ڈویژن کے جوان، برطانوی سلطنت کی توپوں کا ایندھن۔ ان کے فوتی نامے اب بھی نہایت شاندار تعمیر کردہ مینن گیٹ کی دیواروں کی زینت ہیں جنہوں نے فلینڈرز، سوم، اور ایپرے کے جان لیوا میدانِ جنگ میں اپنی جانیں قربان کی تھیں۔ مغربی محاذ پر ہندوستانی افواج کی لاہور ڈویژن اور میرٹھ انفنٹری ڈویژنوں کی عظیم یادگار سر ہربرٹ بیکر نے ڈیزائن کی تھی اور اس کا افتتاح نیو وشیپل کے مقام پر 1927ء میں ہوا تھا جو جنگِ عظیم اوّل کے ابتدائی برسوں میں خوں ریز ترین اور مشہور جنگی معرکہ کی جائے وقوع تھی۔

فوت شدگان کی یہ لمبی چوڑی فہرست تقریباً تمام کی تمام برصغیر کے ناموں پر مشتمل ہے اور ان میں سے معتدبہ تعداد لاہور ڈویژن سے تعلق رکھنے والے جوانوں کی ہے۔ موچی دروازے کا سپاہی محمد احمد اپنے والدین کے نام خط میں لکھتا ہے۔ ''یہ جنگ نہیں، یہ تو دنیا کا خاتمہ ہے۔'' اس کا یہ خط آج بھی ایپرے سے ذرا بیرون واقع عجائب گھر میں فریم کیا ہوا دیوار پر لٹک رہا ہے۔ اس کا نام مینن گیٹ کی فہرست میں بھی شامل ہے۔ وہ ایپرے ہی میں کہیں دفن ہے کیونکہ وہ لوٹ کر گھر نہیں آیا۔ ایک لاکھ اکیاسٹھ ہزار دوسرے جوانوں کی طرح جن میں سے اکثریت لاہور ڈویژن اور میرٹھ انفنٹری ڈویژنوں کی تھی۔ اس زمانے کے لاہور کی جواں سال نسل کے تقریباً پانچ فیصد لوگوں کے اجسام اور ارواح ایپرے، سوم اور فلینڈرز کے جنگی میدانوں میں دفن ہیں۔

ہم میں سے بہت کم لوگوں کو یہ علم ہے کہ جنگِ عظیم اوّل کی وجہ سے لاہور شہر اور اس کے مضافات کا

کس قدر نقصان ہوا تھا۔ برطانوی فوجی سنسر شپ نے بظاہر صورتِ حال کو قابو کیے رکھا، لیکن اس کے باوجود عوام تک پہنچنے والے خطوط نے، پنجاب میں 1919ء میں وسیع تر ہنگاموں میں، خاطر خواہ کردار ادا کیا۔ لاہور کے پٹواریوں کو اپنی اپنی پٹوار سے صحت مند نوجوانوں کی تلاش اور انہیں زبردستی انگریزوں کی فوج میں بھرتی کرانے کا کام سونپا گیا تھا۔ بصورتِ دگر انہیں ان کی نوکریوں سے فارغ خطی تھی۔ چنانچہ اگست 1914ء میں اوّلیں جتھے فرانس اور بلجیم پہنچنے شروع ہو گئے تھے۔ ایک سال کے اندر اندر لاہور اور میرٹھ کے ایک لاکھ اکیسا سٹھ ہزار سپاہی وہاں پہنچ چکے تھے، چنانچہ لاہوریوں کو ایپرے کے مقام پر جنگ میں جھونک دیا گیا۔

1914ء میں اکتوبر کا مہینہ تھا جب جرمنی کی افواج نے حملہ کر دیا۔ لاہوریوں نے دفاع کیا اور اس قدر غیر معمولی دفاع کیا کہ انہیں حکم ملا کہ جرمنوں کے مورچوں پر جوابی حملہ کر دیں۔ اسی شام اکتوبر کی سخت سرد اور بھیگی شام، کو جوابی حملہ کر دیا گیا۔ مشین گنیں کھڑکھڑاتی رہیں اور لاہوری آگے بڑھتے چلے گئے اور بھاگ بھاگ کر گرتے رہے۔ صرف ایک بٹالین، 47ویں سکھ کے 764 جوانوں میں سے جنہوں نے جوابی حملہ کیا تھا صرف 385 زندہ بچے تھے۔ اس جھڑپ سے لاہوریوں کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ بہت ہی گھمسان کی جنگ تھی۔ دنیا کا خاتمہ عنقریب تھا۔

چار ماہ کی خونریز جنگ کے بعد انہیں محاذِ جنگ سے ہٹا لیا گیا۔ لاہور ڈویژن کو گھر خطوط لکھنے کی اجازت دی گئی لیکن اس شرط پر کہ خطوط صرف کمپنی کا کلرک تحریر کرے گا۔ وہ خطوط آج بھی مغربی محاذ پر زندگی کی جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔ ان کو جلد احساس ہو گیا کہ ان کے خط سنسر کیے جاتے تھے چنانچہ وہ خفیہ الفاظ استعمال کیا کرتے تھے۔ ایک لاہوری نے گھر خط لکھا کہ ''کالی مرچ کی کاٹ بہت تیز ہوتی ہے، لیکن اب اس کی مقدار بے حد کم رہ گئی ہے۔'' کوٹ عبدالمالک کے رہنے والے ایک سپاہی نے مایوسی میں گھر کر خط لکھا: ''میں تو اب جگنو سے بھی ڈرتا ہوں جسے کبھی گاؤں میں پکڑنے کے لیے بیقرار رہتا تھا۔''

تھوڑا عرصہ آرام کے بعد انہیں دوبارہ 1915ء میں جنگ میں دھکیل دیا گیا۔ اس سال کے دوران ہی خونریز ترین گھمسان کی مورچہ بند خندقوں والی لڑائیاں ہوئیں۔ لاہور اور میرٹھ ڈویژنیں پوری برطانوی اور اتحادی افواج کا تقریباً نصف حصہ تھیں، جو مارچ کے مہینے میں نیو شیپل کی مشہور جنگ میں حملہ آور ہوئیں۔ لاہور ڈویژن کو ہدف پا لینے کے بعد اس محاذِ جنگ سے ہٹا کر بلجیم میں جنگِ ایپرے دوم میں دوسرے جوابی حملے میں جھونک دیا گیا۔ اس نے بھاری نقصان اٹھا کر دفاعی دیوار توڑ دی لیکن ستمبر تک لڑتی رہیں۔ اس خونریز ترین جنگ کا خاتمہ ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ لاہوریوں کو پیچھے ہٹا لیا گیا اور چند روز آرام کرانے کے بعد ستمبر 1915ء میں پھر مشہور جنگِ لوس میں دھکیل دیا گیا۔

اس وقت تک میرٹھ کے جوانوں کا مورال متزلزل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ انہیں محاذِ جنگ سے ہٹا

لیا گیا۔ آرام کرنے دیا گیا اور پھر میسو پوٹامیا روانہ کر دیا گیا۔ مشرقِ وسطیٰ میں جنگ حدّت اختیار کر چکی تھی اور برطانوی سلطنت کو ان کی وہاں ضرورت پڑ گئی تھی۔ سوم کے محاذِ جنگ پر گھمبیر لڑائی جاری تھی اور بہت سی جانیں تلف ہو رہی تھیں۔ لاہوریوں کو وہاں بھیج دیا گیا۔

ستمبر 1916ء میں ایک لاہوری نے اپنی ماں کو خط لکھا۔ ''یہ ناممکن ہے کہ میں زندہ گھر آسکوں، لیکن غم نہ کریں کیونکہ میں ہاتھ میں ہتھیار تھامے جنگی وردی میں مروں گا۔ یہ سب سے زیادہ خوشی والی بات ہوگی۔'' یہ خط ہی پوسٹ نہ ہوا تھا اور اب بلجیم کے جان لیوا میدانِ جنگ کے نزدیک محفوظ کردہ خندقوں کے پاس واقع عجائب گھر میں لٹک رہا ہے۔

دو ہندوستانی کیولری ڈویژنیں، لاہور ڈویژن سمیت، مارچ 1918ء تک یورپ میں مقیم رہیں۔ لیکن جب فتح سامنے نظر آنے لگی اور خاصا خون بہہ چکا تو حتمی قتل و غارت کے لیے انگریزی افواج محاذ پر آن شامل ہوئیں۔ وہ پانچ طویل برسوں تک جنگ لڑتے رہے تھے۔ جب میں خط پر خط پڑھ رہا تھا اور ایک سے دوسری خندق میں جا رہا تھا، ایک یادگار کے بعد دوسری یادگار دیکھ رہا تھا تو میں اپنے شہر کے لوگوں، اپنے جدِ امجد کی ارواح کو محسوس کر سکتا تھا جو مجھ تک رسائی حاصل کر کے پوچھ رہی تھیں کہ ان کے شہر کا کیا حال ہے؟ شہر کی گلیاں، سڑکیں اور محلے بھی ان سے ملتے دکھائی دیتے تھے۔ ہمارے گمنام لڑکے، لاہور کی گلیوں اور محلوں کے، ہمارے شہر کے گرد و نواح میں واقع دیہاتوں کے لڑکے، تمام کے تمام اپیرے میں دفن ہیں۔ ان کے لیے تو واقعی دنیا کا خاتمہ بالخیر ہو گیا تھا۔

لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ لاہوریوں کو مارچ 1918ء میں ترکوں کے خلاف جارحیت میں حصہ لینے کے لیے فلسطین بھیجا گیا لیکن یہ الگ کہانی ہے۔ لیکن لاہوری ہونے کا مطلب ہے کچھ خاص الخاص کام کرنا۔ فرانس اور بلجیم میں قیام کے دوران سپاہیوں کی بہت سی عورتوں سے ملاقاتیں رہیں۔ ان کا احوال مختلف طرح سے بیان ہوا ہے۔ اس خون اور آنسوؤں کی کہانی کے خاتمے پر موزوں معلوم ہوتا ہے کہ لاہوریوں کے حسِ مزاح کا بھی ذکر ہو جائے۔ بھاٹی دروازے کے رہائشی سپاہی کرم داد نے 1917ء میں ایک فرانسیسی عورت سے شادی کر لی۔ اس خبر سے گھر والے خاصے افسردہ ہو گئے۔ اس نے تلملا کر گھر جوابی خط لکھا جس میں اس نے وضاحت کی کہ ''میں کیا کرتا انگلستان کے بادشاہ نے مجھے خود، ذاتی طور پر، اس عورت سے شادی کرنے کا حکم دیا تھا۔'' یہ خط بھی اپیرے کے عجائب گھر میں لٹک رہا ہے۔ میں حیران ہوں کہ کرم داد کا آخر کیا بنا؟

●○●○●○●

میاں میر کے مقام پر 26ویں نیٹوؤ کا ذبیح

ہماری تاریخ کے دو واقعات نے مجھے بچپن ہی سے ہمیشہ پریشان کیے رکھا ہے۔ اوّل یہ کہ 1857ء کے غدر میں پورے برصغیر کو چند ہزار انگریزوں نے قابو کیے رکھا؟ دوم یہ کہ اس بغاوت میں لاہور کا کیا کردار رہا تھا؟

جب 10 رمئی 1857ء کو میرٹھ میں بغاوت پھوٹی تو پنجاب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج ساٹھ ہزار افراد کے لگ بھگ تھی جس میں سے صرف دس ہزار برطانوی سپاہی تھے۔ پنجاب پر قبضہ کیے ابھی صرف گیارہ برس ہوئے تھے اور سب سے بڑھ کر ترجیح گائیڈ کور کی لشکر بندی پر دی گئی تھی۔ جو 1846ء میں ہنری لارنس نے لاہور میں بھرتی کی تھی اور آج بھی افواجِ پاکستان میں گائیڈز ایک اعلیٰ درجے کی رجمنٹ ہے۔ گائیڈز تُند خو ڈاکوؤں پر مشتمل تھی حتیٰ کہ پیشہ ور شکاریوں کو بھی بھرتی کر لیا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ایک ایسا بے رحم لشکر جمع کیا جائے جو انگریزوں کے خلاف ہندوستان کی سخت ترین مخالفت کو کچل کر رکھ دے۔

ایک نہایت مضبوط داخلی جاسوسی نظام قائم کیا گیا جس کی باقیات آج بھی پنجاب میں موجود ہیں۔ پنجاب پولیس کی بے رحمانہ بنیاد پر تربیت کی گئی اور اس کی خفیہ برانچ کو مغلیہ دور کے چوکیدارانہ نظام کی ترمیم کے بعد ان کو یکجا کر کے ایسا انتظام کیا گیا کہ پورے ملک میں مکمل امن قائم ہو سکے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد کے دس برس میں مکمل شوریدہ سری کا شکار ہو کر رہ گیا تھا۔ ان اصلاحات کے ساتھ ساتھ نہروں کی کھدائی، سات کمشنریوں یا ڈویژنوں کا قیام، جس کے ہمراہ پانچ سطحی انتظامیہ کا نظام جو تحصیلدار سے شروع ہو کر اوپر کی سطح ڈویژنل کمشنر تک جاتا تھا۔ افسروں کو وسیع اختیارات تفویض کیے گئے اور اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ مقدمات کو کم از کم ممکن وقت میں نبٹایا جائے۔ مقولہ جس پر عمل کیا جاتا تھا یہ تھا کہ ''قابلیت کے بجائے صلاحیت سے حکومت کی جائے۔'' لارنس نے پنجاب کے لیے نہایت قابل اور دیانتدار افسروں کو بھرتی کیا اور زراعت کی حالت سدھارنے کے لیے بھاری سرمایہ کاری کی۔ دس برس کے اندر اندر ''ملک پنجاب'' ایک بالکل مختلف سرزمین بن گئی۔ ان دس برسوں میں تمام اسلحہ ضبط کر کے تلف کر دیا گیا۔ خالصہ فوج کا نام و نشان مٹ گیا اور

خوشحالی لوٹ آئی۔ انگریزوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ رنجیت سنگھ ایک نہایت عمدہ تعلیمی نظام قائم کر گیا تھا۔ انگریزوں نے اسی پر استوار کر کے سنٹرل ماڈل سکول اور اعلیٰ درجے کے کالج قائم کر دیئے۔

ان حالات میں 1857ء کے غدّر کا واقعہ پیش آیا۔ پنجابیوں اور ہندوستانیوں میں، جنہیں پوربی کہا جاتا تھا، فطری طور پر عدم اعتمادی تھی۔ پنجابی انہیں اپنے ملک کا انگریزوں کے ہاتھوں سقوط کا الزام دیتے تھے اور یہ عدم اعتمادی آج تک چلی آتی ہے۔ انگریزوں نے اس عدم اعتمادی کو زبردست طریقے سے استعمال کیا۔ ایک بھرپور فصل اور نہایت مطمئن دہقان طبقے کا مطلب تھا کہ پنجابیوں کو من حیث القوم کیا مجبوری تھی کہ وہ غدّر میں حصہ لیں، لیکن جس طرح پوربیوں نے کیا اسی طرح پنجابیوں نے بھی کیا۔

لاہور میاں میر چھاؤنی میں پُراسرار آتش زدگی کا آغاز ہو گیا۔ اس علاقے میں جہاں صدر بازار ہے، بغاوت پھوٹ پڑی۔ ہنری کے بھائی، جان لارنس نے لاہور کو مقامِ عبرت بنانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ وہ پنجابیوں کو بے ہتھیار کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔

26ویں نیٹو انفنٹری رجمنٹ، جو صدر کے علاقے میں تعینات تھی، کے جوانوں نے اپنے افسروں پر، جو دھرم پورہ کے قریب اولڈ آفیسرز کالونی میں رہائش پذیر تھے، حملہ کر دیا۔ لارنس ان کو بے ہتھیار کرنے کے لیے متحرک ہوا۔ رجمنٹ نے دریائے راوی کا رخ کیا جو شمال کی جانب فقط آدھ میل دور تھا۔ پنجاب پولیس کے ایک دستے نے ان کا پیچھا کیا اور ایک خوفناک خوں ریزی میں 26ویں نیٹو رجمنٹ کے ڈیڑھ سو سپاہیوں کو ذبح کر دیا گیا۔ لیکن رجمنٹ کا بڑا دستہ دریا میں واقع ایک چھوٹے سے ٹاپو پر چلا گیا، جو دریائے راوی کے پرانے پل سے آج بھی نظر آتا ہے۔ اس کے لیے ڈپٹی کمشنر ایف کُوپر اپنے پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ حرکت میں آیا اور مزید پچاس فوجیوں کو ڈھونڈ نکالا اور جب ان سب نے حوالگی دے دی تو انہیں گولی مار دی گئی۔ اس ذبیح کو دیکھ کر باقی سپاہی تیر کر لاہور شہر کی جانب واپس چلے گئے جہاں ان بقیہ دو سو اسّی سپاہیوں کو گرفتار کر کے اجنالہ گاؤں کے تھانے کے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

کُوپر ان لوگوں کو عبرت کی مثال بنانا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے لاہور کے عوام کو اِن ''غداروں'' کا ذبیح دیکھنے کے لیے دعوتِ عام دی۔ اس نے دس دس جوانوں کی ایک کھیپ بنائی اور ان کو دن کی روشنی میں دہشت زدہ حاضرین کے روبرو ذبح کر ڈالا۔ جب کھلے عام 237 جوانوں کو ذبح کیا جا چکا تو باقی ماندہ پینتالیس جوانوں کو ایک کال کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا، جس میں کوئی کھڑکی یا سانس لینے کے لیے تازہ ہوا کا گزر بھی نہ تھا۔ نتیجتاً سب کے سب قیدی دَم گھٹ کر مر گئے۔ یہ واقعہ کلکتہ کے ''بلیک ہول'' سے بھی بدتر کہانی ہے، لیکن اس کا کہیں ذکر تک موجود نہیں ہے۔ اگلے روز ان کی لاشیں نکالی گئیں اور قلعہ لاہور کے قریب توپوں کے دہانوں پر باندھ دی گئیں اور پھر توپ داغ کر ان کو پرزے پرزے کر ڈالا گیا۔

بعد میں بیالیس مزید جوان پکڑے گئے اور ان سب کو اندرونِ شہر کی دیواروں کے بیرون توپوں سے زندہ اڑا دیا گیا۔ یوں 26ویں نیٹوؤ انفنٹری رجمنٹ پوری کی پوری ''انصاف'' کی بھینٹ چڑھا کر ذبح کر دی گئی۔ اس واقعہ سے پورے پنجاب میں دہشت پھیل گئی۔ ایسی دہشت جو 1857ء کے غدر کے خوفناک ایام کے دوران انگریزوں کے حق میں موافق رہی۔

نتیجتاً پنجابیوں کی وفاداری، خوفزدہ اطاعت گزاری، خصوصاً شہزادوں اور امیر زمینداروں کی، نے پنجاب اور باقی ماندہ ہندوستان کو انگریزوں کے لیے محفوظ رکھنے میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ انگریزوں کی ہیئت حاکمہ کے تقریباً ہر مرکز کو بچانے میں سکھ سپاہیوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ انہی سکھ سپاہیوں نے دہلی پر حملہ آوروں کی پیش قدمی کی اور یہ لاہور ہی کے ہڈسن اور اس کے گھڑ سوار سپاہی تھے، جنہوں نے بہادر شاہ ظفر، اس کی بیگم اور بیٹوں کو گرفتار کیا تھا۔ سکھوں کو ان کی خدمات کے عوض فیاضانہ نقد رقوم اور زمینیں عطا کی گئیں۔ ان ہی عارضی سپاہیوں سے پنجاب عارضی فوج کی تشکیل ہوئی جو بعد میں پفرز کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

ان شاندار پنجابی سپاہیوں کی پشت پناہی سے اور حکمت عملی سے کام لینے والوں نے فیصلہ کیا کہ غدر مچانے والوں کو انہیں ہراساں کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ بلکہ ان کے ساتھ گھمسان کی لڑائیاں کر کے یا اپنے دفاع کے لیے قلعہ بند مقامات پر رہ کر انگریزوں نے برصغیر کی بے قائد فوج کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ روایتی پنجابی یا مرہٹہ والی ہراساں کرنے کی حکمت عملی نہیں اپنائی گئی۔ لہٰذا غیر ملکیوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا جسے انہوں نے جی بھر کر استعمال کیا۔ صرف دہلی میں چھ لاکھ سپاہیوں کو پرانی دلی کی تنگ جگہ میں محبوس کر دیا گیا۔ پنجابیوں اور انگریز توپچیوں نے ان کو روکے رکھا اور پھر سفاکی سے اڑا دیا۔ اس سے ''غدر'' کا خاتمہ ہو گیا اور برصغیر کے اگلے سو برس نسبتاً سکھ چین سے گزرے۔

لاہور کی 26ویں نیٹوؤ انفنٹری کے جوانوں کی کوئی یادگار قائم نہیں کی گئی۔ بہر حال مال روڈ پر کور کمانڈر کے گھر کے عین سامنے ایک شاندار نشانِ راہ استادہ ہے جس پر اُن رجمنٹوں کے نام درج ہیں جو پوری دنیا میں جنگیں لڑتی رہی تھیں بشمول 1857ء کے ''غدر'' میں بھی اور جو لاہور میں تعینات رہیں اور انگریزوں کی خدمات بجالاتی رہیں۔ اس ایک نشانِ راہ پر پوری تاریخ رقم ہے۔ شاید آئندہ ایام میں کبھی ہم ان تمام جوانوں کو یاد کر سکیں جو مادرِ وطن کی حمایت کی خاطر ذبح ہو گئے تھے۔ لیکن اس دن کی آمد میں لگتا ہے بہت عرصہ لگے گا۔

●○●○●○●

اپنی ناموردیواروں کے بغیر لاہور

ہم اپنے شہر کو ''قدیم حصاری دیواروں والا شہر لاہور'' کہتے ہیں۔ لیکن ہم میں سے بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ پکی اینٹوں والی دیواریں درحقیقت اتنی زیادہ قدیم نہیں ہیں۔ اس کے باوجود وہ قدیم تو ہیں اور بہت ہی قدیم۔ لیکن شہر کی پکی اینٹوں کی اپنی ایک الگ تاریخ ہے۔

یہ جاننا نہایت اہم ہے کہ قدیم شہر کی شکل وصورت، حجم اور دیواریں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ مقامی جغرافیائی خصوصیات کی رُو سے قدیم فصیلی لاہور شہر میں اساسی طور پر تین بلند ترین مقامات ہیں یعنی قلعہ لاہور، لانگا منڈی اور محلّہ موہلیاں جو بازار مالی کے عین شمال میں ہے۔ قلعہ بلاشبہ سب سے بلند مقام ہے، جبکہ لانگا منڈی ٹیلہ، قدیم حصاری شہر میں سب سے اونچی جگہ ہے۔ اس علاقے کی نشاندہی جنوبی جانب گمٹی بازار تک ہے جو سید مٹھا بازار میں مدغم ہو جاتا ہے۔ آپ ملاحظہ کریں گے کہ یہ نیم مدّور گلیاں ایک دوسرے میں مدغم ہوتی ہیں۔ لفظ ''گمٹی'' کا مفہوم ہی ایک بَل کھاتی گلی کا ہے اور لفظ ''لانگا'' کے معنی ''شارعِ عام'' کے ہیں۔

گلیوں کا مطالعہ اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ لانگا منڈی کی آبادکاری مختلف زمانوں میں تہ در تہ اِرتقاء پذیر ہوئی ہے۔ یہ قلعہ لاہور کے بیرون اوّلیں آبادکاری ہوسکتی ہے۔ یہ علاقہ سارے اندرون شہر میں بلند ترین مقام ہے اور ماہرین اور آثارِ قدیمہ والوں کے نزدیک یہی وہ امکانی جگہ ہے جو قلعہ کے بیرون اوّلیں نو آبادی ہوسکتی ہے۔ لانگا منڈی سے مغرب کی طرف کا علاقہ ہمیں ایک اور ٹیلے کی جانب لے جاتا ہے جسے ہم آج کل ٹبّی کہتے ہیں جو دراصل ٹبہ کہلاتا تھا یعنی ٹیلہ۔ جنوب کی طرف تحصیل بازار ہے اور شمال کی جانب قلعہ ہے۔ لانگا منڈی اور ٹبّی تحصیل بازار کے اس علاقے کو ہی اصل قدیمی لاہور کہا جاسکتا ہے۔

قلعہ لاہور کی دیواریں اکبر اعظم (1556-1605ء) کے زمانے تک گارے کی بنی ہوئی تھیں۔ ''قلعہ لاہور کی گارے والی دیواروں کی موٹائی'' بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس قدر کشادہ تھیں کہ ان پر

گھوڑے دوڑائے جاسکتے تھے۔ جیسا کہ مؤرخ سُوجن رائے نے اپنی 1695ء کی ایک تحریر میں ذکر کیا ہے۔ قلعہ کی طرح اس بات کے شواہد بھی پائے جاتے ہیں کہ یہ گارے کی دیواریں خم کھا کر لانگا منڈی اور ٹبّی کے آباد علاقوں کو بھی اپنے گھیرے میں لے چکی تھیں۔ اگر یہ وضاحت تسلیم کر لی جائے، اگرچہ بہت سے لوگ قدیمی لاہور کے بارے میں اس ''مفروضے'' کو نہیں مانتے، تو پھر لاہور شہر کی اوّلیں فصیل گارے کی دیوار تھی جو قلعہ کے عین جنوب میں واقع علاقے کا حصار کیے ہوئے تھی۔ جس میں تحصیل اور گمٹی بازاروں کی جنوبی ترین حدود اور پھر بل کھا کر بیضوی شکل کی گڑھی میں ملتی تھی جو قلعہ لاہور کی دیواروں کے عین جنوب میں واقع تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ہمیں چند مزید نوآبادیاں اس حصار سے باہر دکھائی دیتی ہیں۔ اوّلیں آبادیوں کا سراغ لوہاری دروازے کے اندر لگایا جاسکتا ہے۔ عین اس سڑک کے ساتھ ساتھ جو جنوب سے اس حصاری آبادی کی طرف آتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ آبادی اتنی پھیل گئی کہ اس علاقے کو اپنے گھیرے میں لے لیا جو لوہاری دروازے سے شروع ہو کر، جو غالباً قدیمی اندرون شہر کا قدیم ترین دروازہ ہے، مغرب میں اس دیوار تک پھیلا ہوا ہے جو بازارِ حکیماں کے مشرقی جانب واقع ہے اور مشرقی جانب اس دیوار تک جو عین شاہ عالمی بازار کے مغرب میں واقع ہے اور رنگ محل تک جاتی ہے اور پھر قلعے کا رخ کرتی ہے۔

یہ وسیع نوآبادی ہی اصل قدیمی اندرون شہر لاہور ہے، جس کے بارے میں 150ء میں پٹلومی نے حوالہ دیتے ہوئے اسے لاوا لکا یا لابوکالا کی رہائش بتایا ہے۔ راجہ رام چندر اور سیتا اور لاہو اور قصو کی ہر دلعزیز اساطیری روایت جس کا حوالہ سب سے پہلے سُوجن رائے نے دیا ہے۔ بنیادی طور پر اس کا حوالہ ہر دلعزیز اساطیری روایت کے مطابق لاہور کے قدیمی مندر کی اصلیت معلوم کرنے کے بارے میں تھا، جو اَب قلعہ لاہور کے اندر موجود ہے۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ دو ہزار سال قبل بھی گارے کی دیواروں والا شہر لاہور اور اس کا گارے کی دیواروں والا قلعہ، برصغیر کا ایک بڑا شہر تھا جو اس وقت بل کھاتے ہوئے دریائے ارادہ یا راوی کے کناروں پر واقع تھا۔

بے شمار قافلے جو لاہور آتے تو تمام کے تمام گارے والی دیواروں کے قدیمی شہر لاہور کے مشرقی جانب ڈیرے ڈالتے تھے۔ ایک نمایاں تجارتی شہر کی حیثیت سے گارے کی دیواروں کے عین مشرق میں ایک وسیع آبادی ابھرنا شروع ہوگئی۔ ان تاجروں نے رات کے وقت ڈاکوؤں کے ہراساں کرنے کی شکایت کی۔ جیسا کہ 982 عیسوی کی کتاب ''حدود العالم'' میں بیان ہوا ہے۔ اس زمانے میں مشرقی دیواروں کے ساتھ ساتھ، اور ذرا فاصلے پر جنوبی طرف، چھوٹی چھوٹی نوآبادیاں ابھرنا شروع ہوگئی تھیں۔ مغربی جانب، مغرب سے آنے والے قافلے ٹھہرا کرتے تھے جو وہیں آباد ہو گئے۔ جسے ہم آج کل شاہدرہ کے نام سے پکارتے ہیں۔

اِن حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ اکبرِ اعظم کی آمد ہوتی ہے جس نے یہ فیصلہ کیا کہ شہر کو پکی اینٹوں کی چار دیواری کا حصار مہیا کیا جائے۔ یہ کاروباری طبقے کو تحفظ دینے کے لیے کیا گیا تا کہ وہ اپنا کاروبار اطمینان سے

جاری رکھ سکیں۔ اس سے دیواروں کے اندر باغات اور وسعت کے پیشِ نظر خاصی خالی زمین بھی مل گئی۔ اکبر ہی حقیقی طور پر وہ شخص تھا جس نے قدیمی لاہور کو موجودہ شکل وصورت عطا کی۔

اوّلیں اینٹوں والی دیواریں قلعہ کی تھیں۔ گارے کی اصل دیواروں پر تعمیر کردہ اینٹوں والی دیواروں کی سابقہ چوڑائی قائم رکھی گئی جو اس زمانے کے معماروں کی برتری کی منہ بولتی مثال ہے۔ ایک بار جب قلعے کی دیواریں محفوظ ہو گئیں تو اکبر نے ایک وسیع اور نئے لاہور کی تعمیر شروع کرادی جو پورے کا پورا ٹھوس پکی اینٹوں کی دیواروں کے حصار میں ہونا تھا۔ وہی حصاری لاہور آج کا قدیمی لاہور ہے جس سے ہم واقف ہیں۔ بازارِ حکیماں کے مغرب میں نئے علاقے اور اسی طرح شاہ عالمی بازار کے مشرق کی جانب وسیع علاقے بھی اس میں شامل کر لیے گئے۔ پرانے گارے والی دیواریں، ہموار کر لی گئیں اگرچہ ان دونوں مقامات پر اب بھی ان دیواروں کے آثار پائے جاتے ہیں۔

شہنشاہ نے دو دروازوں کی ہر جوڑی کے درمیان دس برج تعمیر کرائے۔ ایک تحریر میں ان دیواروں کی پیمائش دی گئی ہے جس میں ان کی بلندی ساڑھے دس میٹر اور ''چوڑائی ان پر توپیں نصب کرنے کے لیے کافی سے زیادہ تھی۔'' بعد میں اورنگ زیب نے مغربی دیوار ایک سیدھ میں تعمیر کرائی اس نیک نیتی کے ساتھ کہ دیوار بادشاہی مسجد کے ہم آہنگ ہو جائے۔

اکبرِ اعظم کے دور میں ہی شہر کے موجودہ دروازوں کی تعمیر ہوئی۔ ہر لحاظ سے اکبر کا شمار ان دو عظیم معماروں میں ہوتا ہے جنہوں نے لاہور کی دیواریں تعمیر کرائیں۔ ہو سکتا ہے یہ بات طعن آمیز معلوم ہو لیکن 2005ء میں چند دستاویزات کے مطابق موسم برسات کے آغاز سے پہلے مہینے میں، لاہور شہر کی فصیل کی تکمیل کی چار سو سالہ برسی ہو چکی ہے۔ ہماری اس نادر موقع سے مکمل اور کلی عدم واقفیت سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ کوئی دیوار باقی رہی ہی نہیں جس کی تقریب منائی جائے۔

اکبرِ اعظم کے بعد اور مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی لاہور شہر پر پے در پے حملے ہوتے رہے۔ دیواریں بوسیدہ ہونے لگیں۔ بعض مقامات پر بڑے بڑے خلا پیدا ہو گئے کیونکہ اینٹوں کے چوروں نے، جو اَب بھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں، ان اینٹوں سے اپنے گھر تعمیر کر لیے اور ملک کا قانون، جواب بھی ویسا ہی ہے، ایسے وقوعوں کو درگزر کر جاتا ہے۔ جب 1751ء میں افغانی حملہ آور احمد شاہ ابدالی نے لاہور پر چڑھائی کی تو لاہور شہر کی دیواریں محاصرہ برداشت نہ کر سکیں اور میر منّوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کے بعد جب ابتری پھیلی تو دیواریں غائب ہونا شروع ہو گئیں۔

یہ دو سو برس بعد کی بات ہے جب 1799ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کیا اور فوری فیصلہ کیا کہ سابقہ پُرعظمت دیواریں از سرِ نو تعمیر کی جائیں۔ اس نے اضافی کام یہ کیا کہ ان دیواروں کے گرداگرد ایک خندق تعمیر کرائی جس میں پانی دریائے راوی سے آتا تھا۔ اس نے یہ بھی تسلی کر لی کہ ان کی دیکھ بھال صحیح طور

پر ہو۔اس کام کے لیے اس نے حکما سنگھ کو مقرر کیا اور اسے خندق کے دوسرے کنارے پر ایک اور دیوار تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ایک لحاظ سے اس نے لاہور کی دوسری دیوار تعمیر کرائی اگر چہ یہ زیادہ بلند نہیں تھی۔اس سے یقین ہو گیا کہ لاہور اب آئندہ محاصرے یا حملے کو برداشت کر سکے گا۔اس سے پیشتر لاہور شہر کی اتنی بہتر قلعہ بندی کبھی نہیں ہوئی تھی۔حکما سنگھ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا، دِیوا سنگھ دیواروں اور خندق کی دیکھ بھال کا ذمہ دار ٹھہرا۔جس میں افراختی پُل بھی تھے۔آخری پُل 1935ء میں ڈھا دیا گیا۔جب 1849ء میں انگریزوں نے عنانِ حکومت سنبھالی تو انہوں نے لاہور شہر کی دیواروں کے مستقبل کے بارے میں بھی غور وخوض شروع کر دیا۔1857ء کے واقعات کے بعد انہوں نے ایک نئی حکمتِ عملی وضع کی اور 1859ء سے لے کر 1864ء تک کے عرصے کے دوران انہوں نے تمام بیرونی دیواریں مکمل طور پر مسمار کر دیں اور اندرونی دیواروں کی اونچائی آدھی کر دی۔ خندق کو گارے سے بھر دیا گیا اور اس پر سرکلر باغ تعمیر کرا دیا۔جنوبی دیوار کو جان بوجھ کر اور قلعہ لاہور کی بھی جنوبی دیوار مسمار کر دی گئی۔ٹکسالی کے مغربی دروازے کو بھی، جو پورے برصغیر میں خوبصورت ترین دروازہ تھا، مکمل طور پر مسمار کر دیا گیا۔''روشن خیالوں'' کی بربریت نے لاہور کے باسیوں کو حیرت میں ڈال دیا۔لاہور کی نہایت خوشنما دیواریں تباہ و برباد کر دی گئیں۔

1881ء میں اندرونی بوسیدہ دیواریں بھی مسمار کر دی گئیں وران کی اینٹیں میاں میر میں لاہور چھاؤنی کی تعمیر میں استعمال کی جاتی رہیں۔چند چیزیں کبھی نہیں بدلتیں۔یہ کام 1947ء تک جاری رہا۔جب غضبناک فسادات کے دوران لاہور کی قدیم باقی ماندہ حصاری دیواریں بھی تباہ و برباد کر دی گئیں۔آج کل اصلی دیوار کے چند ایک حصے باقی بچے ہیں اور اینٹ چور اب بھی لوٹ کو سمیٹنے میں مصروف ہیں۔اس ملک کے عام لوگوں کا یہی چلن رہا جو ہم آج بھی ملاحظہ کرتے رہتے ہیں۔

ہر بار جب ہم لاہور شہر کی دیواروں کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ ضرور سمجھنا چاہیے کہ اب وہاں دیواروں کا نام ونشان بھی باقی نہیں۔چند گز کے ٹکڑے جو باقی ماندہ ہیں اگر چہ قانونی طور پر ان کو تحفظ حاصل ہے، اس میں لوگوں نے اپنے دروازے بنا لیے ہیں۔ذرا غور کیجئے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ پورے اندرون شہر کو محفوظ علاقہ قرار دیا جائے کب تک ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے انتظار کرتے رہیں کہ ایک اور روشن خیال اکبرِ اعظم یا اعتدال پسند رنجیت سنگھ ہماری مدد کو آئے۔

●○●○●○●

ریل کی ایک مقدس پٹڑی کے ساتھ ساتھ پیدل چلتے ہوئے

پچھلے ہفتے میں ''زون'' میں تھا جیسا کہ کسرتی کھلاڑی، ذہن اور جسم کی مکمل یکجائی کی خاص کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا کرتے ہیں۔ شیر پاؤ پُل کے نزدیک اپنی گاڑی کھڑی کرنے کے بعد میں نے لاہور ریلوے اسٹیشن سے والٹن ریلوے اسٹیشن تک ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ پیدل چلنے کا فیصلہ کیا۔ یہ وہ مقدس ریل کی پٹڑی ہے جہاں 1947ء میں سینکڑوں متوقع پاکستانیوں کی لاشیں وصول ہوئی تھیں۔

میں ''کمتر شدت کے تنازع'' کو ادارتی صورت دینے کے سلسلے میں ایک مضمون پڑھ رہا تھا جو ہندوستان اور پاکستان کی نوکر شاہی باہمی خاموش مفاہمت کے ذریعے پروان چڑھاتے ہیں۔ یہ انہیں خوشحال بنا دیتی ہے اور عوام کو غریب تر، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ ڈاکٹر مبشر حسن نے ''غیر اعلانیہ'' کا اعلان کر کے ایک عظیم خدمت سرانجام دی ہے۔ میں نے جتنی بھی کتابیں پڑھی ہیں سب میں خاموشی کو گناہ بتایا گیا ہے۔ اتنے شاندار افراد کی جماعت کیسے ایک دوسرے سے نفرت کر سکتی ہے؟ ان خیالات میں مگن میں پیدل چل رہا تھا اس بات پر حیران ہوتا ہوا کہ ان ریل کی پٹڑیوں اور برصغیر میں پھیلے ہوئے سینکڑوں ریلوے اسٹیشنوں کی تعمیر اور ریل گاڑیاں اور ان کے انجن اور ان لوگوں کو جنہوں نے انہیں بنایا، کس قدر محنت کرنا پڑی ہوگی۔

برصغیر میں ریلوے نظام کی آمد 1850ء میں ہوگئی تھی، لاہور پر قبضہ کرنے کے ایک برس بعد ہی۔ اور کلکتہ سے افغان سرحد تک پورا علاقہ برطانوی عملداری میں تھا۔ یاد رکھیں اس وقت تک بیشتر یورپی شہروں میں ریل کی پٹڑی نہیں بچھائی گئی تھی۔ چنانچہ ہر لحاظ سے یہ ایک انقلابی قدم تھا۔ 1899ء کے سال تک مدراس کے جنوب سے لے کر افغان سرحد تک 23 ہزار میل سے زائد ریل کی پٹڑیاں بچھائی جا چکی تھیں۔ دنیا بھر میں کسی بھی نوآبادیاتی حکومت کی جانب سے کسی بھی کالونی میں اپنے ذمے لیا گیا عظیم ترین اور مہنگا ترین تعمیراتی منصوبہ تھا۔

پوری انیسویں صدی میں یہ برطانوی دولت کی مفرد سرمایہ کاری بھی تھی۔

1863ء تک تیس لاکھ ٹن وزنی ریل کی پٹڑیاں، سلیپر اور انجن برطانیہ سے ہندوستان بذریعہ بحری جہاز روانہ کی جا چکی تھیں۔ تقریباً 70 بحری جہاز فی سال کے حساب سے 50 برسوں تک مسلسل سامان آتا رہا۔ برصغیر کے ریلوے نظام کے ساتھ ان کی اس قدر وابستگی تھی۔ انجینئر حضرات نے دنیا کے عمودی ترین پہاڑوں کے اوپر قوس بناتی ہوئی پٹڑیاں بنائیں۔ گرم تپتے ہوئے ردّو بدل کرتے صحراؤں میں سینکڑوں فٹ گہری بنیادیں غرق کیں۔ گنگا اور سندھ جیسے پاٹ دار اور بپھرے ہوئے دریاؤں پر پُل تعمیر کیے۔ ایسی وابستگی دنیا نے کاہے کو دیکھی تھی اور غالباً دوبارہ کبھی نہ دیکھ پائے گی۔ لیکن اس موضوع پر آج تک سب سے کم تحقیق ہوئی ہے کیونکہ برطانیہ اور دنیا بھر کی طرح ہمارے ہاں ریل کے سفر کے شوقین ہیں ہی نہیں۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے ہم اس کی قدر نہیں کرتے۔ بہرحال ہم اپنے رجحان کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مسلسل کمتر شدت کے تنازعوں میں، مسلسل ہیجانی کیفیت میں۔

ریلوے نظام معاشی اور معاشرتی انقلاب بھی لایا۔ جب سفر کا وقت کم ہو گیا تو ماحصل حرکت پذیری نے معاشی ترقی میں اضافہ کر دیا جو ایسی حرکت پذیری کیا کرتی ہے۔ حرکت پذیری اپنے ساتھ یہ احساس بھی لائی کہ برصغیر ایک متحدہ جم غفیر ہے۔ ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ ایک صدی بعد اسی ریلوے نظام نے برصغیر کی ناقابلِ تلافی تقسیم کو ممکن بنایا۔ ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں انسانی تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت اور نقل مکانی عمل میں آئی۔ ایک کروڑ بیس لاکھ سے زائد نفوس نے اپنے گھروں اور ملکوں دونوں ہی کا باہمی تبادلہ کیا۔ ایک کروڑ بیس لاکھ افراد نے اپنے آباؤ اجداد کے ملک سے اپنے آپ کو زبردستی جدا کر لیا۔

ہزاروں برس کے مضبوط بندھن کو توڑنے، جو ہمارے جنین کا بھی حصہ بن چکا تھا، کا عمل اب بھی تازہ زخم کی طرح ہے۔ ریلوے نظام نے ان نقل مکانی کرنے والوں کے معتد بہ حصے کو آمد و رفت کا بندوبست فراہم کیا اور اس عمل میں محض سوا یام کے عرصے میں دس لاکھ سے زائد افراد اپنی عزتیں اور جانیں گنوا بیٹھے۔ اس سے قبل، اور امیدِ واثق ہے کہ آئندہ کبھی بھی نہیں، نوعِ انسانی نے ایسا ذبیح پہلے نہیں دیکھا تھا اور لاہور چھاؤنی اور والٹن کے ریلوے اسٹیشنوں کے درمیان بچھی ریل کی پٹڑی اس ذبیح کی جیتی جاگتی شہادت ہے جس کے بارے میں بات کرتے ہوئے آج بھی لوگ خائف ہو جاتے ہیں۔ اتنا زیادہ اثر رہا ہے۔ نفرت میں اتنی شدت ہوتی ہے۔ اس پٹڑی پر چلتے ہوئے اسی طرح کے خیال آتے ہیں۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ ''کیا ریلوے نظام کے بغیر تقسیم ممکن تھی؟'' بہت سے محققّین کے خیال میں تقسیم ممکن نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ لاکھوں کو لمبے فاصلوں سے ایک تھوڑے سے وقت میں منتقل کرنا تھا۔ میرے نقطۂ نظر کے مطابق تقسیم ہو سکتی تھی، البتہ ذبیح بڑے پیمانے پر ہوتا۔ ریلوے کے نظام کے تحت ہی بدترین تشدد ہوا

تھا۔ لاہور اسٹیشن اس طوفانی جھکڑ کا نسبتاً پرسکون مرکز تھا۔ دونوں قوموں کے مابین سرحدوں کے حتمی نقشہ جاری ہونے تک لاہور کی قسمت غیر یقینی رہی تھی۔

لاہور پاکستان کو مل گیا۔ محض پندرہ میل بھارتی سرحد سے دُور، شہر اور اس کے لوگ فوری طور پر دو حصوں میں بٹ گئے۔ سینکڑوں ہندو اور سکھ لاہور ریلوے اسٹیشن تک پہنچنے میں لڑنے بھڑنے لگ گئے تا کہ وہاں سے وہ بھارت فرار ہو سکیں۔ اس دوران جنوب سے ہزاروں مسلمانوں کے لیے ان کے نئے وطن میں ٹرین پر ٹرین پہنچنے لگی۔ لاہور ریلوے اسٹیشن ایک میدانِ جنگ کی صورت اختیار کر گیا۔ یہیں بدترین ذبیح ہوا۔

آزادی کی رات لاہور میں آخری انگریز اہلکار اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ انہیں آتش زدہ گلیوں میں سے اپنی راہ نکالنا پڑی۔ ان میں سے بہت سی گلیاں فسادات کی لاشوں سے اٹی پڑی تھیں۔ پلیٹ فارموں پر انہوں نے دیکھا کہ ریلوے کے ملازمین سنگدلی سے خون کے جوہڑوں کو پانی کی دھار سے صاف کر رہے تھے اور لاشوں کے ڈھیر کو سامان لے جانے والے ٹھیلوں میں ڈال کر اجتماعی قبروں میں دفنانے کے لیے لے کر جا رہے تھے۔ چند لمحے پیشتر ہی مایوس ہندوؤں کے ایک آخری گروہ کا، جو خاموشی سے بیٹھے بمبئے ایکسپریس کا انتظار کر رہے تھے کہ بلوائیوں کے ایک جتھے نے قتلِ عام کر دیا تھا۔

مرحوم خواجہ بلال اگست 1947ء میں لاہور کے اسٹیشن ماسٹر کی ناقابلِ رشک نوکری کر رہے تھے۔ ان کا یہ بیان اخباروں میں چھپا تھا کہ ''میں 14/اگست کو ڈیوٹی پر تھا۔ ہم نے ایک اعلان سنا کہ تقسیم ہو گئی ہے۔ اس کے فوراً بعد قتل و غارت شروع ہو گیا۔ ذبیح شروع ہو گیا۔ برطانوی سپاہیوں کی موجودگی کے باوجود، سینکڑوں افراد کو پلیٹ فارموں پر، پُلوں پر، ٹکٹ گھر ہال کمروں میں قتل کیا جا رہا تھا۔ چاقو زنی، عصمت دری اور آگ لگانے کے واقعات ہو رہے تھے جنہیں روکنا ممکن نہ تھا۔

رات کو میں سو نہ سکا کیونکہ پلیٹ فارموں سے چیخوں، کراہنے اور رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہر صبح سینکڑوں مذبح لاشیں ہر جگہ پڑی ملتی تھیں۔ ایک صبح، میرا خیال ہے کہ وہ 13/اگست کا دن تھا، بمبئے ایکسپریس دہلی سے براستہ بٹھنڈہ لاہور پہنچی۔ ٹرین میں تقریباً دو ہزار افراد تھے۔ ہم نے بیت الخلاؤں میں، نشستوں پر، نشستوں کے نیچے لاشیں ہی لاشیں دیکھیں۔ ہم نے پوری ٹرین چھان ماری لیکن ایک بھی زندہ شخص نہ ملا سوائے ایک شخص کے جو انجن کے پانی کے ٹینک میں چھپا ہوا تھا۔ ہم روزانہ ایک سو ٹرینیں وصول کرتے تھے اور ہر ٹرین میں لاشیں ملتی تھیں۔''

جب لارڈ جان لارنس نے فروری 1859ء کو لاہور ریلوے اسٹیشن کی مستقبل کی عمارت تعمیر کرنے کی جگہ پر زمین کھود کر سنگِ بنیاد رکھا تو جو نُقری بیلچہ اس نے استعمال کیا تھا اس پر لاطینی زبان میں موٹو لکھا تھا ''ٹام بیلو کوام پاس'' یعنی جنگ سے امن بہتر ہے۔ اس کو کیا خبر تھی کہ بعد میں کیا حالات پیش آنے والے ہیں۔

●○●○●○●

لاہور کے برف گڑھے

نام کسی قوم کی تاریخ کے بارے میں بہت کچھ بتا دیتے ہیں۔ان کی پیداوار کے طریقے اور خود ملک کے بارے میں۔اندرونِ شہر اور اس کے نواحی علاقوں کے نام بڑے پُرکشش ہیں اور ہر ایک کی اپنی الگ کہانی ہے۔ ناموں سے پیشوں اور کھیل تماشوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ایک ایسے ہی نام نے، جو میں نے اپنے چھوٹے بھائی سے سنا تھا، مجھے تجسس میں مبتلا رکھا۔میرا بھائی بھاٹی دروازے کے بیرون واقع سنٹرل ٹریننگ کالج کی گراؤنڈ میں جاگنے کے اوقات میں فٹ بال کھیلتا رہتا تھا۔

ستر کی دہائی میں ہم ریٹی گن روڈ کے علاقے میں رہائش پذیر تھے۔جو ایک زمانے میں اندرون شہر سے بیرون ایک اعلیٰ درجے کا علاقہ گردانا جاتا تھا۔سنٹرل ماڈل سکول کے عین پیچھے جہاں آج کل سنٹرل ٹریننگ کالج واقع ہے وہاں ایک زمانے میں سر ولیئم ریٹی گن کی رہائش ہوا کرتی تھی اور یہ بہت سے لوگوں کے لیے باعثِ حیرت ہوگا کہ وہ اور اس کے اہلِ خانہ قدیم انگریزوں کی طرح قدیم طرز کے بنگلے میں رہائش پذیر تھے۔ جس کی چھت خالص چھپریلی تھی۔ایک تحریر میں اس گھر کو علامتی سفوک چھپریلی جھونپڑی کے مثل قرار دیا گیا ہے۔اس گھر کی نام تختی پر لکھا تھا ''روز لینڈز'' اور یہ ہر لحاظ سے نہایت دبدبے والی رہائش گاہ تھی۔لاہور کے مکین اس علاقے کو ''ریٹی گن صاحب کی کوٹھی'' کہا کرتے تھے۔ایک اور تحریر میں اسے ''ریٹی گن صاحب کی بھوت والی کوٹھی'' کہا گیا ہے۔بعد ازاں انگریزوں نے اسے باضابطہ طور پر ''ریٹی گن روڈ'' کا نام دے دیا۔یہی وہ گھر ہے جہاں انگریزوں نے پہلی پنجابی رجمنٹ ''فرسٹ پنجاب ولینٹیرز'' تشکیل دی تھی۔اس رجمنٹ نے 1857ء کی بغاوت میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔

وہ لوگ جو ریٹی گن روڈ سے واقف نہیں ہیں، اتنا بتا دینا کافی ہے کہ صرف چالیس برس قبل تک یہاں پارسیوں کی عبادت گاہ تھی۔سیّد بابر علی اور جھنگ کے سیّدوں کے خاندان کا گھر، خواجہ خاندان اور عباسی ڈاکٹروں کے خاندان کا مکان، چھ ایکڑ پر پھیلا کرنل عطاء کا گھر، شیخوں اور دیگر ذی اقتدار حضرات کے گھر وقوع پذیر تھے۔

تقریباً سو سال قبل بلاشبہ اس علاقے کی لاہور میں سب سے زیادہ مانگ تھی۔ لیکن ریٹی گن کی لاہور آمد اور یہاں چھپڑ یلے مکان کی تعمیر کرنے سے قبل اس علاقے کو لاہور کے باسی ''پرانا برف خانہ'' کہتے تھے۔ میرے بھائی نے مجھے بتایا کہ بزرگ لوگ اب بھی اسے ''برف میدان'' ہی کہتے ہیں۔

مغلیہ اور پھر سکھوں کے زمانے میں یہ کھلا علاقہ ''برف میدان'' کہلاتا تھا۔ جب 1849ء میں انگریز آ گئے تو انہوں نے پہلی بار اس علاقے کی باضابطہ نشاندہی کرتے ہوئے نقشوں میں اسے ''آئس پٹس'' یعنی ''برف کے گڑھے'' سے موسوم کیا۔ ان گڑھوں میں فی الحقیقت زمانہ قبل از تاریخ کے انداز میں، سردیوں میں برف جمائی جاتی تھی اور پھر اسے زیرزمین ذخیرہ اندوز کر دیا جاتا تھا۔ گرمیوں میں علی الصبح اس کی فروخت کی جاتی تھی۔ اس کارروائی کے بارے میں ایک تحریر میں یوں درج ہے کہ ''یہ وسیع میدان چھوٹے چھوٹے پلاٹوں یا ''کیاریوں'' میں منقسم تھا جس پر چاولوں کے چھلکوں کی تہہ بچھائی گئی تھی۔ ان چھلکوں پر پختہ مٹی کے بہت سے اُتھلے تسلے ترتیب سے رکھے جاتے تھے۔ یہ سب پانی سے بھرے ہوتے تھے۔ گڑھوں کے کنارے چھلکوں کی دبیز تہوں سے آراستہ ہوتے تھے اور اس کے گرد نرم آنچ پر ریختہ اینٹوں کی دیواریں استادہ تھیں۔ اس دیوار پر بہت موٹی بھوسے کی چھت تھی، جسے ''چھپر'' کہا جاتا ہے۔

گڑھوں کی دیواروں اور کناروں کے درمیان پتلی راہداریاں تھیں جن کے ذریعے برف کی ریڑھیاں، ٹھیلے والے روز کا مال اٹھا کر مختلف مقامات پر برف کی فروخت کیا کرتے تھے۔ ہر گڑھے کی تہہ میں آدمی دھموسوں اور چھپکوں سے لیس ہوتے تھے جو برف کی تہہ ہموار کرتے رہتے تھے اور اس کو مستحکم رکھتے تھے۔ ان گڑھوں کے روزنوں کو برف کی مطلوبہ مقدار حاصل کرنے کے بعد ہمیشہ نہایت احتیاط سے دیوار بند کر دیا جاتا تھا۔

ان برف کے گڑھوں کو افرادی قوت مہیا کرنے اور دیکھ بھال کرنے والے بہت سے غریب خاندانوں نے داتا صاحب کے مزار کے عین مشرق میں ایک کچی آبادی قائم کی ہوئی تھی۔ ان گھروں میں اب پٹھان رہتے ہیں جو اَب لاہور میں آباد ہو چکے ہیں۔ اس سے تھوڑے سے فاصلے پر ''خواجہ سراؤں'' کی مشہور کالونی ہے جو اپنے آپ کو قبیلہ کہتے ہیں۔ موہنی روڈ اور ریٹی گن روڈ کے رہائشیوں نے ہمیشہ اس جگہ کو ''غیر جانبدار منطقہ'' کہا ہے۔ اس کالونی میں لاہور کے خواجہ سراؤں کے ''چنیدہ'' بادشاہ کی رہائش ہے، لیکن یہ دوسری کہانی ہے۔

برف کے گڑھوں والے خاندانوں میں سے ہر ایک کو بہت سے گڑھے تفویض کر دیئے جاتے تھے۔ ان کے فرائض میں شامل تھا کہ وہ ان اُتھلے مٹی کے برتنوں کو اُبلے ہوئے صاف پانی سے بھریں، جمی ہوئی برف کو اکٹھا کر کے گڑھوں تک لے جائیں، جو زمین میں کھودے ہوئے ہوتے تھے۔ پھر ہر خاندان کو، گرمیوں کے موسم کی آمد سے پیشتر، ایک مقررہ حد تک برف جمع کرنا ہوتی تھی تاکہ وہ پورے موسمِ گرما کے لیے کفایت کرے۔ اس

طرح ریٹی گن روڈ کے ''برف میدان'' سے لاہور کے مکینوں کو برف مہیا کی جاتی تھی۔

انگریزوں نے بھی جیل روڈ پر واقع نئی تعمیر شدہ سینٹرل جیل میں ایک اور برف کے گڑھوں والا مرکز بنا لیا تھا۔ پورا شاہ جمال اور شادمان کا علاقہ پرانی سینٹرل جیل پر مشتمل تھا۔ یہاں گڑھوں کی نئی سیریز بنائی گئی جہاں سے لاہور چھاؤنی اور انگریزی فوج کو موسمِ گرما کے دوران برف مہیا کی جاتی تھی۔ چونکہ اس علاقے کا پانی ریٹی گن روڈ سے برتر معیار کا سمجھا جاتا تھا، اس لیے ''جیل والی برف''، ''ریٹی گن والی برف'' سے تھوڑی مہنگی فروخت ہوتی تھی۔ اس زمانے میں جب لاہور میں پے در پے ہیضے کے وبائی مرض کی یلغار ہوتی رہی تو یورپی آبادی صرف ''جیل والی برف'' کا استعمال کرتی تھی۔ جب یہ وبائی مرض زوروں پر تھے تو یورپ والوں کے لیے اس برف کے خصوصی پرمٹ جاری کیے جاتے تھے۔

عملاً ہر لحاظ سے ماقبل تاریخ کی برف کے گڑھوں والی ٹیکنالوجی اس وقت ختم ہوگئی جب 1879ء میں ریٹی گن روڈ پر بجلی سے چلنے والا برف کا کارخانہ لگ گیا۔ پہلی بار سارا سال برف بہت زیادہ تعداد میں دستیاب ہونے لگی۔ اس سے عام لوگوں کو گرمیوں میں قلفیاں کھانے کا مزا بھی حاصل ہوگیا۔ اس سے پیشتر صرف امیر لوگ ہی اس لطف سے حَظ اٹھاتے تھے۔ باوجویکہ لاہور کے برف کے گڑھے اٹھارویں صدی کے اواخر تک ختم ہوگئے تھے، لیکن آج بھی چند بزرگ لوگ اس خطۂ زمین کو جہاں یہ گڑھے ہوا کرتے تھے ''برف کے میدان'' کہتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ چند برس کے بعد یہ نام بھی ختم ہو جائے گا۔ آج کل اس جگہ تیراکی کا تالاب اور چند برگد کے بہت ہی قدیمی درخت ہیں۔ اپنی جوانی میں ہم نے بہت سی شامیں یہاں شاعری پر بحث کرتے گذاریں تھیں۔ بے شمار نا قابلِ بیان تفریحی مشاغل کا تو ذکر ہی نہ کریں۔

●○●○●○●

جی پی اَو کا پرانا گھنٹا

اگر آپ لاہور کے جنرل پوسٹ آفس (جی پی او) میں صدر دروازے سے داخل ہوں تو جو راستہ لکڑی کے ایک بہت بڑے زینے کی طرف جاتا ہے اس کی ڈیوڑھی میں آپ کو پیتل کا ایک بہت بڑا گھنٹا پڑا دکھائی دے گا۔ جس پر 1860ء کی تاریخ کندہ ہے۔ اس تاریخی گھنٹی کو بطور اطلاعی گھنٹا اس وقت بجایا جاتا تھا جب غیر ملکی ڈاک لے کر سرکاری بیل گاڑی لاہور پہنچتی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں لاہور میں، جو اُن دِنوں پرانی انارکلی میں بستا تھا، جان پڑ جاتی تھی اور اس روز ہر کوئی یہی سوال کرتا، ''کیا آپ کے نام کوئی شے وصول ہوئی ہے؟''

یہ گھنٹا ہفتے میں دو بار بجتا تھا۔ ایک بار اس وقت جب ڈاک پہنچتی اور دوسری بار لاہور سے ''غیر ملکی'' ڈاک روانہ ہونے سے ایک گھنٹہ قبل۔ دوسری صورت میں لوگ اپنے خطوط کی ترسیل کے لیے دوڑ لگا دیتے۔ لاہور اور اس کے ڈاکخانے کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزوں نے تقریباً دو سو برس کے انتشار کے بعد اس کا سائنسی طریق سے بندوبست کیا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کہانی کو کبھی بیان نہیں کیا گیا اور نہ ہی محکمہ ڈاک نے اسے سنانے کی زحمت کی ہے۔ اس خدمت کا پہلا ذکر معلوم دنیا میں دو ہزار قبلِ مسیح مصریوں کے مابین ڈاک کے نظام کے حوالوں میں ملتا ہے۔

چین میں ڈاک کا نظام چُو خاندان (255-111 قبل مسیح) کے دور میں رائج تھا۔ چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں کنفیوشس کا حوالہ ملتا ہے کہ یہ محکمہ پہلے ہی سے اپنی کارکردگی میں مشہور تھا۔ ''نیکی کا اثر محکمہ ڈاک کے ذریعے شاہی فرمان کی ترسیل سے تیز تر ہوتا ہے۔''

1505ء میں یورپ میں ڈاک اور اخبار کی ترسیل کے لیے بیس ہزار ملازمین پر مشتمل ''تھرن اینڈ ٹیکسی پوسٹل سسٹم'' ایک مربوط نظام نجی ملکیت میں کام کر رہا تھا۔ چنانچہ محکمہ ڈاک کوئی نیا تصور نہیں ہے۔ راجہ جے پال کے دور میں لاہور میں بھی ایک ایسے ہی نظام کے حوالے ملتے ہیں جب ابھی محمود غزنوی شہر پر حملہ آور نہیں ہوا تھا۔ اس کے حملے اور مابعد حملوں نے ڈاک کے نظام کی تقسیم کو کئی برسوں تک انتشار کا شکار بنائے رکھا۔

برصغیر میں 1296ء میں علاء الدین خلجی کے عہدِ حکومت میں پیغامات کی ترسیل کا نظام رائج تھا۔ لیکن جدید محکمہ ڈاک، جس سے ہم آج کل روشناس ہیں، کے قیام کی داد شیر شاہ سوری کو ملنی چاہیے۔ جس نے اپنے محض پانچ سالہ مختصر دورِ حکومت کے دوران محکمہ ڈاک کے استعمال کے لیے بنگال سے لے کر پشاور تک دو ہزار میل لمبی سڑک تعمیر کرائی اور پوری دنیا میں یہیں فی الحقیقت مشہورِ زمانہ ''پونی ایکسپریس'' کی تشکیل ہوئی، جس کی بعد ازاں دنیا بھر میں نقل کی گئی۔ اس نے سترہ سو سرائیں اور ڈاک گھوڑا چوکیاں تعمیر کرائیں جہاں گھوڑوں کو تبدیل کیا جاتا تھا۔ وہ 22 رمئی 1545ء کو انتقال کر گیا۔

بعد میں آنے والے ہندوستان کے حکمران اس کے نظامِ ڈاک کو مزید بہتر بناتے رہے۔ ان سراؤں میں سے تقریباً 492 موجودہ پاکستان کے علاقوں میں وجود پذیر تھیں۔ لاہور میں صرف ایک سرائے تھی جو شالامار باغ کے مشرق میں واقع تھی۔ یہ مہنہ سنگھ کی سرائے کہلاتی تھی۔ حتیٰ کہ اس زمانے کے گھوڑوں کی ناندیں بھی قائم ہیں جنہیں اب بھینسیں استعمال کرتی ہیں۔ میں نے پاکستانی پنجاب کی دیگر تقریباً تین سو سراؤں کی تلاش نہیں کی، لیکن محکمہ ڈاک تو اس موضوع پر تحقیق کر سکتا ہے، اگر وہ ایسا کرنا چاہے تو۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے راج میں محکمہ ڈاک کو بحال کیا گیا اور قلعہ لاہور میں جہاں مہاراجہ رہائش پذیر تھا، ڈاک کی چھانٹی کا دفتر بنایا گیا تھا۔ ہر خط کو کھول کر پڑھا جاتا تھا تاکہ ہر قسم کی اطلاع کا پتہ چل سکے۔ اس کے بعد ہرکاروں کے ذریعے جن کے دفاتر اندرون شہر کے بارہ دروازوں پر قائم تھے، ڈاک کی تقسیم کی جاتی تھی۔ شہر میں لوگوں نے کہنا شروع کر دیا ''لِکھن دی بُھل نہ کرنا'' (لکھنے کی بھول نہ کریں۔) یہ عقلمندی انگریزوں کے دورِ حکومت تک جاری رہی۔

آج بھی پنجاب پولیس کی ''سپیشل برانچ'' کا ایک دفتر قلعہ میں کام کر رہا ہے۔ ابلاغِ عامہ ریاست کے لیے ہمیشہ خدشے کا باعث رہا ہے۔ جبکہ معاشرے کے لیے یہ نعمت ہوتا ہے۔ چنانچہ محکمہ ڈاک پولیس کا پیشہ وارانہ فریضہ بن کر رہ گیا تھا۔ انگریزوں کے دور میں یہ دوسرے ہاتھوں میں چلا گیا، لیکن ایک خوش تدبیر انداز میں اور آج یہ ایک آزاد محکمہ ہے، جس میں نجی حیثیت کو قانونی تحفظ حاصل ہے یا ہم یونہی خیال کرتے ہیں۔

سب سے پہلی ''ڈاک کے محصول پیشگی ادا شدہ کاغذ کی ٹکٹیں سندھ ڈاکز''، 1852ء میں لاہور میں دیکھنے کو ملیں جو کمشنر سندھ بارٹل فریئر نے جاری کی تھیں۔ ان ٹکٹوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا چھپا ہوا نشان تھا۔ لیکن لاہور میں انگریزوں نے جو اوّلیں ٹکٹیں استعمال کیں وہ سادہ ''سرخ لاکھ کی مہریں'' تھیں، ان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا ٹھپہ لگایا جاتا تھا۔

1849ء کی ایسی ایک مہر برطانوی عجائب گھر میں موجود ہے اسی وجہ سے اسے ''سٹیمپ'' (بمعنی ٹھپہ لگانا) کہا جاتا تھا۔ خطوط ڈاک خانے لے جائے جاتے تھے، جہاں ادائیگی کے بعد انہیں سرخ لاکھ سے سربمہر کر کے ٹھپہ لگا دیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ ٹھپہ لگ جاتا تو سمجھا جاتا کہ خط کی ترسیل ہو گئی۔ اگرچہ بعد میں ''سٹیمپ''

اور ''پوسٹ'' کے الفاظ مختلف معنوں میں استعمال ہونے کے بعد بالآخر بطور اسم استعمال کیے جانے لگے۔

محکمہ ڈاک لاہور کے بارے میں ایچ آر گولڈنگ کی ایک تحریر کے مطابق ''جس جگہ اب پبلک ورکس کے محکمے کی عمارت ہے، وہاں 1849ء میں فوجی بیرک جیسی ایک عمارت استادہ تھی، جسے بطور جنرل پوسٹ آفس (جی پی او) استعمال کیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ موجودہ خوبصورت عمارت مکمل ہوگئی۔'' قارئین کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ یہ اصلی ڈاکخانہ پرانی انارکلی بازار میں ٹولنٹن مارکیٹ کے عقب میں تھا، جو آج کل فوڈ سٹریٹ نمبر 2 کہلاتی ہے۔

ایک اور جگہ وہ لکھتا ہے کہ ''1876ء میں جنرل پوسٹ آفس لاہور میں بنڈل موصول ہوتے تھے جن کی سرکاری بیل گاڑیوں کی قطار میں فیروز پور، بہاولپور، راولپنڈی اور پشاور سمیت چوبیس شہروں کو ترسیل کی جاتی تھی۔'' یہ واضح رہے کہ لاہور پورے پنجاب اور اس سے بیرون ڈاک کی صدر شاہراہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

1916ء کے پنجاب گزیٹر میں لاہور میں ڈاک کے بہترین نظام کا ذکر ہے، جس کے مطابق ملکہ وکٹوریہ کے طغرے والے 132 لیٹر بکس نصب تھے، جو موجودہ دور میں نادر نمونے جمع کرنے والوں کے لیے بیش قیمت شے ہیں۔ قارئین کرام کے لیے یہ باعثِ دلچسپی ہوگا کہ اصلی لیٹر بکسوں میں سے ایک درجن کے قریب آج بھی زیرِ استعمال ہیں اور جیسا ایف ایس اعجاز الدین نے اپنی کتاب ''لاہور کی یادیں'' میں ذکر کیا ہے ان میں سے ایک نادر لیٹر بکس آج بھی انارکلی میں زیرِ استعمال ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ میں مغلپورہ کے پرانے ریلوے کوارٹروں میں بھی ایسے تین عدد مزید لیٹر بکس تلاش کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوں۔

جب انگریزوں نے اچھی طرح قدم جما لیے اور اپنی چھاؤنی موجودہ میاں میر کے علاقے میں منتقل کر لی تو معمولات میں تھوڑا سا ردّو بدل کیا گیا۔ 1916ء کے پنجاب گزیٹر (صفحہ 169) میں لکھا ہے۔ ''ریلوے اسٹیشن سے ڈاک گھوڑے جُتے چھکڑوں کے ذریعے لائی اور لے جائی جاتی ہے۔ جی پی او پر دو جھنڈے لہرائے جاتے ہیں۔ ایک سرخ رنگ کا، جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ بیرون ملک ڈاک کی ترسیل کا اشارہ بمبئی سے موصول ہو چکا ہے اور ڈاک لاہور پہنچنے والی ہے۔ دوسرا نشانی ڈاک کا جھنڈا (سفید رنگ) جو لاہور سے غیر ملکی ڈاک کی روانگی کا دن ظاہر کرتا ہے۔''

جب ڈاک موصول ہو جاتی تو معمول کے مطابق روایتی گھنٹہ بجایا جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ محض رسمی گھنٹہ بن کر رہ گیا تھا۔ 1950ء کے کسی وقت جب ریلوے کا نظام مستحکم ہو چکا تھا اور روزانہ دو سے تین بار ڈاک کی ترسیل ہونے لگی تو یہ گھنٹہ خاموش ہو گیا۔ آج لاہور شہر کے شور شرابے میں یہ گھنٹہ چپ ہے۔ اس روایت کی تصدیق میں جو غالباً اتنی ہی پرانی ہے جتنا ہمارا شہر!

●○●○●○●

شالامار باغ کا حیرت انگیز نظامِ آب قوائی

بہت سے لوگوں کے نزدیک مغل شہنشاہ شاہ جہاں کی فقط یہ خواہش تھی کہ بروئے زمین ''جنت کا ایک عالی شان تخیل'' ہو۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی دلہن ممتاز محل کو آگرہ کے پُرشکوہ تاج محل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یادرکھا جائے۔ لیکن 42-1641ء کے زمانے میں لاہور میں شالامار باغ کی تعمیر ایک تخیل سے کہیں بڑھ کر تھی، کیونکہ یہ انجینئری کا ایسا شاندار کارہائے نمایاں تھا جس پر عمل پیرائی کافی زمانہ بھی چند لوگ صرف تصور ہی کر سکتے ہیں۔

شالامار باغ کی محض منصوبہ بندی کرنے پر ہی شہنشاہ نے کئی برس صرف کر دیئے، تب ہی کہیں اس نے تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا اور جب منصوبے کے عین وسط میں اسے احساس ہوا کہ انجینئری کی غیر متوقع رکاوٹیں اس کے منصوبے کو مسخ کر ڈالیں گی تو اس نے پریشان کن مسائل پر قابو پانے کے لیے تازہ ذہنوں اور مزید دولت کی فراہمی کر دی۔ باغ کی تعمیر کی روداد اور زیادہ اہم اس کی انجینئری کے مؤثر جزیات کے بارے میں ہمیں زیادہ جاننے کی ضرورت ہے۔ لاہور شہر کے شمال مشرق میں واقع اور چالیس ایکڑ پر محیط شالامار باغ کی ساخت میں ''آرام گاہ''، ''خواب گاہ'' اور ''ایوان'' شامل ہیں اور یہی اس مشہور باغ کے تین تختے ہیں۔ پھر اس کی بہت سی ڈیوڑھیاں، سہ دریاں، راؤٹیاں اور باؤلیاں ہیں، جو سلسلہ وار ہیں۔ پھر ایک جانب ''نقار خانہ'' اور چہار باغ (جنت کا باغ) ہیں۔

شالامار باغ کی اصل کہانی تو اس بارے میں ہے کہ اس میں پانی کہاں سے لایا گیا تھا۔ چنوتی یہ تھی کہ قدرتی بہتا ہوا پانی تمام غذائیت سمیت ہو، جو باغ کے تینوں تختوں کے سبزہ زاروں کو سیراب کرے اور ساتھ ہی ساتھ ریت اور گارے سے بالکل مبرّا، جو ٹھیک دباؤ اور مقدار کے مطابق بہہ کر تینوں تختوں کے مجوزہ 410 فواروں کو چلا سکے۔ یاد رکھیے کہ ہم 1640ء کے برس کی بات کر رہے ہیں لہٰذا ہمیں اس دور کے تکنیکی صنعتیاتی حقائق کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔

پانی کھینچنے والے پمپ چلانے کے لیے بجلی ہی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ دستیاب پانی کا استعمال حد درجہ منضبط اور بالعمد ہونا تھا۔ باغ کے لیے ایک عظیم نہر کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس کا نام ''شاہی نہر'' رکھا گیا۔ بہترین پانی ایک سو ساٹھ کلومیٹر دور شمال کی جانب ایک مقام پر دستیاب تھا جسے مادھو پور کہا جاتا تھا۔ جہاں کبھی خوبصورت دریائے راوی پہاڑوں سے نکل کر میدانوں میں داخل ہوتا تھا۔ ایک خصوصی نہر، دریا کے متوازی بہنے والی، ایک ایسی سطح پر کھودی گئی جو ہمیشہ بہتے دریا سے بلند اور بائیں طرف تھی۔ راستے میں تقطیرہ کے ذخائر بنائے گئے تھے تاکہ پانی میں مشمولہ گارے اور ریت کے عناصر کو ختم کیا جا سکے۔ اپنا ایک سو ساٹھ کلومیٹر کا راستہ طے کر لینے کے بعد پانی کی سطح شالامار باغ کے سب سے بالا تختے سے آٹھ میٹر بلند ہونا تھی۔

نہر کو علی مردان خان نے ڈیزائن کیا تھا اور 1640ء میں اس پر ڈیڑھ لاکھ روپے لاگت آئی تھی۔ یہ منصوبہ اپنی نظیر آپ تھا۔ پانی شالامار کے متوقع بلند دقت طلب معیار تک نہ پہنچ پایا۔ شاہی نہر کے پورے منصوبے پر ازسرِنو غور و خوض کے لیے جواں سال مُلّا علاء الملک تُونی کے حوالے کیا گیا، جس نے پچاس ہزار کی اضافی لاگت سے نہر کے مسائل طے کر دیئے اور کم سے کم وقت میں اسے مکمل کرا لیا۔ پانی مادھو پور سے لاہور بہنا شروع ہو گیا۔ برطانوی دور میں اسے مادھو پور نہر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ پھر اسے ہنسلی نہر اور بالآخر ''شالامار راجباہ'' کہنے لگے۔ 1960ء میں جب سندھ طاس معاہدہ پر دستخط ہوئے تو جو کبھی شاہی نہر کہلاتی تھی اس میں پانی کا بہاؤ ختم ہو گیا۔

شاہی نہر تہ در تہ باغات سیراب کرتی۔ بالائی تختے کی چھوٹی نہر کو بھرا رکھتی اور درمیانے تختے کے بڑے تالاب کو لبالب بھرا رکھتی تھی۔ لیکن فواروں کے لیے پانی ایک پیچیدہ نظامِ آب قوائی کے ذریعے سے حاصل کیا جاتا تھا جو باغ کے جنوب میں تھا۔ باغ کی دیواروں کے بیرون واقع رہٹ والے کنوؤں سے بھرا جاتا تھا۔ قدرتی پانی کے نتھاری تالابوں کا ایک سلسلہ بنایا گیا تھا۔ کنوؤں سے پانی کھینچ کر ایک تالاب میں جمع کیا جاتا تھا جس کی 19 میٹر لمبائی اور پانچ اشاریہ پانچ میٹر چوڑائی تھی۔ چھت کے قریب اس میں دس سینٹی میٹر قطر کے تین سوراخ تھے، جن میں سے پانی نکل کر دوسرے نتھاری تالاب میں جا گرتا۔ یہاں سے پانی سفر کر کے جوفوں میں چلا جاتا جن میں چار سوراخ عمودی حالت میں ہوتے۔ ہر تالاب کی گہرائی ایک اشاریہ چار میٹر تھی۔

ہر ایک ٹینک ٹھوس اینٹوں کی معماری سے سرخ رسولی پتھر کے بلاکوں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ مغربی جانب پندرہ سینٹی میٹر قطر کا ایک پائپ زیرِ زمین جا کر باغ کے اندر نمودار ہوتا تھا۔ سرخ پختہ مٹی کا یہ سادہ پائپ سارے کا سارا ہاتھ کی سان سے ڈھلا ہوا تھا اور اس کی کالرداری چُون پتھر اور پٹ سن کی بوری سے کی گئی تھی۔ یہ سادہ سی ساخت کئی زمانے اور دباؤ برداشت کر چکی تھی۔ پٹ سن کے دھاگوں کو سفید چُونے کی کریم، جو موم کی طرح لگتی تھی، میں ڈبو کر چھید بند کیے گئے تھے۔ یہ مادہ کیا ہے کسی کو نہیں معلوم، لیکن جو جانتے ہیں وہ یہ کہ یہ چار سو برس

تک چالو نظامِ آب قوائی کے ساتھ قائم اور صحیح سلامت کام کرتا رہا ہے۔

فواروں تک کامل دباؤ کے ساتھ پانی کی بہم رسانی آج کے تصور کو بھی مات دیتی ہے۔ تختِ بالا میں 105 فوارے ہیں۔ درمیانی تختے پر 152 اور تختِ زیریں پر 153 فوارے ہیں۔ ہر فوارہ اس درجہ اکملیت کے ساتھ کام کرتا ہے کہ یہ جس تالاب میں بھی واقع ہو، پانی اس کے کنارے تک لبالب بھرا رہتا ہے لیکن کبھی چھلکتا نہیں۔ بعینہ پہاڑوں سے، جہاں سے مغل بادشاہ آئے تھے، تیز بہتی ہوئی ندی کی طرح جو ہمیشہ بہتی رہتی ہے، لیکن کناروں سے باہر نہیں آتی۔

شالا مار باغ کا اصل حسن ''ساون بھادوں'' آبشار ہے جو درمیانی تختے کے کنارے بہتی ہے۔ تالابوں کے وسیع سلسلے میں بہتے پانی کی اور فواروں کی آواز لاہور کے موسم برسات کی یاد دلا دیتی ہے۔ جب بارش اور اس کی آوازوں سے دن کتنا سہانا ہو جاتا ہے۔ چھٹی والے دن، جب ہم چھوٹے بچے تھے، تو ہمیں وہاں آموں کی ٹوکریاں لے کر جانا یاد ہے۔ باغ کے اپنے آم، جب شالا مار باغ لاہور کی باغبانپورہ کے میاں خاندان کی عملداری میں ہوا کرتا تھا، پورے برصغیر میں مشہور تھے۔ یہ جگہ مکمل سکونِ قلبی کی تصویر پیش کرتی ہے جیسے جنت کا کوئی مقام ہو۔

اِن ''نادیدہ'' پانی کے پائپوں کے بچھانے اور صحیح مقام کا تعین ہمیشہ سے پُراسرار رہا ہے۔ چند برس پہلے نیوکلائی سائنسدانوں کو ایک بڑے شگاف کی تلاش کے لیے تابکاری ٹیکنالوجی کا استعمال کرنا پڑا تھا۔ تب پہلی بار پتہ چلا کہ پائپ کس ڈھب سے بچھائے گئے ہیں۔ ایک جگہ یہ بیس فٹ چٹان جیسی ٹھوس چونے کی عمارت گھچ کے درمیان میں بچھے ہوئے تھے۔ موجودہ دور میں شالا مار باغ کے نظامِ آب قوائی کی انجینئری کا کارہائے نمایاں عموماً نامعلوم ہے۔ یہ انجینئری کا وہ عجوبہ ہے جس کا ہم کھلے دل سے اعتراف کرنا پسند نہیں کرتے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ 1799-1839ء کے دوران، پنجاب میں دورِ حکومت کی باگ ڈور کے درمیانی عرصے میں اور بعد ازاں انگریزوں کے 1849ء سے 1947ء تک پنجاب پر قبضے کے دوران باغ میں چند تغیر و تبدل کیے گئے۔ لیکن 1947ء سے لے کر آج تک کے عرصے کے دوران پورے باغ اور اس کی نادری انجینئری کے کاموں سے تغافل کر کے اور دیگر وجوہات کی بناء پر عظیم ترین نقصان پہنچا ہے۔ بیشتر اصل نباتات تباہ و برباد ہو چکی ہیں اور نظامِ آب قوائی کو بے پایاں نقصان پہنچ چکا ہے اور ''جنت کا مغلیہ خواب'' گم ہو چکا ہے شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

1999ء میں شالا مار باغ اور قلعہ لاہور کو ''عالمی تہذیبی میراث کے مقامات خطرے کی زد میں'' کی فہرست میں شامل کر لیا گیا تھا۔ یہ اس واقعہ کے بعد ہوا جب بھارت اور پاکستان کے مابین امن کے طریقِ عمل کے حقیقی آغاز کے لیے بھارتی وزیراعظم نے ''امن بس'' پر سوار ہو کر لاہور آنا تھا۔ چنانچہ امرتسر تک بہتر سڑک کی

عجلت میں تعمیر کرنے کی کوشش میں نواز شریف کی حکومت نے نظامِ آب قوائی شاختیاتی ڈھانچے کو مسمار کر دیا۔ دنیا نے تو پاکستان میں ''عالمی تہذیبی میراث'' کے ساتھ مقامات کو نشانِ زد کیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے کسی مقام پر بھی نہ تو مرکزی اور نہ ہی صوبائی حکومتوں نے کوئی نمایاں حقیقی کام شروع کرایا ہے۔ یہ موجودہ عہد کا عکاس نما ہے، جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔

وفاقی حکومت کے آثارِ قدیمہ کے محکمے نے شالامار باغ کی ''تحفظی اور بحالی'' کے کاموں کا ذمہ لیا تھا جو 1973-74ء میں شروع ہوا اور 1988-89ء تک جاری رہا۔ آثارِ قدیمہ اور عجائب گھروں کے محکموں کی جانب سے اپریل 1998ء میں شالامار باغ کی تحفظی اور بحالی کا ایک عظیم منصوبہ تیار کیا گیا جو 1998ء سے 2003ء تک کے عرصے پر محیط تھا۔ نیم پختہ اور بغیر سرمایہ کے ان کوششوں سے ابھی تک کوئی قابلِ توجہ پیش رفت سامنے نہیں آئی۔

بالآخر اقوامِ متحدہ کے ادارے یونیسکو نے امریکی گیٹی تحفظی ادارے کے پروگرام کے اشتراک سے یہ فیصلہ کیا کہ ''شالامار باغ'' دنیا بھر کے لیے اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ اسے حکومتِ پاکستان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا اور انہوں نے شالامار باغ کے لیے ایک منصوبہ تیار کر لیا جسے دسمبر 2005ء کے آخر تک مکمل ہو جانا تھا، لیکن جس بات کا اندازہ اقوامِ متحدہ نے نہیں لگایا تھا، وہ تھی پاکستان کی نوکرِ شاہی۔ اگر کسی منصوبے میں ان کا حصہ نہیں ہے تو اس پر عملدرآمد ہی نہیں ہو سکتا۔

●○●○●○●

جادو گھر اور اس کی دائمی پُراسراریت

لاہور کے مکینوں کے لیے کوئی اور جگہ یا عمارت اس قدر پُراسرار نہیں جتنی فری میسنوں کا ہال، جو مقامی لوگوں میں جادو گھر کے نام سے مشہور ہے۔ یہ عمارت ایک طاقتور خفیہ انجمن سے منسوب ہے جس کی نشستوں میں انسانی کھوپڑی کو منبر پر رکھ کر اور اراکین ڈراؤنے لباس پہن کر ہاتھوں میں خنجر لیے ہوئے شرکت کرتے تھے۔

یہ لرزہ خیز وضاحت 1895ء میں ایک مقامی اردو روزنامے کی ایک خبر میں شائع ہوئی تھی، جو ایک بیرے نے، جو پرانی انارکلی کے علاقے کا رہائشی تھا، اپنے ایک بلا تامل بیان میں کی تھی کہ چیئرنگ کراس کے فری میسنوں کے ہال کے صدر دفتر میں کیا ہوا تھا۔ آج کل اس پر لگی نام تختی پر 90 شاہراہ قائداعظم درج ہے۔ اس خبر کی اشاعت کے اگلے روز ہی سے، اخبار نے بعد ازاں الزام لگایا کہ وہ بیرا غائب کر دیا گیا اور پھر دوبارہ کبھی نظر نہیں آیا۔ اس سے لوگوں کی پراسراریت میں مزید اضافہ ہو گیا جو الزام دے رہے تھے کہ یہ ساری کارروائی یہودیوں کی سازش تھی۔ بعض نے الزام لگایا کہ یہ کسی مافوق الفطرت عیسائی خفیہ انجمن کا کام تھا جو درحقیقت حضرت عیسیٰؑ کی حریف تھی۔ لیکن کسی نے بھی 90 دی مال کے بارے میں صحیح طور پر نہ تو کچھ تحریر کیا ہے اور نہ ہی تحقیق کی ہے۔ ایک کتاب میں پنجاب حکومت کے سرکاری ریکارڈ سے حاصل کردہ عمارت کے بارے میں چند تفصیلات کا اجمالی ذکر ضرور ملتا ہے، لیکن اس سے زیادہ اور کوئی معلومات نہیں ملتیں۔

یہ محض اتفاق تھا کہ 1974ء میں جواں سال خبر نگار کی حیثیت سے مجھے اُن سرکاری اہلکاروں کے ہمراہ بھیجا گیا جن کے ذمے تنظیم پر بندش کے بعد عمارت کا قبضہ لینا تھا۔ اُن دنوں پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار تھی۔ اسے اپنا صدر دفتر قائم کرنے کے لیے قبضہ کرنا تھا۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اسی روز سے پارٹی بددُعا کے زیرِ اثر آ گئی اور اس کی عمودی نشوونما رک گئی۔ لیکن فری میسنوں پر حقیقی پابندیاں 1965ء کی پاکستان بھارت جنگ کے دوران عائد کی گئی تھیں۔ ان کی سرگرمیاں سلب کر دی گئی تھیں اور 1971ء کی تباہ کن جنگ کے دوران

ان پر خاصا شک کیا جاتا تھا کہ دراصل وہ دشمن کے جاسوس تھے۔فری میسنوں کی انجمن کی پُراسراریت اتنی گھمبیر تھی کہ لاہور کے مکین کبھی بھی اس بارے میں مطمئن نہیں ہوئے کہ آخران کا موَقف کیا ہے؟

آیئے میں آپ کو 90 دی مال پر ورود کے بارے میں بتاتا ہوں جب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے اس پر قبضہ کیا تھا۔ داخل ہوتے ہی بے شمار تلواریں نظر آئیں اور اوپر جاتے زینے کے دونوں جانب بے شمار جسمانی ڈھانچے اور انسانی کھوپڑیاں تھیں۔ جگہ جگہ امریکی کوکلس کلان انجمن، سفید فام امریکیوں کی دہشت گرد تنظیم جو سیاہ فام لوگوں کے درپے تھی، کی طرح پہننے والے ریشمی لباس اور ہر نوع کے عجیب وغریب ہتھوڑے اور دیگر ہتھیار پڑے ہوئے تھے۔ وہاں بڑی بڑی گھنٹیاں اور پیتل کے پیالے پڑے تھے اور دیواروں پر دبیز آرائشی پُھلکاریاں لٹک رہی تھیں۔ پوری عمارت ڈراؤنی تھی، لیکن فری میسنوں کی اساطیری روایت اتنی عام اور اتنی راسخ تھی کہ بظاہر بے ضرر نمائشی اشیاء پر کسی قبیح سازش کا گمان ہوتا تھا۔ یہ تو واضح تھا کہ یہ اعلیٰ طبقے کے معزز لوگوں کی کلب تھی، جہاں جمع ہو کر وہ اپنے من پسند موضوعات پر بحث کیا کرتے تھے۔ اس عمارت کی بھی ایک لمبی چوڑی تاریخ ہے۔ آیئے دیکھیں کہ فری میسن تحریک کیسے لاہور میں وارد ہوئی؟ لاہور کے اوّلیں فری میسن رنجیت سنگھ کی فوج کے دو فرانسیسی جرنیل وینچورہ اور ایوی ٹیبل بتائے جاتے ہیں جو واٹرلو کی جنگ میں نپولین کی شکست کے بعد فرانس سے فرار ہو گئے تھے۔ فری میسنوں کی اوّلین نشست، سکھ حکمران کے آخری ایام میں اندرون شیرانوالہ دروازے میں ہوئی۔ یہی جگہ بعدازاں انگریزی راج کے ابتدائی ایام میں بھی استعمال ہوتی رہی۔

1859ء میں لاج ''امید واستقلال'' نمبر 782 کی تشکیل ہوئی اور اگلے ہی برس پرانی انارکلی کے علاقے میں ایک عمارت تعمیر کر دی گئی۔ زمانۂ حال تک اس سڑک کا نام لاج روڈ تھا کیونکہ وہاں فری میسنوں کی انجمن کی ضلعی عظیم لاج واقع تھی۔ 6 ستمبر 1859ء کو ایچ ڈی سنڈیمن نے، جسے بہتر طور پر اس شخص کے طور پر پہچانا جاتا ہے کہ اس کے نام پر فورٹ سنڈیمن ہے، لاج کا سنگِ بنیاد رکھا۔ برادران نے برج کو اپنی عبادت گاہ قرار دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ لاج میں توسیع ہوتی رہی، لیکن جلد ہی احساس ہونے لگا کہ ایک نئی اور بہتر عبادت گاہ یا ''لاج'' کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ستمبر 1914ء میں اصلی لاج حکومتِ پنجاب کو، پبلک لائبریری قائم کرنے کے لیے، فروخت کر دی گئی اور 13 کنال اور 176 فٹ کا نیا پلاٹ، لاہور کے چڑیا گھر کی ہرنوں کے پارک میں سے بعوض -/32,590 روپے خرید لیا گیا اور پھر اس جگہ فری میسنوں کا ہال تعمیر ہوا۔

پنجاب حکومت کے مشیر ماہرِ تعمیرات، مسٹر سلیوان نے ڈرائنگ اور نقشے تیار کیے، جسے حکومت نے منظور کر لیا۔ نئی عمارت کا سنگِ بنیاد یکم اپریل 1916ء کو رکھا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ 1859ء میں سنڈیمن والا سنگِ بنیاد ہی ایک بار پھر نصب کر دیا گیا۔ لاج ہال کے بالمقابل گولڈ سمتھ بلڈنگ میں لاج کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس وقت اسے میکس منکس بلڈنگ کہا جاتا تھا۔ 1917ء کے آخر تک نئی عبادت گاہ کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ یہ

ہال کی تعمیر کی مختصر کہانی ہے۔

لیکن فری میسنوں کی انجمن کا کیا بنا؟ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس نے روزمرہ کے معمول کا کام بند کر دیا ہے، لیکن جنہیں علم ہے ان کا کہنا ہے کہ یہ لوگ اب بھی اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ قانونی طور پر، ہال انجمن ہی کی ملکیت ہے اور بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ لاہور ہائی کورٹ میں زیرِ التوا دعویٰ دائر تھا جس میں انجمن نے اپنی عمارت کی واپسی طلب کی تھی۔ اس دعویٰ کا کیا بنا؟ کسی کے علم میں نہیں۔

لاہور کے ایک فری میسن نے مجھے مطلع کیا کہ جادو گھر کے بارے میں سب قصے لایعنی ہیں اور یہ کہ انجمن اساسی طور پر لاج کے گرد و نواح میں رہنے والوں کی بھلائی کے لیے کام کرتی ہے۔ اُن کے اور دیگر انجمنوں کے کام میں صرف یہ فرق ہے کہ کسی کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کون سا ''بھلائی'' کا کام کر رہے ہیں۔ لیکن ''برادران'' کا اصرار ہے کہ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اور اگر اُسے نتیجہ خیز بنانا ہے تو اس کام کو صیغہ راز میں رکھنا اشد ضروری ہے۔ بہرحال یہ بات ضرور ہے کہ جذبہ تصنع سے پاک ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ کھلے ماحول کے زمانے میں غریبوں کے لیے اگر اصلی نیک کام بھی بغیر تشہیر کیا جائے تو اسے حقیر سمجھا جاتا ہے۔ اب یہاں سے انسان کہاں جائے؟

●○●○●○●

میانی صاحب اور جنونی سکھ

جب میری دادی سیّدہ بیگم کا انتقال ہوا تو سارا دن بڑا ہی اداس گزرا۔ وہ 1920ء کی دہائی میں موچی دروازے کے وکٹوریا اسکول میں پڑھاتی رہی تھیں اور ڈولی میں سکول جایا کرتی تھیں۔ مزید دُکھ کی بات یہ تھی کہ جب یہ واقعہ پیش آیا تو ان دنوں میں پاکستان سے باہر تھا۔ انہیں لاہور کے میانی صاحب قبرستان میں دفن کیا گیا تھا جو غالباً برصغیر کا سب سے بڑا قبرستان ہے۔ یہ جگہ کچھ عجیب سی لگتی ہے۔ ایک پراسرار قسم کا ماضی ہے جسے بیان کرنا ضروری ہے۔ میری دادی کے انتقال کی غمناک ترین بات یہ ہے کہ میں ان کی قبر کبھی تلاش نہ کر پایا۔ انہوں نے وصیت کی تھی کہ ان کی وفات کے پانچ سال بعد قبر کے تمام آثار مٹا دیئے جائیں اور وہ واقعی مٹا دیئے گئے تھے۔ میرے والد نے بھی یہی وصیت کی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان کی خواہش تھی کہ پانچ سال بعد ان کی قبر پر ہل چلا دیا جائے لیکن ہم نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ اپنے مرحومین سے وابستہ رہنے میں ایک عجیب کشش ہوتی ہے، اسی لیے ہر تہذیب کے قبرستانوں کی اپنی کہانیاں ہوتی ہیں۔ ماہرِ بشریات ان کے رازوں سے پردا اُٹھاتے ہیں اور ہمیں اس قوم اور عہد کے بارے میں بتاتے ہیں جس میں انہوں نے زندگی بسر کی تھی۔ اہرامِ مصر اساسی طور پر قبروں کے ٹیلے ہی تو ہیں۔ ان کا بے مثل معیار ہمیں حیرت زدہ کر دیتا ہے کہ تقریباً ہر سائنس کے ہر پہلو کو کس طرح آپس میں مربوط کر کے دنیائے قدیم کا عجوبہ تشکیل دیا ہے۔ اسی طرح کی کوئی حیران کن چیز میانی صاحب میں موجود نہیں ہے لیکن ایک کہانی ضرور ہے جو توجہ کی مستحق ہے۔

میانی صاحب کی کہانی شہنشاہ جہانگیر کے دور سے شروع ہوتی ہے جب سرہند شریف سے ایک عالمِ دین اور بزرگ شیخ محمد طاہر قادری نقشبندی تشریف لائے۔ لاہور کے اندرونِ شہر سے دُور ''موضع مزنگ'' میں آباد ہو گئے جو چھوٹا سا گاؤں، لاہور کے نزدیک ترین دروازے شاہ عالمی سے دو میل دور تھا۔ سڑک کے کنارے ایک فرلانگ دور ایک محصول خانہ، ''ایک چونگی'' بنی ہوئی تھی اور موضع مزنگ کی اپنی ایک الگ آزاد حیثیت تھی۔ شہر کے نزدیک بھی اور ایک طرح سے الگ تھلگ بھی۔ لاہور اور مزنگ کی حدِ فاصل ایک جنگل تھا۔ آپ اندازہ لگا

سکتے ہیں کہ یہ کتنی پرسکون جگہ تھی۔ شیخ طاہر القادری ایک عالمِ دین اور صوفی فقیر منش تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ شاہی کروفران کے سکون کو غارت کرے۔ انہوں نے اپنا ایک مدرسہ قائم کرلیا اور چند ہی برسوں میں ان کے مریدین اور طلبہ کی تعداد خاصی کثیر ہوگئی۔ جلد ہی یہ دور افتادہ چھوٹا سا گاؤں ایک اچھا خاصا بڑا گاؤں بن گیا، جس میں توجہ کا مرکز شیخ طاہر قادری کا مدرسہ اور اس کے وسیع میدان تھے۔

مزنگ کی شہرت کو عروج بنیادی طور پر اسی مدرسے اور اس کے فارغ التحصیل اعلیٰ ترین دینی علماء کی وجہ سے حاصل ہوا تھا۔ پنجابی زبان میں ایک لفظ ''میانی'' ہے، جس کے معنی ہیں صاحبِ علم مبلغ۔ چنانچہ شیخ صاحب، ان کے مدرسے اور اس کے وسیع میدانوں کی وجہ سے اس کا نام میانی صاحب پڑ گیا۔ یہ نام مقامی آبادی نے شیخ طاہر قادری کے احترام میں رکھا تھا۔ جب تک وہ حیات رہے اسلامی فقہ اور حدیث کا درس دیتے رہے۔ ان علوم میں دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کو اور وہ بھی بلا معاوضہ!

وہ بہت ہی آزادانہ ماحول تھا، جس میں ابنِ عربی کی تعلیمات کو بلند ترین غلبہ حاصل تھا۔ شیخ طاہر قادری کا وصال 1040ء میں ہوا اور اسی عہد میں برصغیر میں مغلیہ حکومت کو زوال اور سکھ مثلوں کو عروج مل رہا تھا۔ ہم سب کے علم میں ہے کہ ایک خاصے طویل عرصے تک لاہور کے گرد و نواح کا پورا علاقہ سماج دشمن عناصر کے گروہوں اور ڈاکوؤں کے تسلط میں تھا۔ ان ہی کی پرتیں اب بھی دور افتادہ علاقوں میں کارروائیاں کرتی رہتی ہیں۔

شیخ طاہر قادری نقشبندی کے وصال کے چند برس بعد سکھوں کی ایک منہ زور مثل نے موضع مزنگ پر حملہ کر دیا، ایک تحریر میں اس مثل کا نام نکئی مثل لکھا ہے، اور قرآن پاک کے نسخوں کا پورا خزانہ، نایاب کتب اور مقالات کو لوٹ کر لے گئے۔ اُنہیں مٹر گشت کرنے والوں فقیروں نے اطلاع دی تھی کہ مدرسے میں ایک ''بے بہا بیش قیمت خزانہ'' موجود ہے۔ سکھوں نے اسی کی خاطر حملہ کیا تھا۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ وہ تو تمام کے تمام مقدس صحیفے ہیں اور یہ کہ ان کے کچھ حصے گرنتھ صاحب میں بھی شامل ہیں تو انہوں نے ساری کتابوں کو پھاڑ کر پرزے پرزے کر دیا اور پورے علاقے میں بکھیر دیا۔ کتابوں کے ڈھیر کے ڈھیر نذرِ آتش کر دیئے گئے۔ مقالات کو بھی جلا کر اِدھر اُدھر پھینک دیا۔ ایک تخمینے کے مطابق قرآن پاک کے نسخوں، اس کے قاعدوں، فقہ اور احادیث کی مختلف کتابوں کی تعداد تیس ہزار سے متجاوز تھی۔ غضبناک سکھوں نے ایک نسخہ بھی سلامت نہیں رہنے دیا۔ انہوں نے گاؤں کے ہر گھر کو بھی آگ لگا دی اور اپنے پیچھے ایسا منظر چھوڑ گئے جس نے میانی صاحب کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا۔

مدرسے کے علماءِ دین لوٹ مار کے اس صدمے سے جلد باز یاب ہو گئے اور ادارے کی بحالی کا بندوبست کر لیا جو اُنہی خطوط پر آج بھی گامزن ہے۔ مسئلہ تو پھٹے ہوئے اور آتش زدہ قرآنی نسخوں اور دیگر مذہبی کتب کا تھا جو اسی جگہ ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ان کو جوں کا توں رہنے دیا جائے حتیٰ کہ سیلاب

آجائے اوران بے حرمتی کے شکار نسخوں کو بہالے جائے۔

کئی برس تک کوئی سیلاب ہی نہ آیا اوران کے گرد زمین ویران پڑی رہی۔لاہور کے مکینوں نے فیصلہ کیا کہ اس جگہ کا بہترین استعمال وہاں مُردے دفنانے میں ہی ہے۔چنانچہ بغیر کسی جھمیلے میں پڑے یہ لاہور کا ہر دلعزیز قبرستان بن گیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں لاہور کے مسلمانوں نے، مہاراجہ کے فرمان کی رُو سے، ٹھیک اس علاقے کے اردگرد نشاندہی کردی جہاں قرآن پاک کے ہزاروں بے حرمت نسخے پڑے ہوئے تھے۔یہ تمام علاقہ مدرسے کو تفویض کر دیا گیا اوراسے قبرستان میں تبدیل کر دیا گیا۔چنانچہ عاقل سکھ نے اپنے حساب سے اپنے ہم مذہبوں کے کرتوتوں کی تلافی کردی۔ایک ہر دل عزیز بیان کے مطابق، جس کی حمایت میں زیادہ ثبوت میسر نہیں، فقیروں کی پیش گوئی کے متعلق ہے کہ ''قرآن پاک کے نسخوں کو شہید کرنے، نذرِ آتش کرنے اور پورے مزنگ میں بکھیر دینے کے بعد اس جگہ صرف مُردے ہی رہیں گے۔'' یہ ایک لحاظ سے دُکھی لوگوں کے جذباتی احساس کا اظہار معلوم ہوتا ہے جو سرہند کے شیخ طاہر قادری نقشبندی کی روح اور کاموں کی تعظیم کرتے تھے۔رمزاً ان بزرگ کی قبر آج بھی مدرسے کے ایک جانب موجود ہے۔نہایت سادہ اور کم تزئین والی، شاید وہ اسی طرح کی چاہتے ہوں گے!

●○●○●○●

لاہور دربار کا تیز طرار شخص

قلعہ لاہور کی پوری تاریخ میں ایک سب سے پریشان کن واقعہ وہ انداز تھا جس میں 1840ء میں حضوری باغ اور قلعۂ لاہور کے مابین روشنائی دروازے کے ایک اہم محرابی راستے کا کسی ظاہری وجہ کے بغیر یکا یک دھڑام سے گر جانا تھا۔اس انہدام کے بے شمار بیانات ہیں اور کچھ ہر دل عزیز عوامی اساطیری روایات ہیں۔

یہ انہدام مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بیٹے کھڑک سنگھ کی قلعہ لاہور کے عین بیرون مرنے کی آخری رسومات ادا کرنے کے فوراً بعد پیش آیا تھا۔ جب کریا کرم کے بعد حکمران سکھ اعلیٰ قیادت، قلعہ کی جانب پیدل واپس آ رہی تھی اور تخت کا یقینی وارث نونہال سنگھ، کشمیر کے مہاراجہ گلاب سنگھ کے بیٹے اُدھم سنگھ کے ہمراہ، اس جلوس کی قیادت کر رہا تھا۔

جونہی وہ محرابی راستے میں پہنچے تو وہ 'پراسرار طور پر یکا یک دھڑام سے ان پر آن گرا اور کشمیر اور پنجاب کے دونوں شہزادے ہلاک ہو گئے۔ یہ المیہ ایسا تھا کہ اس نے دونوں ریاستوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور نتیجتاً بالآخر دونوں ریاستوں ہی کے انہدام پر منتج ہوا۔ کیا یہ سازش تھی یا محض ایک حادثہ تھا؟ اس سوال نے بہت سے ماہرین کو پریشانی میں مبتلا رکھا۔ آیئے ہم لوک روایت کا معائنہ کرتے ہیں جو اَب بھی اندرون شہر لاہور میں گردش کرتی ہے۔

اس کا وجود ایک پُرمغز قول کی صورت میں ملتا ہے۔ ''خواہ یہ خود گری یا گرائی گئی، اپنے ساتھ نونہال کی جان لے گئی۔'' ایسے قدیم پُرمعنی اقوال اب اپنی موت آپ مر رہے ہیں۔ آئندہ تحقیق کی خاطر انہیں محفوظ کرنے کی ضرورت ہے، لیکن چند ایک ہی ایسے کالموں میں محفوظ کیے جا سکتے ہیں۔ یہ ہمارے اپنے سمجھنے کے لیے ہے کہ اس زمانے میں لوگ کیا محسوس کرتے تھے۔

اس واقعہ کے بارے میں کنہیا لال کی تحریر کے مطابق جب مہاراجہ کھڑک سنگھ حکمران بنا تو ڈوگرہ خاندان نے، جو لاہور دربار میں بہت طاقت پکڑ چکا تھا، نئے مہاراجہ کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ بے حد طاقتور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی، جس نے پورے چالیس برس حکومت کی تھی، موت طاقت کا بہت بڑا خلاء چھوڑ گئی

تھی۔ ہر کہہ ومہ زیادہ طاقتور جگہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ سازشوں کا دور دورہ تھا۔

طاقتور ڈوگرہ خاندان نے یقینی وارثِ تخت، شہزادہ نونہال سنگھ کی صورت میں ایک طاقتور حلیف تلاش کرلیا تھا۔ جب انہوں نے ایک دعویٰ دار چیت سنگھ کو قتل کرادیا تو پھر ایسے حالات پیدا کردیئے جس کے نتیجے میں شہزادے کو اپنے باپ کو اندرونِ شہر اس کی حویلی میں مقّید کرنا پڑا اور خود اصلی حکمران بن بیٹھا۔

مہاراجہ کھڑک سنگھ نے اس سلوک پر اپنے بیٹے کو کبھی معاف نہیں کیا۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ جب وہ بیمار پڑا تو اس نے بیٹے کو اپنی عیادت کے لیے آنے کی اجازت دینے سے انکار کردیا تھا۔ اس کے جواب میں شہزادہ نونہال سنگھ نے اپنے باپ کو ایک جنونی شخص کی حیثیت دینی شروع کردی جو وہ ہرگز نہیں تھا۔ وہ تو ایک خدا سے لَو لگانے والا شخص بن چکا تھا اور بڑے معنی خیز جملے بولتا رہتا تھا جو اکثر لوگ سمجھ نہ پاتے تھے۔ دوسروں کا خیال تھا کہ وہ ایک نہایت عقلمند شخص والی عاقلانہ باتیں کرتا تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اندرون شہر کے لوگوں نے قیدی مہاراجہ کھڑک سنگھ کو پسند کرنا شروع کردیا تھا۔ اپنی قید کے دوران وہ لاہور کے محلّوں میں گھومتا پھرتا تھا اور مسلمانوں کی کھڑکیوں کو کھٹکھٹاتا رہتا تھا تاکہ وہ نمازوں کے لیے نیند سے بیدار ہوجائیں۔ اس لیے پُرمعنی قول ''کھڑک سنگھ کے کھڑکنے سے کھڑکتی ہیں کھڑکیاں'' کو اب بھی لاہور کے تقریباً تمام سکول جانے والے بچے ادا کرتے رہتے ہیں۔

لاہور دربار کے سردار صاحبان نے اس کو ''صریحاً'' پاگل قرار دیا اور وہ چاہتے تھے کہ صلح ہوجائے۔ مہاراجہ کھڑک سنگھ نے ایسے خیالات تک کو نزدیک پھٹکنے نہیں دیا اور اپنے پاس آنے والے ہر ملاقاتی سے یہ کہنا شروع کردیا کہ ''وہ احمق ہے، اگر وہ سمجھتا ہے کہ میں خالقِ حقیقی کے پاس اکیلا جاؤں گا۔ جب میں جاؤں گا تو وہ بھی میرے ساتھ ہی جائے گا۔'' کنہیا لال لکھتا ہے کہ وہ اندرون شہر ایسے بے شمار بوڑھے لوگوں سے ملا تھا جنہوں نے یہ بات سن رکھی تھی۔

ایک اور ماخذ، ایک سکھ تاریخ ویب سائٹ بتاتی ہے کہ ''کھڑک سنگھ ایک اللہ لوک شخص تھا، جو مستقبل کے بارے میں پیشگوئیاں کرسکتا تھا اور اس نے اپنی اور اپنے بیٹے کی موت کے دن تک کی ٹھیک ٹھیک پیشگوئی کر دی تھی۔'' ایک اور ماخذ کے مطابق جب کھڑک سنگھ کو کسی نے بتایا کہ نونہال سنگھ ہی ''مؤثر'' حقیقی راجہ تھا تو اس نے اونچی آواز میں قہقہہ لگایا اور کہا ''وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔''

اس امر کا یقین کرنے کا ہر جواز موجود ہے کہ نونہال سنگھ اپنے باپ کو سُست رَو، زہر دینے کی مذموم حرکت میں شریک تھا۔ جب کھڑک سنگھ کا 1840ء میں انتقال ہوا تو اس کا کریا کرم عین اسی جگہ کے قریب ہوا جہاں اس کے باپ کا ہوا تھا۔ کریا کرم کے بعد جب بیش فعال نونہال سنگھ اپنی پنجاب کے مہاراجہ کی یقینی تخت نشینی کے لیے قلعہ لاہور کی طرف بے تابی سے پیدل چلا آرہا تھا تو جس محرابی راستے میں سے گزر رہا تھا وہ اچانک

دھڑام سے گر گئی اور وہ اودھم سنگھ کے ساتھ زندہ درگور ہو گیا۔ کرنل ایچ آر گولڈنگ کی تحریر یہاں دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی، جسے انگریز پنجاب کا تندخو شخص کہا کرتے تھے۔

''محرابی راستے کے انہدام کو کسی سازش سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ سکھ درباریوں نے تخت کے یقینی وارث کے زخموں کو چھپانے کی کوشش کی۔ سازش کا خدشہ ظاہر کیا جا رہا تھا۔ لیکن محرابی راستے کا عین موقع پر گر جانا یقیناً حادثاتی معلوم نہیں ہوتا۔ گلاب سنگھ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اس کا مخترح تھا، لیکن پھر اس کا اپنا بیٹا بھی تو ہلاک ہو گیا جو گلاب سنگھ کے مقصد سے مطابقت نہیں رکھتی۔''

ایک اور عالم شخص نے نونہال سنگھ کی موت کا یوں ذکر کیا ہے۔ ''جب کھڑک سنگھ کا کریا کرم ہو چکا تو فوراً بعد توپوں کی سلامی دی گئی جس نے قلعہ کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ اس لمحے تخت کے یقینی وارث کو جانے کی جلدی تھی تاکہ اپنی تخت نشینی کا آغاز کر سکے۔ توپوں کی ارتعاش نے پہلے سے بوسیدہ محرابی راستے کو اکھاڑ دیا تھا اور اتفاق سے یہ عین اس وقت ڈھے گیا جب نونہال سنگھ اور اودے سنگھ اس کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ سازش کا قصہ بعید از قیاس ہے۔'' یہ مدلل نقطۂ نظر مؤثر لگتا ہے اگرچہ قلعہ لاہور کے محرابی راستے اس قدر مضبوط ہیں کہ کسی توپ کی گرج سے ڈھیر ہو جانے کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے، لیکن پھر پراسراریت تو وہیں رہی نا!

کھڑک سنگھ اور نونہال سنگھ دونوں کی سمادھیاں ایک ہی کمرے میں ہیں، جہاں ان کی راکھ دو چھوٹے چھوٹے گنبدوں کے نیچے بالکل مہاراجہ رنجیت سنگھ کی راکھ سے متصل پڑی ہوئی ہے۔ پنجاب کے سب سے طاقتور خاندان کی تین نسلیں اکٹھی پڑی ہوئی ہیں۔ پہلا ایک نتائجی حکمران تھا، دوسرا خدا سے لَو لگانے والا اور تیسرا ''تندخو'' جدید اصطلاح میں اسے بھٹکا ہوا میزائل کہا جا سکتا ہے جس نے اس موروثی خاندان، جس نے اسے پالا پوسا تھا، کے خاتمے کے لیے خاصی مدد فراہم کی۔ لاہور میں اوّلیں کی اب بھی تعریف کی جاتی ہے اور دوسرے کو، جو اس کے بارے میں جانتے ہیں، لوگ پیار کرتے ہیں۔ جبکہ تیسرے کو بُھلا چکے ہیں۔

●○●○●○●

بریڈلے ہال کی تاریخی اہمیت

1929ء کا برس لاہور کی، پاکستان کی بلکہ پورے برصغیر کی تاریخ میں بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اس سال لاہور میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا جس سے فیصلہ کن واقعات کا آغاز ہوا جو بالآخر برصغیر کی تقسیم پر منتج ہوئے۔

1929ء میں انڈین نیشنل کانگرس نے لاہور کے بریڈلے ہال میں ایک اجلاس میں قرارداد منظور کی کہ ہندوستان کو برطانوی راج سے مکمل آزادی دلانا ہوگی۔ ہم میں سے بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ انڈین نیشنل کانگرس کا صدر دفتر، بریڈلے ہال آج بھی استادہ ہے۔ لیکن اب اس میں انسانی تاریخ کی سب سے وسیع پیمانے پر تارکینِ وطن کی ''ہجرت'' کے مہاجرین آباد ہیں۔ ہم میں سے کتنے لوگ اس ہال کو دیکھنے گئے ہیں جو نہایت مرمت طلب حالت میں ہے۔ یہ تحریر اس ہال اور ان بے شمار قراردادوں کے بارے میں ہے جو اس اجلاس میں منظور ہوئیں اور کیسے انہوں نے برصغیر کو حسبِ حال تشکیل دیا۔

بریڈلے ہال، سنٹرل ماڈل سکول اور سنٹرل ٹریننگ کالج کے عین عقب میں ریٹی گن روڈ پر واقع ہے۔ اگر آپ ضلع کچہری لاہور سے بلال گنج کی جانب جائیں تو صرف ایک سو گز پر ایک چھوٹی سی گلی بائیں ہاتھ مڑتی ہے۔ یہ ریٹی گن روڈ ہے، جو کسی زمانے میں لاہور کا بہت اعلیٰ رہائشی علاقہ تھا۔ جہاں چنیدہ لوگ ہی رہائش پذیر تھے۔ اس سڑک پر کُل سترہ گھر تھے۔ آج اسی جگہ تین سو سے زائد چھوٹے چھوٹے گھر ہیں۔ اس سڑک کے دائیں جانب شروع ہی میں ایک تنگ راستہ ایک بند گلی کی طرف جاتا ہے جہاں صرف ایک ہی وسیع و عریض عمارت کا وجود ہے۔ بڑی سڑک سے یہ عمارت نظر نہیں آتی لیکن ایک بار جب آپ بند گلی میں داخل ہو جائیں تو ہال کا محض حجم ہی آپ کو مرعوب کر دے گا۔ یہ انڈین نیشنل کانگرس کا اصلی دفتر ہے۔ وہ مرکزی مقام جہاں سے پنجاب بھر میں آزادی کی جدوجہد کا منصوبہ تشکیل دیا گیا اور اس پر عملدرآمد کی نگرانی کی گئی۔ تقسیم کے وقت تک یہ اپنے مقاصد کے تقاضے پورا کرتا رہا اور جب تقسیم عمل میں آ گئی تو یہ بے محل ہو کر رہ گیا۔

بریڈلے ہال کی ساخت کوئی توجہ طلب امتیاز کی حامل نہیں ہے، لیکن ہمارے ملک کی تاریخ میں اور

برصغیر کی تاریخ میں، اس کا بہر حال ایک یقینی مقام ہے۔ عالم حضرات اور متعصّب حضرات کی الگ الگ توجیہات ہوں گی، لیکن حقیقتاً اس امر کی ضرورت ہے کہ اسے غیر قانونی قبضے سے چھڑایا جائے اور اس میں مناسب تبدیلیاں لاکر سے ایک پُر وقار عجائب گھر بنادیا جائے۔

اسی طریقے سے ہمیں بالیدگی کے ساتھ تاریخ پر تحقیقی نظر ڈالنا ہے۔ انڈین نیشنل کانگرس کے 1929ء کی قرارداد نے کانگرس میں پھوٹ کی چنگاری ڈال دی۔ جس میں ایک طرف آزادی کے حصول کے لیے قوّت کے استعمال پر یقین رکھنے والے مسٹر تِلک تھے اور دوسری جانب ''عدم تشدد'' اندازِ نظر کا پرچار کرنے والے مسٹر گاندھی تھے۔ اس وقت تک جناح صاحب بھی یہی چاہتے تھے اور یہ لاہور کے انڈین نیشنل کانگرس کی قرارداد ہی تھی جس پر عمل پیرا ہو کر جب آزاد ہندوستان کے لیے ''امکانی آئین'' کا خاکہ تیار کیا گیا تو علامہ اقبال نے مسلم اقلیت کے لیے ایک ریاست کی ضرورت پر مفصّل بحث کی۔ جناح صاحب نے بہر طور قانونی روش اختیار کی اور مجوزہ آئین میں تبدیلیوں کی تجویز پیش کی، جسے انڈین نیشنل کانگرس نے مسترد کر دیا اور نتیجتاً جناح صاحب نے اپنا راستہ الگ کر لیا۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اس جدائی کی پہلی گونج بریڈلے ہال کی ایک تقریر میں موجود تھی۔ چنانچہ اس ہال نے پاکستان کا بیج اور ثمر دونوں دیکھ رکھے ہیں، لیکن ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ پاکستان پر جو بیتی ہے اس کا بہترین اندازہ اس ہال کی موجودہ حالت دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے۔ شاید ہمارے ملک کی حیاتِ نو کا آغاز اس عمارت کا کہیں زیادہ روشن خیالی سے جائزہ لینے اور اس کو ایک ایسی جگہ میں تبدیل کرنے سے ہو سکتا ہے جو ہمیں اپنے کہیں زیادہ معنی خیز اور سیکولر انداز کے ماضی کی یاد دِلا سکے۔ 1929ء کی انڈین نیشنل کانگرس کی قرارداد سے پیدا ہونے والا اختلاف ٹھیک گیارہ برس بعد 1940ء میں اس سڑک سے ٹھیک ایک میل کے فاصلے پر واقع منٹو پارک میں نظر آ گیا جہاں مسلم لیگ نے ایک قرارداد کی رُو سے مسلمانوں کے لیے الگ وطن کا مطالبہ کر دیا۔ اس مطالبے کو حقیقت کا رُوپ دھارنے میں مزید سات برس لگے۔ یہ اعلامیہ کھلے میدان میں کیا گیا تھا اور اعلامیے کی خوشی مینارِ پاکستان کی شکل میں منائی گئی۔ لاہور کے سن رسیدہ لوگ جو ہندوؤں کے ساتھ اکٹھے رہتے آئے تھے اس بات پر عمومی یقین رکھتے تھے کہ اگر انڈین نیشنل کانگرس حقیقی طور پر سیکولر ہوتی تو ہندوستان کی تقسیم کبھی عمل میں نہ آتی۔

لاہور شہر میں بہت سی عمارات ہیں جن کا تعلق آزادی کی جدوجہد سے رہا ہے۔ برکت علی ہال ہے، موچی دروازے کا میدان ہے، بریڈلے ہال ہے اور ان جیسے بے شمار دیگر مقامات ہیں۔ انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ ہمیں انہیں علم حاصل کرنے والے معنی خیز مقامات میں تبدیل کر دینا چاہیے بجائے اس کے کہ آزادی کی جدوجہد کے لیے نئی سیمنٹ کے ڈھانچوں والی عمارات کی تعمیر کی جائے۔ مجھ جیسے عامی شخص کی سمجھ سے باہر ہے۔

ہمیں 1940ء تک سیکولر دور اور بعد والے حصے کے بھی مطالعے کی ضرورت ہے۔ ہر ایک کے اپنے

ہیرو اور ولن ہیں۔ آج بھگت سنگھ بھارت کی نسبت پاکستان سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ یہی رائے لالہ لاجپت کے بارے میں ہے۔ ہمیں یہ بات سیکھنا ہوگی کہ ہم ہر ہیرو سے انصاف کریں اور صرف ایسا کرنے سے ہم قائداعظم کی میراث کا حقیقی پاس کر سکتے ہیں۔

●○●○●○●

گھوڑا گاڑیوں کے اڈے والے بنگلے کی سرگزشت

شروع شروع میں قدیم اندرونِ شہر لاہور سے بیرون ایک ٹیلے پر ایک کوچوں والا بنگلہ ہوا کرتا تھا۔ جہاں سے مسافر گھوڑا گاڑیاں دوسرے شہروں کو روانہ ہوتی تھیں۔ اس سے بھی قدیم زمانے میں یہاں فوجیوں کا عارضی پڑاؤ ہوا کرتا تھا۔ جہاں فوجی جوانوں کو تربیت کی جاتی تھی اور بعدازاں جنگ پر روانہ کر دیا جاتا تھا۔ آج کل بہت سے ذرائع مقبول ہیں اور امید ہے کہ آنے والی صدیوں میں بھی یوں ہی ہوتا رہے گا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ (1799-1839ء) کے زرّیں دور میں جس ٹیلے پر آج کل گورنمنٹ کالج لاہور قائم ہے وہاں ایک فوجی تربیتی مرکز ہوتا تھا۔ اس ٹیلے کے بالکل متصل، جہاں اعلیٰ درجے کی ''فوجِ خاص'' کی تربیت کی جاتی تھی، مسافر گھوڑا گاڑیوں کا علاقہ تھا۔ اس ٹیلے پر ایک بنگلہ تعمیر کیا گیا تھا جسے اس دور کے سکھوں کے ریکارڈ کے مطابق ''گھوڑا گاڑیوں والا بنگلہ'' کہا جاتا تھا۔ لاہور کے 1867ء کے ایک نقشے سے اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے۔ بائیں جانب ایک گرجا تھا جسے بعدازاں جسمانی ورزشی کھیلوں کے ہال کے طور پر کالج کا حصہ بنا لیا گیا۔ اس بوسیدہ عمارت کو ''گورنمنٹ کالج کا عجائب گھر'' میں تبدیل کرنے کے لیے اچھی خاصی رقم درکار ہے، لیکن اس بارے میں مزید ذکر تھوڑی دیر بعد ہوگا۔

لاہور کے بارے میں ایک مشہور مصنف ''لطیف'' کے مطابق کنگ ایڈورڈز میڈیکل کالج لاہور کی اوّلین کلاسیں 1860ء میں گھوڑا گاڑیوں کے بنگلے میں ہوتی تھیں جبکہ ہسپتال ٹکسالی دروازے کے نزدیک مین ٹبی بازار میں واقع راجہ سچیت سنگھ کی حویلی کے اصطبل میں قائم کیا گیا تھا۔ جب انگریزوں نے ''فوجی وجوہات'' کی بناء پر خوبصورت ٹکسالی دروازے کو مسمار کیا تو یہ ہسپتال بھی ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ لیکن اس وقت تک یہ موجودہ میو ہسپتال میں منتقل ہو چکا تھا۔

1856ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے لاہور میں ایک سنٹرل کالج کے قیام کی منظوری دی۔ اس سلسلے میں پنجاب کے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن نے انگلستان کے کارلائل کے ڈین اور مالبر و سکول کے ہیڈ ماسٹر، جی ای ایل کاٹن، سے خط و کتابت کی۔ اس نظریئے کے ساتھ کہ گھر (انگلستان) سے دو موزوں ڈگری یافتہ افراد کا، بطور پرنسپل اور

قدرتی فلسفہ کے طبعی استاد، انتخاب کیا جا سکے۔ چھ سو روپے اور چار سو روپے کی ''فیاضیانہ'' تنخواہوں کی پیشکش کی گئی تھی۔

یہ ''فیاضیانہ توقعات'' ان امیدواروں کو راغب نہ کر سکیں چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کام کے لیے ایک بورڈ تشکیل دینے کا فیصلہ کیا جو پادری کاٹن، کینٹربری کے پادری اے پی سٹینلے اور بالیول آکسفرڈ کے فیلو، مسٹرٹی والراونڈ پر مشتمل تھا۔ اس بورڈ نے یہ صلاح دی کہ صرف کیمبرج، آکسفرڈ، ڈبلن یا درہم کے ڈگری یافتہ امیدواروں پر ہی غور کیا جائے کیونکہ یہ ایک نہایت ''پُروقار عہدہ'' ہوگا۔ چنانچہ گورنمنٹ کالج لاہور آغاز ہی سے ایک خاص الخاص ادارہ تھا، اور اب بھی ہے، یا کم از کم اس نے بیتے ہوئے برسوں میں ایسا ثابت کر دیا ہے۔

پھر یہ فیصلہ کیا گیا کہ فلسفے میں اختصاص کے لیے ریاضی کا بھی ایک پروفیسر ہونا اشد ضروری ہے۔ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر جان لارنس نے اس تجویز کو قبل از وقت قرار دے کر رد کر دیا۔ ان حالات میں بورڈ نے گورنمنٹ کالج کے اوّلین پرنسپل کی حیثیت سے ڈاکٹر جی ڈبلیو لائیٹنر کا انتخاب کر لیا۔

آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ آخر سنٹرل کالج لاہور کی پیش کردہ تجویز کا کیا بنا؟ وہ بھی ایک روز وجود پذیر ہو گئی۔ صرف وہ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کہلایا۔ گورنمنٹ کالج کے عین بالمقابل اور سنٹرل ماڈل سکول، جو 1883ء میں تعمیر ہوا تھا، کے متصل اس کی تعمیر کی گئی۔ یہ سکول اور اساتذہ کے تربیتی کالج کی وقوع پذیری بھی ''مرکزِ فضیلت'' ثابت ہوئی، لیکن آج کل یہ اسی قدر بے توجہی کا شکار بھی ہے۔

اصلی گورنمنٹ کالج لاہور یکم جنوری 1864ء میں ٹکسالی دروازے کے اندرون واقع دھیان سنگھ کی وسیع و عریض حویلی میں کھولا گیا۔ موجودہ عمارت، جو لاہور کے سپرٹینڈنٹ انجینئر ڈبلیو پرڈن کا قدیم گاتھی طرز کا شہکار ہے، 1870ء میں تعمیر ہونا شروع ہوئی اور پانچ برس بعد -/3,20,537 روپے کی خطیر لاگت سے مکمل ہوئی۔

اس کی تعمیر رائے بہادر کنہیا لال کے ذمے قرار پائی جو ایک نابغہ شخصیت اور نہایت مخلص ٹھیکیدار تھا اور جس نے لاہور کے بارے میں ایک قابلِ تحسین کتاب تحریر کر رکھی ہے اور تعمیرات کا تو ذکر ہی نہ کریں کیونکہ اس زمانے کی تقریباً تمام مشہور عمارات اس کی تعمیر کردہ تھیں۔ گزرے برسوں میں کالج میں بے شمار نئی عمارات کا اضافہ کیا جا چکا ہے۔ اس کا ایک وسیع نباتاتی باغ، لارنس گارڈنز (جسے اب باغِ جناح کہتے ہیں) کے نزدیک واقع ہے۔ اس کی سول سیکرٹریٹ کے بالمقابل اپنی ایک ایٹمی طبیعات کی تجربہ گاہ اور قریب ہی اس کا اپنا کرکٹ کا میدان ہے۔

کالج کا ایک اہم حصہ اس کے ہاسٹل ہیں جو دو عدد ہیں۔ ایک کا نام کواڈرینگل ہے (جسے اب اقبال ہاسٹل کہتے ہیں) جو کالج کے احاطے میں ہی ہے اور ثانوی جماعت کے طلبہ کے لیے مختص ہے۔ دوسرا اصلی گورنمنٹ کالج کی اقامت گاہ ہے جسے بعد ازاں ''نیو ہاسٹل'' کا نام دے دیا گیا۔ اس ہاسٹل کے بارے میں

پنجاب کے گزیٹیر کی ایک تحریر میں اس کا محل وقوع ''مسٹر اچیج پرینڈن، پلیڈر اور پنجاب ایسوسی ایشن کلب کے متصل بتایا گیا ہے۔''

اس ''پلیڈر'' کا کوئی نام ونشان باقی نہیں ہے۔ اگرچہ سکول کے زمانے میں میرے والد مرحوم ''خُونا پلیڈر'' کا ذکر کیا کرتے تھے جو اینگلو انڈین وکیل تھا اور ہاسٹل کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھا۔ اس معاملے میں گورنمنٹ کالج کے شمال میں ڈی اے وی سکول تھا جو آج کل گورنمنٹ مسلم ہائی سکول کہلاتا ہے۔

لیکن پھر لاہور محض عمارات اور تاریخ ہی کا تو نام نہیں ہے۔ اس کے عوام الناس، اس کے اداروں سے ہمیشہ زیادہ اہم رہے ہیں۔ مثال کے طور پر گورنمنٹ کالج کے سارے پرنسپل حضرات ہمیشہ ''عظیم'' انسان رہے ہیں۔ لائیٹنر سے شروع ہو کر عظیم ناموں کا سلسلہ تھمتا نہیں ان میں گیرٹ، ڈنکلفؔ، سوندھی، بخاری، نذیر، رشید اور حال ہی میں ڈاکٹر خالد آفتاب جیسے چند ایک نام ہیں۔

ہر ماہرِ تعلیم اپنے کام میں غیر معمولی صلاحیت کا حامل تھا۔ تقسیم کے بعد کے زمانے میں پطرس بخاری بلاشبہ سب سے ممتاز ہیں۔ یہی حال ڈاکٹر نذیر، پروفیسر رشید، ڈاکٹر اجمل اور ڈاکٹر خالد آفتاب کا ہے۔ پاکستان کے اعلیٰ ترین ادارے پر ان کی چھاپ ہمیشہ رہے گی۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے ڈاکٹر اجمل بہت یاد آتے ہیں۔ ایک بار میں نے اُن سے دریافت کیا کہ انہوں نے اپنے نام کی تختی پر ڈاکٹر محمد اجمل کے بجائے فقط ''محمد اجمل'' کیوں لکھوا رکھا ہے تو وہ مسکرائے اور اپنے سگریٹ کو گول گول لپیٹا اور ایک شرمیلے سے انداز میں کہا۔

''ورنہ لوگ مجھے اپنی نبض دکھانا شروع کر دیتے۔''

لیکن پھر طالب علم بھی تو ایسے ہی عظیم تھے۔ کسی بھی شعبے کا نام لیں اور ممتاز طلبہ کے ناموں کی فہرست دماغ کو چونکا کر رکھ دے گی۔ شاعروں میں علامہ اقبال اور فیض احمد فیض ممتاز ترین ہیں۔ سائنسدانوں میں نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر سلام کا نام بلند ترین ہے۔ علم الحیوانات میں نوبل انعام کے لیے نامزد ڈاکٹر احسن الاسلام ہیں، جنہیں میرے والد ''آنڈیاں والا ڈاکٹر'' یعنی انڈا ڈاکٹر کہتے تھے۔

انہوں نے بیضوں میں خلیے کی پیدائش کا تعین کیا تھا۔ اسی تحقیق سے راہنمائی حاصل کر کے دیگر سائنسدانوں نے یہ دریافت کیا کہ جین اور ڈی این اے کس طرح عمل پذیر ہوتے ہیں۔ وہی شخص تھا جس نے ''زندگی کے راز'' کو افشا کیا تھا۔ میں انہیں بخوبی جانتا تھا اور ان کا دیوانہ تھا۔ جب بھی میں ان سے ان کے زندگی بھر کے کام کے بارے میں دریافت کرتا تو وہ کہتے ''اللہ کا کمال ہے۔'' بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ امپیریئل کالج انگلستان سے واپس چلے آنے سے وہ اپنی نوبل انعام کی نامزدگی سے دست بردار ہو گئے تھے، لیکن ان کے نزدیک ان کی بیمار والدہ زیادہ اہم تھیں۔

اس قسم کے عظیم استاد اور طالب علم رہے ہیں گورنمنٹ کالج لاہور کے! آج کل اس نے یونیورسٹی کا

درجہ حاصل کرلیا ہے۔اب جب یہ پیچ دار راستے سے نئی بلندیوں کی جانب رواں ہے ہم واپس زیر تشکیل عجائب گھر کے سوال کی طرف آتے ہیں۔خیال تو یہی ہے کہ کسی روز کوئی گورنمنٹ کالج کا قدیم طالب علم اس منصوبے کے لیے رقم مہیا کر دے گا۔ہوسکتا ہے ہم بھول رہے ہوں جو حضرت بلالؓ حبشی نے رسولِ پاکؐ سے سیکھا تھا۔

''ایک عالم کے قلم کی روشنائی کا ایک قطرہ ایک شہید کے خون سے کہیں مقدس ہے۔''

●○●○●○●

داراشکوہ کے سرخ پتھر

لاہور کی تمام قدیم یادگاری عمارات میں سے بادشاہی مسجد سے بڑھ کر کوئی شہر کی نمائندگی نہیں کرتی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ وزیر خان کی مسجد سے زیادہ خوبصورت نہ ہو، لیکن یقیناً یہ شہر کی پہچان ہے اور غالباً شہر میں مغلوں کی تعمیر کردہ عظیم عمارات میں سے اختتامی ہونے کی نمائندگی کرتی ہے۔

مغلوں کے آخری عظیم شہنشاہ اورنگ زیب کے حکم کے تحت 1084 ہجری میں تعمیر کی گئی۔ اس مسجد کی تاریخ میں بے شمار عجیب وغریب تغیر وتبدل آتے رہے ہیں۔ اورنگ زیب کے ہندوستان کے شہنشاہ بننے سے پہلے اس کے باپ شاہ جہان نے اس کے بھائی داراشکوہ کو، جس کے نام پر شاہدرہ ہے (یا درست طور پر شاہ دارا)، لاہور کا حکمران یا شہزادہ مقرر کیا تھا۔

وہ ایک بے حد تعلیم یافتہ شخص تھا اور شاعری اور تصوّف میں گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کی صوفی بزرگ میاں میرؒ سے گہری عقیدت کا عام شہرہ تھا۔ شاہ دارا نے پہلے اکبری دروازے کے بیرون مشہور چوک دارالشکوہ تعمیر کرایا اور پھر وہاں سے لے کر حضرت میاں میرؒ کے مزار تک جانے کے لیے اس نے سرخ رنگ کے پتھروں والا چوڑا پیدل راستہ تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا۔

اس کا ارادہ تھا کہ وہ ہر صبح نماز ادا کرنے کے بعد ننگے پاؤں چل کر حضرت میاں میرؒ کے مزار پر ''فاتحہ'' خوانی کے لیے جایا کرے گا۔ اس شاہی پیدل راستے کے لیے وسیع پیمانے پر درکار سرخ پتھر جمع کر لیا گیا تھا اور تعمیر شروع ہوگئی تھی۔ منصوبہ یہ تھا کہ اس راستے کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ فوارے، درخت اور پانی کے تالاب ہوں گے۔ غالباً یہ دنیا بھر میں، یا اس وقت تک معلوم دنیا میں، سب سے زیادہ بے نظیر پیدل راستے کی تعمیر کا منصوبہ تھا۔

ابھی کام شروع ہوا ہی تھا کہ اورنگ زیب نے اپنے باپ کو قیدی بنا لیا اور اپنے بھائی دارالشکوہ کو قتل کرا دیا۔ پھر اس نے اپنے ''دودھ شریک بھائی''، فدائی خان کوکا کو، کیونکہ اورنگ زیب کو فدائی خان کی ماں نے بچپن میں دودھ پلایا تھا، اور ''کوکا'' ترکی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے ''دودھ پلانا''، حکم دیا کہ دارالشکوہ کے

پیدل راستے کی تعمیر کے لیے جمع شدہ سارا سرخ پتھر وہاں سے اٹھالے اور اس کو قلعۂ لاہور کے بالمقابل ایک مسجد کی تعمیر میں صَرف کرے۔

چنانچہ فدائی خان کی زیرِنگرانی بادشاہی مسجد کی تعمیر ہوئی۔ یہ خصوصی حکم جاری کیا گیا کہ یہ مسجد دہلی کی مشہور جامع مسجد سے وسیع ہونی چاہیے اور بہترین کاریگر مہیا کیے جائیں تاکہ مسجد اس کی زندگی ہی میں مکمل ہو سکے۔ نتیجہ ظاہر ہے ایک نہایت نفیس و نادر مسجد کی شکل میں برآمد ہوا۔ لیکن مسجد کے مکمل ہوتے ہی انتہائی مغربی جانب والا مینار لاہور میں آنے والے ایک زلزلے کے بعد زمین بوس ہو گیا۔

اس واقعہ پر ایک روایتی قصہ گھڑ لیا گیا کہ یہ مشیت ایزدی کی جانب سے دارالشکوہ کے قتل کا انتقام تھا۔ مینار کی مرمت کر دی گئی لیکن پھر ایک اور زلزلہ آ گیا۔ یہ واقعہ لاہور کے عوام کے ذہنوں پر دارالشکوہ کے ''ولی صفت عزائم'' نقش ہونے کے لیے کافی تھا۔ بہت سے لوگ اسے حضرت میاں میرؒ کا انتقام قرار دیتے تھے، لیکن یہ سب اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو آئندہ پیش آنے والا تھا۔

اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ہر طرف شورش پھیل گئی اور مسجد میں آنے والے نمازیوں کی تعداد گھٹنے لگی اور جلد ہی نماز کے لیے مناسب تعداد جمع ہونا مشکل ہو گئی۔ اندرونِ شہر لاہور کے لوگ محض داراشکوہ سے اُلفت کی بناء پر مسجد کا رخ کرنے سے گریز کرتے تھے۔ 1799ء میں سکھوں کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے وقت تک مسجد ویران ہو چکی تھی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے فوری طور پر اسے اپنے گھوڑوں کے اصطبل کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا اور جب وہ چالیس برس بعد فوت ہوا تو اس وقت اس میں ایک ہزار سے زائد اعلیٰ نسل کے گھوڑے تھے۔ ایک جانب اس نے گولہ بارود کا عارضی ذخیرہ بنا لیا تھا اور ابتدائی طور پر بہت سے سکھ سپاہی، جنہوں نے لاہور فتح کیا تھا، یہیں قیام پذیر رہے۔

چنانچہ اگلے پچاس برس تک بادشاہی مسجد تباہی کی حالت میں رہی۔ اسے گھوڑوں کے سموں اور سپاہیوں کے بوٹوں تلے روندنے اور لاہور دربار کی خالصہ فوج کے مفت خوروں کی شراب کی محفلوں کے لیے استعمال کیا جاتا رہا۔ مینارکو، جن پر خوبصورت سفید سنگِ مرمر کے گنبد تھے، نقصان پہنچایا گیا۔ اسی طرح بہت سے سرخ پتھروں کا بھی یہی حال کیا گیا۔ جلد ہی لاہور کی عظیم ترین مسجد ایک ایسے ڈھانچے کی صورت اختیار کر گئی جس کا خوبصورت بیرونی رُخ عریاں کر دیا گیا ہو۔ مہاراجہ نے مسجد کے باقی ماندہ تینوں میناروں کو سلامتی اور تحفظ کی وجوہات کی بناء پر جزوی طور پر مسمار کرا دیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد اگلے دس برسوں میں بہت ہی بُرا وقت دیکھنے میں آیا۔ ایک بار جب پٹیالے کا مہاراجہ شیر سنگھ 1841ء میں جب مہارانی جنداں سے سکھ تخت چھیننے کے لیے حملہ آور ہوا تو اس

نے 143 فٹ بلند میناروں کا جو کچھ بچا کھچا حصہ تھا، اس پر توپیں نصب کر کے قلعہ لاہور پر، جہاں مہارانی جنداں مقیم تھی، گولے برسانے شروع کر دیئے۔

اس کے جواب میں رانی جنداں کے توپچیوں نے مسجد پر گولے برسانے شروع کر دیئے۔ تین دن اور تین راتوں تک گولہ باری جاری رہی۔ مسجد کے فرش کو شدید نقصان پہنچا اور اطرافی عمارات بھی زد میں آئیں۔ یہ تجویز بھی دی گئی کہ سکھوں کے آئندہ تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے اسے شہید ہی کر دیا جائے۔

لیکن پھر چند برس بعد جب سندھیانوالہ سرداروں نے قلعہ لاہور پر قبضہ کیا اور راجہ ہیرا سنگھ نے قلعے کا محاصرہ کر لیا تو مسجد کو ایک بار پھر قلعہ پر گولہ باری کے لیے استعمال کیا گیا اور جواباً قلعے کے اندرون سے توپچیوں نے گولے داغے۔ چنانچہ مسجد ایک تحریر کے مطابق ڈھانچہ بن کر رہ گئی۔ ایک اور تحریر میں اس کی صورتِ حال بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ''جیسے مہاراجہ رنجیت سنگھ کا چیچک زدہ گڑھوں والا چہرہ ہو جو خیر سے کانا بھی تھا۔'' ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ 1840ء میں ایک اور زلزلے نے مسجد کو آلیا۔ داراشکوہ کی بددعا یا میاں میرؒ کی، جو چاہے کہہ لیں، لوٹ آئی تھی۔

جب برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی خالصہ حکومت کے مکمل خاتمے سے قبل لاہور آئی تو انگریزوں نے لاہور کے مسلمانوں کے احساسات کی عزّت کو ترجیح دی۔ جنہوں نے سکھ راج کو ختم کرانے میں انگریزوں کی قابلِ ذکر مدد کی تھی۔ انگریزوں نے مسجد سے گھوڑوں اور گولہ بارود کا صفایا کر دیا۔ انہوں نے 1856ء میں حضوری باغ میں اتوار کا مذہبی اجتماع منعقد کیا۔ سر جان لارنس نے جو انگریزی افواج کو مسجد سے دُور رکھنے میں وسیلہ بنا تھا، مسجد کا قبضہ لاہور کے مسلمانوں کو واپس دِلوا دیا۔

اس دستاویز پر لاہور کے 70 نہایت مؤثر مسلمانوں اور کمپنی کے ترجمانوں نے دستخط کیے۔ اس کے اوّلین پہروں کو یہاں نقل کرنے کی ضرورت ہے۔ ''ہر گاہ کہ پچھلے زمانوں سے بادشاہی مسجد جو قلعہ لاہور میں واقع ہے مسلمانوں کی عبادت گاہ کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے اور شاہی فرامین کی رُو سے سیّد بزرگ شاہ ولد قاضی غلام شاہ کے آباؤ اجداد، اس مسجد کے متولی اور امام رہے ہیں۔ اس لیے سیّد بزرگ شاہ کو اس مسجد کا متولی اور امام مقرر کیا جاتا ہے۔''

چنانچہ 1856ء میں مسجد مسلمانوں کو واگزار کر دی گئی اور اس کے بعد اس کی ایک لمبے عرصے تک تعمیرِ نو ہوتی رہی۔ یہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ ریکارڈ کے مطابق برطانوی حکومت نے وقتاً فوقتاً مسجد کی مرمت کے لیے قابلِ ذکر رقومات کا عطیہ بھی دیا۔ بااثر ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں نے بھی اگلے 80 برسوں میں معقول رقوم کے عطیات دیئے۔ لیکن بہت بڑی مقدار میں رقوم کی فراہمی لاہور کے غریب لوگوں کی جانب سے تھی۔

ایک زمانہ تھا جب مسجد کو ''چوانی نکاح'' (ہر نکاح پر چار آنے کا ہدیہ) کہا جاتا تھا۔ یہ اُن شادیوں پر

ٹیکس تھا جو مسجد میں منعقد ہوتی تھیں اور تمام رقم اس کی مرمت پر صرف کی جاتی تھی۔ یہ جو آج ہم دیکھ پا رہے ہیں یہ 140 برس سے زائد عرصے پر محیط بحالی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ جس کے پتھر دارا شکوہ لایا تھا، جو سکھوں نے چوری کر لیے اور جنہیں جزوی طور پر لارنس نے بازیاب کیا۔ اور اب حتمی صورت میں حکومتِ پاکستان نے اس کی اصلی شان کو بحال کیا ہے۔ ہو سکتا ہے اگر صرف ایک مثالی سرخ پتھر یہاں سے اکھاڑ کر حضرت میاں میرؒ کے مزار پر رکھ دیا جاتا تو دارا شکوہ کی بے چین روح کو قرار آ جاتا، شاید!

●○●○●○●

شہر کی قدیم ترین مسجد کی تلاش

پچھلے ایک ہزار برس سے بھی زائد عرصے میں لاہور میں اَن گنت مساجد کی تعمیر ہوتی رہی ہے جو بعد ازاں شہید بھی ہوئیں اور ان کی از سرِ نو تعمیر بھی ہوئی۔ ان کی تعداد کئی گنا بڑھتی رہتی ہے لیکن حقیقتاً لاہور کی سب سے قدیم ترین مسجد کونسی ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا کوئی دوٹوک جواب نہیں ملتا، لیکن مبینہ ثبوت بے حد دلچسپ ہیں۔

باضابطہ سرکاری رودادوں کے مطابق جب 1025ء میں اندرون شہر لاہور اور اس کے گارے سے تعمیر شدہ قلعے کو سلطان محمود غزنوی نے فتح کیا تو اس نے قلعہ لاہور کے اندر ایک مسجد اور ایک مینار تعمیر کیے۔ اس مسجد کا اب اتا پتا نہیں ملتا۔ اپنی فتح منانے کے لیے اس نے ایک الگ محلّہ قائم کیا جو بعد ازاں عرب محلّہ کہلایا۔ اس محلے میں اوّلین مسجد کی تعمیر ہوئی جس کا نام خشتی مسجد رکھا گیا۔ اس مسجد کا ٹھیک محلِ وقوع نہیں دیا گیا، لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ یہ موجودہ چونا منڈی کے آس پاس ہی تھی۔ غزنوی دورِ حکومت 1193ء تک جاری رہا لہٰذا کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ مسجد کب تعمیر ہوئی تھی۔

پھر ہمارے پاس ایک اور اوّلین مسجد موجود ہے جسے بھاٹی دروازے کے عین بیرون سیّد ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری نے تعمیر کی تھی، جنہیں عرفِ عام میں داتا گنج بخش کہتے ہیں اور جو لاہور کے سرپرست ولی ہیں۔ ان کی تصنیف ''کشف المحجوب'' میں لکھا ہے کہ ان کی وفات 1107ء میں ہوئی اور یہ کہ انہوں نے اپنی حیات ہی میں بھاٹی دروازے کے عین بیرون ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کی تھی۔ یہ مسجد بعد ازاں صدیوں تک قبلے کی درست سمت متعین کرنے کے لیے بطور معیار رہی ہے۔ اصلی مسجد شہنشاہ اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں عظیم سیلابوں کی نذر ہو کر مکمل طور پر شہید ہو گئی تھی اور اسے از سرِ نو تعمیر کرنا پڑا۔ اس وقت سے یہ تعمیرِ نو جاری و ساری ہے اور حال ہی میں ایک عظیم الشان مسجد کی تکمیل ہوئی ہے۔ چنانچہ داتا صاحب کی اصلی مسجد کا زمانہ بلاخوف و خطر 1095ء سے 1105ء کے مابین کسی برس میں متعین کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ جگہ سب سے قدیم ہو سکتی ہے لیکن اصلی عمارت نہیں۔

پھر داتا گنج بخشؒ کے ساتھ ساتھ غزنوی دور میں سیّد اسمٰعیل بخاری نامی ایک اور بزرگ ولی بھی لاہور تشریف لائے تھے۔ ان کا لاہور ہی میں 1057ء میں انتقال ہوا اور انہیں ہال روڈ سے نکلنے والی ایک سڑک پر دفن کیا گیا جہاں آج کل کیتھیڈرل سکول اور چرچ واقع ہیں۔ ان کی قبر کے آثار موجود ہیں اور سکول کی ایک نکڑ میں ایک کمرے پر مشتمل مسجد بھی موجود ہے۔ اگر یہ درست ہے، اور ایک تحقیقی مقالے میں یہی دعویٰ کیا گیا ہے، تب یہ بوسیدہ کمرہ ہی شاید لاہور کی قدیم ترین مسجد ہے جو 1050 کے لگ بھگ تعمیر ہوئی تھی۔

چنانچہ یہی تین مساجد کی جگہیں، لاہور اور اس کے نواحی علاقے میں، اصلی اوّلین ترین مساجد ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہیں۔ غالباً ان تینوں مساجد میں سے کوئی بھی اپنی تعمیر کے وقت سے اصلی حالت میں قائم نہیں ہے۔ لیکن داتا گنج بخشؒ مسجد بلاخوف وخطر یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ اس کا وجود اصلی جگہ پر ہی ہے۔ اوّلین مسجد بلاشبہ قلعہ لاہور کے اندرون ہی تعمیر ہوئی تھی اور روایت کے مطابق جب لاتعداد منگول گھڑ سوار لاہور میں سے اسے روندتے ہوئے گزرے تو ہر شے کو تباہ و برباد کر گئے۔ شہنشاہ اکبر نے قلعہ لاہور میں محمود غزنوی مسجد کو از سرِ نو تعمیر کرایا۔ ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ آج اس مسجد کا سراغ نہیں ملتا۔

لیکن اکبر کے اوّلین دورِ حکومت میں بھاٹی دروازے کے اندرون، لکڑ ہارا بازار میں، ایک مسجد کی تعمیر کی گئی جو اونچی مسجد کہلانے لگی۔ یہ مسجد آج بھی اپنی اصلی حالت میں استادہ ہے۔ اسی دور میں اکبر نے اپنی والدہ مریم زمانی کی یاد میں ایک مسجد 1614ء میں تعمیر کرائی تھی یہ مسجد آج بھی قلعہ لاہور کے مشرق کی جانب موجود ہے اور اسے بیگم شاہی مسجد کہتے ہیں۔ یہ دو مساجد لاہور اور نواحی علاقے میں اپنے اصلی مقامات پر وجود پذیر ہونے اور قدیم ترین ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہیں۔ ان دونوں میں سے پہلے کس کی تعمیر ہوئی، البتہ اس مسئلہ پر اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ غالباً کوئی سائنسدان ہی کاربنی تعینِ زمان تجربات کر کے حالیہ لاہور کی اصل قدیم ترین مسجد کے وجود کا تعین کر سکتا ہے۔

لیکن لاہور کی قدیم ترین مسجد کے لقب کی دعویٰ دار ایک اور بھی ہے۔ رنگ محل سے نکلتے ہی خواجہ ایاز کے مقبرے کے نزدیک اور کوچہ چابک سواراں کے مشرقی جانب ایک قبر ہے، جسے گنج شہیداں کہتے ہیں۔ عوامی روایت یہ ہے کہ یہ اُن اوّلین مسلمانوں کی اجتماعی قبر ہے جو لاہور میں اسلام کی تبلیغ کرنے پر شہید کر دیئے گئے تھے۔ اس کے نزدیک ہی ایک چھوٹی سی مسجد ہے جسے مسجد گنج شہیداں کہتے ہیں اور روایت کے مطابق یہ اندرون شہر کی قدیم ترین مسجد ہے۔ لیکن پھر چینیاں والی مسجد بھی تو ہے، جو اصلاً 1078ء میں تعمیر ہوئی تھی اور ہر بار جب لاہور کو نذرِ آتش کیا گیا تو اسے از سرِ نو تعمیر کرنا پڑا۔ یہ اپنی اصلی جگہ پر قائم ہے اگرچہ عمارت کا سال ہرگز 1078ء نہیں ہے، لیکن یہی وہ مقام ہے جہاں یہ بحث شروع ہو جاتی ہے کہ مسجد کے قطعی زمانۂ تعمیر کے تعیّن کے لیے ٹھوس سائنسی ثبوت کی ضرورت ہے۔

چنداور بھی نہایت قدیم مساجد ہیں جن کا ذکر دلچسپی کے لائق ہے۔ایک مسجد سید مٹھے کی قبر کے پاس ہے، جس کا 1263ء میں انتقال ہوا تھا۔ پھر کشمیر بازار میں پیر بلخی کی قبر کے پاس ایک مسجد ہے۔اس مسجد کا بھی ایک قصہ ہے کہ جب سنہری مسجد کی تعمیر ہوئی تو مسجد کی گنجائش نکالنے کے لیے کشمیری بازار کا دوبارہ تطبق کیا گیا تھا تو اِس سے مسجد صوفی والی متاثر ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مسجد اسی زمانے میں تعمیر ہوئی تھی اور پرانی مسجد کی بنیادوں پر ہی دوبارہ استوار کی گئی تھی۔ اس امر میں تحقیق کی ضرورت ہے کہ تعین کیا جائے کہ وہاں اصلاً کیا عمارت تھی۔ چونکہ بنیادیں اصلی ہیں، اس لیے اس کی تاریخ اور اصلیت جاننا دلچسپ ہوگا۔ ہوسکتا ہے یہی ہماری قدیم ترین مسجد ہو۔

لاہور میں قدیم ترین مسجد کی تلاش میں ہمیں اس مسجد کے دعویٰ کو بھی زیرِغور رکھنا ہوگا جو سیّد یعقوب زنجانی کی قبر کے پہلو میں ہے، جو صدر شاہ زنجانی بھی کہلاتے ہیں۔ وہ ان بہت سے مبلّغین میں سے تھے جو غزنوی دور میں لاہور آئے تھے۔ایک چھوٹی سی مسجد ان کے مزار کے پاس لیڈی ایچی سن ہسپتال کے عین عقب میں وجود پذیر ہے۔اگرچہ آج کل تعمیر شدہ مسجد وسیع ہے لیکن مسجد کی اصل شناخت کے کچھ حصے اب بھی موجود ہیں۔اس کے زمانے کا کوئی ذکر نہیں ملتا لیکن یہ قدیم ترین وجود پذیر مسجد ہونے کی ایک سنجیدہ دعویٰ دار ہوسکتی ہے۔ایک اور زنجانی صاحب بھی ہیں لیکن وہ بعد کے زمانے کے ہیں۔شہنشاہ حسین زنجانی جو مصری شاہ میں کھوئی چاہ میراں میں دفن ہیں۔

قدیم ترین مساجد کی متوقع صف بندی کی صورت کے پیشِ نظر قدیم ترین ہونے کی تعریف میں یہی شمار کرنا ہوگا کہ مسجد کی اپنی عمارت کا وجود پذیر ہونا لازم ہو، بے شک یہ کتنی ہی انحطاط پذیر کیوں نہ ہو۔ اپنی عمارت کے وجود پذیر ہونے کے مقابلے میں مقام کی اصلیت کوئی معنی نہیں رکھتی۔اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو لگتا ہے کہ اگر سائنسی طور پر کہولت کا تعین ہوسکے تو ہال روڈ والی شاہ اسمٰعیل بخاریؒ کی چھوٹی سی مسجد کی عمارت اصلی ہے تو پھر بلاخوف وخطر اسے نَقیب قرار دیا جاسکتا ہے۔اگر نہیں تو پھر ہر کس وناکس کی تحقیق کے لیے شہادت تو موجود ہے ہی۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہمارے محققین سائنسی ضابطۂ عمل سے لیس ہوکر ہماری قدیم ترین مساجد اور دیگر عمارات کی تلاش اور سراغ لگانے میں ہماری مدد کریں۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ وہ جو عرش پر براجمان ہے وہ یہ دیکھ کر نہایت خوش ہوگا کہ اس کی مخلوق میں سے کون ہے جو لاہور کے لاکھوں حل طلب معاملات میں سے جو اس نے ہمیں عطا کیے ہیں، صرف ایک ہمارے لیے حل ڈھونڈھ دے۔

●○●○●○●

لاہور کا اوّلین انگریزی مِیڈیئم سکول

انگریزوں کے لاہور فتح کرنے کے ساتھ ہی پہلا انگریزی کے ذریعے تعلیم دینے والا سکول بھی وجود میں آ گیا۔ یہ ستم ظریفی کی بات ہے کہ پہلا انگریزی میڈیم سکول انگریزوں نے نہیں بلکہ ایک امریکی مسیحی مبلّغ، پادری سی ڈبلیو فارمن نے قائم کیا تھا۔ وہی شخص جس نے بعد ازاں لاہور میں فارمن کرِسچن کالج (ایف سی کالج) کی بنیاد رکھی۔

پادری ڈاکٹر سی ڈبلیو فارمن نے اپنے ایک ہمکار جان نیوٹن کے اشتراک سے، سکھ فوج کی شکست کے چند ماہ کے اندر اندر بھاٹی دروازے کے بیرون ایک ویران فوجی بیرک میں جہاں آج کل ضلع کچہری لاہور ہے، مقامی انتظامیہ کی مدد سے 19 ر دسمبر 1849ء کو ایک انگریزی میڈیئم سکول قائم کر لیا۔ ڈلہوزی کے مارکوئیس اور ہندوستان کے گورنر جنرل، جیمز اینڈریو برؤن رَمزے (1856-1847ء) نے اس مقصد کے لیے -/4,238 روپے بطور عطیہ عنایت کیے۔ یہ لاہور کا اوّلین انگریزی ذریعۂ تعلیم والا سکول تھا۔

اکتوبر 1852ء میں لاہور میں امریکی مسیحی تبلیغی مرکز نے، جس کا سربراہ پادری سی ڈبلیو فارمن تھا، برطانوی کمانڈر سے رنگ محل کے اندرون، جو شاہ جہان کے زمانے میں تعمیر کردہ تاریخی عمارت تھی، ایک سکول قائم کرنے کے لیے اجازت طلب کی۔ یہ عمارت ابتدائی طور پر بطور عدالت استعمال ہوتی رہی۔ سکھوں نے اسے پولیس چوکی یا تھانے کی حیثیت سے استعمال کیا۔ جب انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو پادریوں نے رائے دی کہ ''اب وقت آ گیا ہے کہ اسے کسی نیک کام کے لیے استعمال کیا جائے۔'' ایسٹ انڈیا کمپنی کے انتظامیہ بورڈ نے ایک مالیاتی تشخیص کنندہ کو بھیجا جس نے عمارت کی قیمت چار ہزار روپے لگائی۔ ''اس سے کم ہرگز نہیں۔ اگر اس کی تاریخی حیثیت کو مدنظر رکھیں تو اس کی قیمت کہیں زیادہ ہونا چاہیے تھی۔ زمین کی قیمت کا تخمینہ -/627 روپے لگایا گیا، لیکن قدیم عمارت کے ساز و سامان کی قیمت زمین کی قیمت سے پانچ گنا زیادہ تھی۔''

لیکن پادری فارمن نے صرف ایک ہزار روپے کی رقم ادا کی اور کمپنی نے اس تبصرے کے ساتھ قبول

کرنے کا فیصلہ کرلیا کہ ''نیک مقصد کے پیشِ نظر معاشی قیمت کی چنداں اہمیت نہیں رہتی۔'' چنانچہ اوّلین ترین انگریزی ذریعۂ تعلیم والا سکول قائم ہوگیا۔ اس سکول کو پھلنے پھولنے کے ساتھ شہرت بھی حاصل ہوئی اور جلد ہی ترقی پاکر یہ ایک کالج بن گیا اور فارمن کرسچن کالج کہلایا اور پھر وہاں سے انارکلی کے بیرون نیلا گنبد منتقل ہوگیا۔ بعدازاں یہی کالج لاہور کی نہر کے کنارے موجودہ جگہ پر منتقل ہوگیا۔

بہرحال ایسٹ انڈیا کمپنی نے محسوس کیا کہ ان کے ملازمین کے یورپی اور یوریشیائی بچوں کے لیے ایک سکول کی ضرورت تھی جو اندرون شہر میں ہونے والی کارروائیوں سے الگ تھلگ رہے۔ چنانچہ انہوں نے ''لاہور ہائی سکول'' کے لیے سرمایہ مہیا کیا۔ یہ سکول اندرون قلعہ لاہور میں اگست 1858ء میں قائم ہوا، امریکی عیسائی تبلیغی مرکز کے لاہور میں سکول کے کام شروع ہونے کے عین نو برس بعد۔ لاہور کے چیپلن، پادری سی سلوگٹ اس سکول کے سربراہ مقرر ہوئے اور اس میں ابتدائی طور پر 20 لڑکیوں اور 24 لڑکوں نے داخلہ لیا۔ زیادہ تر طلبہ کمپنی کے ملازمین اور فوجیوں کے تھے یا ان ملازمین کے یتیم بچے جو جنگوں میں مارے گئے تھے یا مختلف وبائی امراض سے فوت ہوئے تھے، جنہوں نے برطانوی دور کے ہندوستان کو دِق کر رکھا تھا۔

لاہور ہائی سکول پھر انارکلی کے نزدیک ایک پرانی فوجی بیرک میں منتقل ہوگیا وہاں سے ٹھکانہ بدل کر یہ لوئر مال پر ''پیپل ہاؤس'' کے نزدیک ایک مکان میں منتقل ہوگیا۔ پھر اس سکول کے لے ٹیمپل روڈ پر قدیم فرامشن ہال کے نزدیک ایک نئی عمارت تعمیر کی گئی۔ پادری ای ایچ گلیوَر، ایم اے کیمرتج، اس سکول کے سربراہ تھے۔ آج دونوں قدیم فرامشن عمارت کا اور لاہور ہائی سکول کا کہیں وجود نہیں ملتا۔ اوّل الذکر وہاں سے منتقل ہوکر مال روڈ اور کیوئینز روڈ کے کونے پر شاہ دین بلڈنگ کے بالمقابل موجودہ عمارت میں چلی گئی، جس پر بعدازاں حکومتِ پاکستان نے قبضہ کر کے پراسرار وجوہات کی بناء پر پابندی عائد کردی، جو خود بھی ایسی ہی تھی۔ اس کی بحالی کا مقدمہ لاہور ہائی کورٹ میں اب بھی زیرِالتوا ہے۔

لیکن لاہور ہائی سکول بالکل ہی ختم ہوکر رہ گیا، جب اسے مری کے نزدیک گھوڑا گلی کے لارنس کالج میں ضم کرنے کا فیصلہ صادر ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرکاری روداد کے مطابق ''لاہور ہائی سکول کے اساتذہ بہترین تھے جنہیں ہندوستان بھر سے حاصل کیا گیا تھا۔'' بہرحال اس سکول کے لڑکیوں کے حصے کو مال روڈ پر ہی واقع کیتھڈرل ہائی سکول میں منتقل کردیا گیا تھا۔

یہ دونوں سکول رنگ محل مشن سکول جسے امریکیوں نے قائم کیا تھا اور لاہور ہائی سکول جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے انگلستان کے چرچ کی مدد سے قائم کیا تھا، ہی بہترین سکول تھے جن کا ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ دیگر منصوبوں کے مطابق مزید سکول بھی قائم کیے گئے۔ مثال کے طور پر پرائمری، مڈل اینگلو ورنیکلر سکول بھاٹی دروازے کے بیرون 1883ء میں تعمیر کیا گیا جس کا مقصد پنجاب بھر سے انگریزی ذریعۂ تعلیم کے

سکولوں کے اساتذہ کی تربیت تھا۔

بہر حال عینی طیف کے دوسرے کنارے اشرافیہ کے لیے نومبر 1886ء میں پنجاب چیفس کالج قائم کیا گیا۔ یہ وسیع و عریض سکول ایک نقشے کے مطابق تعمیر کیا گیا جسے لاک وڈ کپلنگ اور میو سکول آف آرٹس (موجودہ نیشنل کالج آف آرٹس) کے بھائی رام سنگھ نے بنایا تھا۔ وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن نے فیصلہ کیا کہ اسے آئندہ ایچی سن کالج لاہور کہا جائے۔

اس طریق سے انگریزی ذریعہ تعلیم والے سکول لاہور اور پنجاب بھر میں جگہ جگہ کھلنے شروع ہو گئے۔ مرکزی خیال یہی تھا کہ انگریز راج کے لیے "دیسی صاحب" پیدا کیے جائیں۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ راجہ رنجیت سنگھ نے مؤثر طریقے سے انگریزوں کو روکے رکھا حتیٰ کہ پنجاب میں مسیحی مبلّغین کو بھی داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ اس نے امریکی مسیحی مبلغ کو برطانیہ کے ساتھ ملحق سرحد، لدھیانہ میں 1819ء میں ایک چھوٹا سا مرکز بنانے کی اجازت دی۔ غالباً اس نے امریکیوں میں برطانوی مفادات کو بے اثر کرنے کی قوت دیکھ لی تھی۔ اس کی وفات کے دو برس کے اندر اندر امریکی مسیحی مرکز لاہور پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ بقیہ تاریخ کا حصّہ ہے۔

●○●○●○●

ایک عظیم لائبریری کا انحطاط

جب لاہور کے صوبیدار یا گورنر، نواب وزیر خان نے شہنشاہ شاہ جہان کے دور میں لاہور کے اندرون شہر میں 1634ء میں مشہور اور بے نظیر مسجد کی تعمیر شروع کی تو اس کے ساتھ ہی اس نے اُتنا ہی خوبصورت باغ لوہاری دروازے کے مشرقی جانب آدھے میل کے فاصلے پر تعمیر کرانا شروع کر دیا جسے باغ وزیر خان کہا جاتا تھا۔

جب اس سے دریافت کیا گیا کہ وہ شہنشاہ کے زیرِ تعمیر مشہور و معروف شالامار باغ کی نقل کیوں اتار رہا ہے تو اس نے جواب دیا۔ ''میں تو ایک عاجز صوبیدار ہوں۔ مسجد تو اللہ تعالیٰ کے نادیدہ حسن کو سمجھنے کی انسانی کوشش ہے اور یہ چھوٹا سا باغ اللہ تعالیٰ کے حسنِ فطرت کو سمجھنے کی ایک انسانی کوشش ہے۔'' بے شمار ماہرین کی رائے ہے کہ اصلی باغ وزیر خان اساطیری شالامار باغ سے کہیں زیادہ خوبصورت باغ تھا۔ یہ تو پھر تقریباً بادشاہی مسجد اور مسجد وزیر خان کا باہمی موازنہ کرنے والی بات ہوگئی۔ لیکن آج اس باغ کا نام و نشان تک باقی نہیں۔ اس نادر اور بے نظیر تخلیق کی صرف ایک نشانی بارہ دری وزیر خان باقی بچی ہے۔ ہر مرتبہ جب آپ مال روڈ پر عجائب گھر یا پنجاب یونیورسٹی کے اولڈ کیمپس کے سامنے سے عبور کرتے ہیں تو ہمارے قدم وہاں پڑتے ہیں جہاں کبھی باغ ہوا کرتا تھا۔ بارہ دری آج بھی لاہور کے اس عظیم معمار کے بین ثبوت کے طور پر قائم ہے۔ یہ بالآخر برصغیر کی عمدہ ترین لائبریری کے نقطۂ آغاز کا سبب بنی۔

پنجاب پبلک لائبریری کا قصہ ایسا ہے جو بار بار سنایا جانا نہایت ضروری ہے اور اس سے سبق اخذ کرنا چاہیے اور ٹھوس کارروائی کرنی چاہیے، نجی اور سرکاری اہلکاروں کو، اداروں کو، کیونکہ یہی سرگرمیاں بالآخر تاریخ میں ہمارا مقام متعین کریں گی۔ بارہ دری وزیر خان نے 1634ء سے آج تک ہمارے شہر کی تاریخ کو افشاں دیکھا ہے۔ مغلوں کے زوال، افغانیوں کی لوٹ مار اور عصمت دری، سکھوں نے شدید اذیت سہہ کر اقتدار حاصل کر لیا۔

ان کے نقطۂ عروج کا آغاز بارہ دری وزیر خان سے ہوا جہاں گوجرانوالہ کا مشتاق سکھر چکریہ سردار اپنی فوجوں سمیت 1799ء میں لاہور پر حملے سے پہلے منتظر تھا۔ بارہ دری نے چالیس برس تک لوٹ مار کو دیکھا

کیونکہ فرانسیسی تربیت یافتہ فوجِ خاص کے اعلیٰ درجے کے سکھ افسران کے لیے اس کی عمارت کو بطور گیریژن استعمال کیا جارہا تھا۔ باغ کے فواروں اور پھولوں کی لوٹ مار کی جا چکی تھی۔

پھر انگریز آ گئے اور انہوں نے بھی عارضی پڑاؤ اسی بارہ دری میں ڈالا۔ جب انگریزوں نے 1849ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا تو اس بارہ دری کا پہلے پہل استعمال بطور دفتر آبادکاری ہوا۔ جس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی پنجاب میں اپنے اقتدار کو وسعت دے رہی تھی اس کے بعد اسے بطور تار گھر استعمال کیا گیا جو شاہدرہ کے مقام پر دریائے راوی میں بارہ دری کامران خان کے ایک مقام سے براہِ راست مواصلت میں تھا۔ جب استحکام مکمل ہو گیا اور تہذیبی شائستگی لوٹ آئی تو اسے عجائب گھر قائم کرنے کے لیے بطور اوّلین عمارت استعمال کیا جانے لگا اور جب عین اس کے عقب میں عجائب گھر کی اپنی خوبصورت عمارت تعمیر ہو گئی تو اسے وہاں منتقل کر دیا گیا۔

انگریزوں نے پھر یہاں ''انارکلی بک کلب'' کا آغاز کر دیا اور بورڈ کے مطابق، جو گولڈنگ کی ایک تحریر ہمیں مطلع کرتی ہے کہ ''یہ صرف یورپی لوگوں کے لیے'' تھی۔ جب لارنس ہال کی تعمیر ہوئی اور لاہور اور میاں میر انسٹیٹیوٹ کا حصہ بنا، جو اَب لاہور جمخانہ کلب کہلاتا ہے، تو لائبریری وہاں منتقل کر دی گئی۔ چنانچہ بارہ دری کی عمارت ایک بار پھر استعمال کے لیے میسر ہو گئی۔ اس موقع پر پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر چارلز ایچی سن نے خواہش ظاہر کی کہ بارہ دری میں لاہور کی زبردست تاریخی اور ادبی روایات کی عکاس ایک لائبریری تعمیر کی جائے اور اس کا نام پنجاب پبلک لائبریری رکھا گیا۔ اس منصوبے کے لیے تشکیل دی گئی کمیٹی کا پہلا اجلاس 12 رنومبر 1884ء کو فرانسیسیوں کی تعمیر کردہ سیکرٹریٹ کی عمارت میں ہوا۔ سر چارلز نے اپنی ذاتی مکمل لائبریری عطیے کے طور پر عطا کر دی۔ ان جیسے دیگر صاحبان نے بھی ایسا ہی کیا۔

منشی نول کشور اور سردار عطر سنگھ کی معروفِ زمانہ کتابیں اور فقیر سیّد جمیل الدین کی وسیع اور کمیاب کتابوں کا ذخیرہ بھی لائبریری کو وصول ہوا۔ یہ نہایت مؤثر آغاز تھا۔ 21 ردسمبر 1885ء کو سر چارلز ایچی سن نے لائبریری کا باضابطہ افتتاح کیا۔

لیکن سر چارلز کا عظیم کارنامہ یہ تھا کہ اس نے اس امر کو یقینی بنایا کہ یہ نوکرِ شاہی کے پنجوں سے محفوظ رہے۔ لائبریری کو خیراتی ایکٹ کے تحت رجسٹر کرایا گیا اور باقاعدہ اس بات کا اعلان کیا گیا کہ ''اس کے مقاصد غیر منافع بخش'' ہوں گے۔ اس واحد اقدام نے اس کی کامیابی پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اس بے نظیر لائبریری کو، جسے شمالی ہندوستان کی بہترین لائبریری قرار دیا گیا، عظیم لائبریرین حضرات کی سربراہی نصیب ہوئی۔

1886ء میں عظیم شخصیت لالہ کرپارام چیف لائبریرین مقرر ہوا۔ جس نے کارگزاری کے بلند معیار قائم کیے اور رات دن کام کر کے اس امر کو یقینی بنایا کہ پورے برصغیر میں عمدہ ترین لائبریری بن جائے۔ اس نے 27 برس کے طویل عرصے تک لائبریرین کے طور پر کام کیا۔ اس کے بعد لالہ لبھارام آیا جس نے مزید آٹھ برس

1921ء تک خدمت سرانجام دی۔ اس وقت تک ان دونوں صاحبان کو ہندوستان بھر سے عمدہ ترین کتابوں اور مسودوں کے ذخیرے موصول ہو چکے تھے۔

1921ء میں ایک اور معروف لائبریرین، ودیا ساگر گورے وارا، لائبریری سے منسلک ہوا اور صرف دو برس خدمت بجا لایا۔ 1923ء میں لالہ رام لبھایا نے نشست سنبھالی اور 14/اگست 1947ء کی نصف شب تک پورے 24 برس تک بھرپور خدمات سرانجام دیں۔

اس یقین کے ساتھ کہ پاکستان کو دنیا کی ایک بہترین لائبریری ورثے میں مل سکے 1947ء میں پنجاب پبلک لائبریری کے پہلے پاکستانی چیف لائبریرین خواجہ نور الٰہی مقرر ہوئے۔ جنہوں نے 1966ء تک 19 برس خدمات سرانجام دیں۔ ان کا یہ عظیم کارنامہ تھا کہ انہوں نے نوکر شاہی کو لائبریری سے دور رکھا اور اس دوران لائبریری میں توسیع کا عمل جاری رکھا۔ جب جب لائبریری میں اضافہ ہوا تو مزید جگہ کی ضرورت پیش آتی رہی۔ 1924ء اور 1939ء میں دو نئی عمارات تعمیر ہوئیں۔ 80 برس کے طویل عرصے میں محض پانچ لائبریرین حضرات اس عظیم لائبریری کے سربراہ رہے جو اس کی ٹھوس نمود پذیری اور رخ کا بیّن ثبوت ہیں۔

تب تک ایوب خان کے مارشل لاء سے ایک نئی بیماری لاحق ہو چکی تھی یعنی سیکھنے اور علم حاصل کرنے سے نفرت۔ سوچیے تو سہی پچھلے چالیس برس کے عرصے میں لاہور میں کوئی بھی لائبریری، کسی کتابوں کی شاندار دکان کا تو ذکر ہی نہ کریں، اپنا سر بلند نہ کر سکی۔ آج پنجاب پبلک لائبریری میں تین لاکھ پچھتّر ہزار کتابوں کا وسیع ذخیرہ موجود ہے، جس میں زیادہ تر نایاب ہیں۔

مثال کے طور پر ایک مشہور کتاب ''ہندوستان: اقتدار کی منتقلی 47-1942ء'' جو بارہ جلدوں میں ہے جسے نکولس مین سرگھ نے مرتب کیا ہے، جو چیف لائبریرین صاحب کے دفتر میں موجود ہے۔ یہ اکیلی ہی کسی عظیم سرمائے سے کم نہیں ہے۔ قدیم اور نہایت نایاب نسخوں کے ذخائر کی تعداد 850 سے متجاوز ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی مالیت لازماً سرمائے سے ماپی نہیں جا سکتی۔ اس لائبریری میں اتنا کچھ موجود ہے کہ عطیہ دینے والی تنظیموں کی بھرپور کوشش ہی اس نفیس ترین ادارے کو، جو میرے ذہن کے مطابق بے راہ رو ہو چکا ہے، بچانے میں مدد دے سکتی ہے۔

لائبریری کے دھول سے اَٹے فرش پر برصغیر بھر کی نایاب کتب اور نسخے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ ہماری تاریخ ہے جسے مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اتنی رقم بھی موجود نہیں ہے کہ قدیم اور نایاب کتب کی جلد بندی کرائی جا سکے۔ موجودہ دور کے مقالات کو محفوظ کرنے کا طریقِ کار بھی موجود نہیں ہے۔ جگہ کی کمی، سرمائے اور مہارت کی قلت، اس قدیم شہر اور سرزمین کی نایاب اور حقیقی وراثت کو محفوظ کرنے کے جذبے کی تو بات ہی نہ کریں، اس المیے میں اضافہ کر رہے ہیں جسے پنجاب پبلک لائبریری کہتے ہیں۔

اصل بدمزگی اس وقت ہوئی جب اس کی تولیت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حکومتِ پنجاب نے لائبریری پر تسلط جمالیا اور اسے محکمہ ''تعلیم'' کے ماتحت کر دیا۔ بارہ دری اب بھی قائم ہے کیونکہ اب یہ اخبارات اور رسائل پڑھنے کی سہولت مہیا کرنے کے کام آتی ہے اور خاموشی سے انحطاط کو دیکھتی رہتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اب اس شہر کے جواں سال اور حساس طلبہ بھی احتجاج نہیں کرتے، محسوس نہیں کرتے، حتیٰ کہ دیکھتے بھی نہیں کہ لاہور کا ایک عظیم ادارہ آہستہ آہستہ خاموشی سے موت کی آغوش میں جا رہا ہے۔

●○●○●○●

کتابوں کے لاہوری کاتبین

انگریزوں کی 1849ء میں آمد سے قبل لاہور شہر کا اپنا کوئی چھاپہ خانہ نہ تھا۔ پہلا چھاپہ خانہ 1850ء میں لاہور پہنچا جو منشی ہرسکھ رائے کی ملکیت تھا۔ جس نے ایک انگریزی ہفت روزہ ''کوہِ نور'' کا اجرا کیا جو اس کے چھاپہ خانے کا بھی نام تھا۔ لاہور میں طباعت کا عہد شروع ہو گیا تھا۔

لیکن چھاپہ خانے کی لاہور میں آمد سے قبل لاہور کو کتابوں کی اشاعت کی دنیا میں ایک منفرد مقام حاصل تھا۔ لاہور کی ہاتھ سے لکھی ہوئی خطی کتابوں کی بڑی مانگ تھی اور تاجران ان کتابوں کو دور افتادہ ملکوں سے برآمد کیا کرتے تھے، جیسے ایران اور خراسان حتیٰ کہ استنبول اور اس سے بھی ورا۔ ان تمام ملکوں کے عجائب گھروں میں لاہور کی خطی کتابوں کو امتیازی نادر نمونوں کے طور پر محفوظ کر رکھا ہے۔ اس روایت کا قصہ سنانے کی ضرورت ہے۔

ایک زمانے میں دنیا بھر سے تجارتی قافلے لاہور پہنچا کرتے تھے۔ ان کی عمومی آرام گاہ مسجد وزیر خان کے عین مقابل ایک وسیع کھلے میدان میں ہوتی تھی۔ اس علاقے کے اردگرد لاہور کی مشہور ''کارواں سرائیں'' ہوتی تھیں۔ زمانۂ قدیم سے ان سراؤں میں سے چند ایک کے نام ''مولا بخش کی سرائے'' اور ''بابو کی سرائے'' ہیں۔ یہ جمع کردہ سامان کے ڈھیروں اور دنیا بھر کی نسلوں کے اختلاط اور نظریات کے ملاپ کا مقام تھا۔

اس میدان کے ایک جانب نخاس خانہ یا گھوڑوں کا اصطبل تھا اور اس کے قریب ہی بے شمار پانی کی ناندیں ہیں۔ آج بھی ایک ایسی کُھرلی یا پیال جو غالباً 1700ء کے زمانے کی ہے، زیرِ استعمال ہے۔ بدلتی ہوئی دنیا کے نظریات کی آمد اس مقام سے ہوتی تھی اور یہیں سے قصہ خواں یا داستان گو ظہور پذیر ہوئے تھے۔

لوگوں کے عجیب و غریب ملکوں اور مکینوں کے قصے سنانے کی مسلّمہ روایت اور رواج سے کہانی لکھنے کے کاروبار نے ترقی پائی اور لاہور ان سب میں سبقت لے گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دہلی، پشاور، ثمرقند اور بخارا میں قصہ خوانی کی روایت موجود تھی۔ لیکن ان سب مقامات پر، جو قدیم یورپ میں بھی وجود پذیر تھے، تحریر کردہ لفظ نے ادا کیے گئے لفظ کی جگہ لے لی۔ تحریری لفظ کا مطلب تھا کہ وہاں اشاعتی کاروبار کا وجود تھا اور یہ ان

لوگوں کی دلچسپی کے لیے اطلاع ہے جنہیں پڑھنے کی عادت ہے، کہ مسجد وزیر خاں کے بیرون میدان کے چاروں طرف دکانوں کا جو حصار بنا ہوا تھا اس میں دو درجن سے زائد ناشرین کتب تھے، جن کا بہت شاندار کاروبار تھا۔ ان کاروباروں کا مختصر سا ذکر ضروری ہے کیونکہ اس سے ہمیں بامعنی سراغ ملتے ہیں کہ یہاں چھاپہ خانوں کی آمد سے قبل عالموں اور کتابوں کی دنیا میں آخر لاہور کی کیا وقعت تھی۔

قدیمی لاہور کا سب سے بڑا اشاعت گھر میاں محمد بخش صحاف کی ملکیت تھا جن کے ہاں پچاس سے زائد خطاط اور کاتب تھے، جو کتابوں کی نقول تیار کر کے انہیں جلد بندی کرتے تھے۔ رزمیہ جیسے الف لیلیٰ اور بے شمار دوسری پنجابی، فارسی حتیٰ کہ ترکی کہانیاں (جب یہ روایتی ترک رسم الخط میں تحریر کی جاتی تھیں) یہیں لاہور میں لکھی جاتی تھیں۔ صحاف کی مطبوعات محض اپنی صوری خوبصورتی کی وجہ سے ہی زیادہ مہنگے نسخے بن جاتے تھے۔ روزمرہ کی اشیاء کے، جو تاجر خریدا ہی کرتے تھے، علاوہ کتابوں کا بھی زبردست کاروبار تھا اور دنیا بھر سے آئی ہوئی کتابیں خریدی جاتی تھیں۔

اس گروہ کے ساتھ ساتھ دیگر اشاعت گھر اور بھی تھے جو چراغ دین کی ملکیت تھے۔ جس نے 1815ء میں ہر روز ایک ہزار روپے یومیہ کے حساب سے کتابیں فروخت کیں جیسا کہ ایک تحریر میں درج ہے۔ اندرون شہر کی سکھوں کی ابتدائی فتح میں ایک تحریر کے مطابق ''لاہور کے کتب فروشوں کے پاس سناروں سے زیادہ دولت تھی۔ یہ حقیقت جان کر رنجیت سنگھ کو سخت دھچکا لگا تھا۔''

ایک اور تحریر کے مطابق فقیر اللہ جو ذات کا سدھو تھا، ایک اور کتابوں کے بڑے اشاعتی ادارے کا مالک تھا۔ اس نے 65 سے زائد کاتب ملازم رکھے ہوئے تھے اور اسے مذہبی کتب کے متن، جیسے قرآن پاک کے نسخے، شائع کرنے میں دسترس حاصل تھی۔ فقیر اللہ کے دستخط شدہ قرآن پاک کے نسخوں کا شمار عجائب گھر کی چند قیمتی ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔

ایک اور اشاعت گھر شیخ الٰہی بخش کی ملکیت تھا۔ اس کے ہاں بھی 60 سے زائد کاتب حضرات کام کر رہے تھے۔ وہ بھی مذہبی متن شائع کرنے میں تخصیص رکھتا تھا۔ اگرچہ چند ایک روایتی لوک کہانیوں کے نمونے بھی محض اپنی خوبصورتی کی بناء پر مشہور تھے۔ بیرونی حاشیے کی کاریگری، اعلیٰ درجے کی مہارت اور ذوق کا پتا دیتی تھی، جس کی وجہ سے الٰہی بخش کی کتابیں مشہور تھیں۔

ان تمام بے شمار اشاعت گھروں کے اپنے مخصوص جلد ساز تھے اور ان تمام خطی نسخوں کی چمڑے کی جلدیں ہوتی تھیں اور ایک خاص طرز میں کی جاتی تھیں۔ بعد ازاں ان کی نقل مغرب میں کئی ماہر جلد سازوں نے کی۔ جلد سازی میں استعمال ہونے والا چمڑا ایک خاص نوعیت اور خاص وصف کا حامل ہوتا ہے جو اسے تادیر قائم دائم رکھتا ہے۔ آج کل صرف دو خاندان ہیں جو چمڑے کی جلد سازی کے ماہر سمجھے جاتے ہیں اور دونوں ہی قرآن

پاک کے نسخوں کی جلد بندی میں ہی اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔

اگر ہم آج بھی مسجد وزیر خاں جائیں تو ہم لاتعداد قافلوں کے مناظر اپنے تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں جہاں قصہ خواں حضرات شام ڈھلے تھکے ہارے تاجروں کو وقت بیتانے میں مدد کر رہے ہوں۔ کتابوں کا کاروبار ہمیشہ سے افضل کاروبار رہا ہے اور آج بھی سمجھدار معاشروں میں ایک نمایاں تجارت کی حیثیت سے قائم ہے۔ خطی مسودوں اور چمڑے کے جلد بند ایڈیشن تو الگ رہے۔ لاہور میں کتب بینی کی عادت ہر زمانے سے کمترین ہو کر رہ گئی ہے۔ قدیم اندرون شہر کے تقریباً ہر محلے میں لائبریریاں تھیں۔ اب وہ لائبریریاں نہ رہیں، وہ کاتبین نہ رہے اور نہ ہی چمڑے کے جلد ساز۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ چھاپہ خانوں نے ان کی تجارت کو تباہ و برباد کیا۔ اگر انہوں نے کسی چیز کو تقویت دی ہے اور کچھ دیا ہے تو وہ نئی عزت داری دی ہے۔

●○●○●○●

کاغذ بنانے والوں کی یاد میں

اس میں کوئی شک نہیں کہ چنگیز خان نے لاہور پر قیامت ڈھا دی تھی۔ اسے لوٹا کھسوٹا، عورتوں کی عصمت دری کی جو اندرون شہر سے فرار ہونے میں ناکام رہی تھیں اور تمام باقی ماندہ صحت مند مردوں کو ذبح کر ڈالا تھا، لیکن اگر اس کے ہاتھوں کوئی مثبت کام ہوا جو مدتوں بعد تک جاری وساری رہا تو وہ یقیناً لاہور کو کاغذ سے متعارف کرانے کا تھا۔

چینیوں نے سب سے پہلے کاغذ کا استعمال کیا۔ یہ ایجاد 2000 برس قبل کی ہے۔ اُن دِنوں پنجاب میں ایک نہایت پتلا سا مضبوط کپڑا استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ کاغذ یہاں ہوتا ہی نہیں تھا۔ اگر آپ کو کبھی عجائب گھر لاہور میں قدیم ''شاہی فرمان'' دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ نے غور کیا ہوگا کہ قدرے پرانے فرمان کپڑے پر رقم ہیں۔ جب شیر شاہ سوری نے نظامِ بندوبست اراضی کو یکسر بدل ڈالا تو اس نے ''پٹوار خانے'' پر یہ لازم کیا کہ وہ متعلقہ علاقے کے پورے ریکارڈ کی دو دو کپڑے کی پرتیں تیار کریں۔ تحصیلدار نقل کی اپنے دستخطوں اور مہر کے ساتھ تصدیق کرتا اور اصل پرت اپنے پاس رکھ لیتا تھا۔ لیکن پھر کاغذ آ گیا اور کاغذ لاہور میں دو راستوں کے ذریعے پہنچا۔ سمرقند سے بذریعہ کشمیر اور جنوب سے عرب تاجروں کی مہربانی کے طفیل جن کی ابتدائی طور پر ملتان میں آمد ہوئی تھی۔ دونوں صورتوں میں ابتدائی راستہ بذریعہ سمرقند ہی تھا۔

ہمیں منگولوں کا سمرقند میں زبردستی کاغذ لانے پر شکر گزار ہونا چاہیے۔ طلاس کے قریب جنگ اطلخ کے بعد سمرقند میں لائے جانے والے چینی قیدیوں نے اوّل اوّل 751ء میں چین میں رائج کتان، السی اور پٹ سن کی بوسیدہ دھجیوں سے کاغذ بنانے کے طریق کار کو استعمال کرتے ہوئے کاغذ متعارف کرایا۔ ابنِ ندیم نے ''الفہرست'' میں اپنے مشاہدے کو بیان کیا۔ ''چینی کاغذ پر لکھتے ہیں جسے وہ ایک قسم کی جڑی بوٹیوں سے بناتے ہیں۔ عربوں نے سمرقند میں چند چینیوں سے کاغذ تیار کرنے کا طریقِ کار سیکھا اور پھر مغربی دنیا میں منتشر کر دیا۔

کاغذ بنانے کا طریقِ کار جب عربوں کے ہاتھوں میں آ گیا تو انہوں نے اس میں اصلاح کی اور

کتان میں السی اور دیگر سبزیاں اوران کے ریشے شامل کیے۔ یہ جدید کاغذ کی صنعت کا آغاز تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں عربوں کے ہاتھوں ملتان کی فتح نے خراسانی کاغذ کو بھی اوّلین طور پر متعارف کرا دیا اور اس کی درآمد آئندہ کئی صدیوں تک جاری رہی۔

کاغذ سازی کی صنعت برصغیر میں سلطانی دور کے دو بڑے سیاسی اور ثقافتی شہروں دہلی اور لاہور میں قائم ہوئی۔ ہندوستانی کاغذ سازی کے مراکز میں کاغذ کی چمکدار قسم تیار کی جاتی تھی۔ ایک تحقیق میں قدیمی کاغذ کی سات اقسام میں درجہ بندی کی گئی ہے۔ کشمیری، حیدرآبادی، احمد آبادی، فیض آبادی، خاصۂ جہانگیری یا لاہوری، کانپوری اور اورنگ آبادی۔

اگرچہ کشمیری کاغذ مضبوط اور چمکدار ہوتا تھا، لیکن چند کشمیری مراکز نفیس ترین کاغذ تیار کرتے تھے جسے ریشمی کہا جاتا تھا۔ خاصۂ جہانگیری یا لاہوری کاغذ یہیں لاہور میں بنایا جاتا تھا۔ اگرچہ بعد ازاں سیالکوٹ نے بھی عمدہ معیاری کاغذ بنانے میں نام پیدا کر لیا۔ کاغذ چمکدار، پتلا، چمکیلا اور نیلگوں سفید ہوتا تھا۔ لاہوری قسم ایک منفرد شے تھی کیونکہ یہ پورے برصغیر میں تمام کاغذی پیداوار میں سب سے زیادہ لچکدار تھا۔ بہرحال ایک محقّق کی یہ بھی رائے ہے کہ کاغذ کی آمد کشمیر سے سیالکوٹ اور پھر وہاں سے لاہور ہوئی جو قرین قیاس ہے۔

لاہوری کاغذ بنانے کا قدیم ترین نسخہ یہ ہے: ''لگدی یا ماوا بنانے کے لیے، پرانے کپڑے، پرانی چھولداریاں، چند درختوں اور جڑی بوٹیوں کی چھالیں استعمال کریں۔ ان کو اچھی طرح دھو کر چند ایام کے لیے پانی میں بھگوئے رکھیں۔ ان مادوں کی چوبی تھاپی کے ساتھ کوٹ کوٹ کر دھلائی کریں۔ اس لگدی میں تھوڑا سا چونے کا پانی ملائیں۔ باہر نکالے جانے پر یہ مغلوبہ کاغذ بن جائے گا۔''

اس تحریر میں مزید بتایا گیا ہے کہ ''ایک بار باہر نکالنے پر ہر چادر کو پانی کے دوسرے تالاب میں ڈال کر نکالا جاتا ہے اور پھر اس کو دھوپ میں سوکھنے کے لیے لٹکا دیا جاتا ہے۔ عربی گوند کی ایک خاص مقدار پانی میں گھول دی جاتی ہے اور پھر کُوٹی ہوئی لگدی اس میں ڈال دی جاتی۔ یہاں سے ایک اور پانی کے تالاب میں ڈال کر نکال لی جاتی ہیں، جس میں بیجوں کی لیس دار سریش کی شکل میں گوند کے ساتھ تھوڑی سی پھٹکری بھی گھلی ہوتی ہے۔ کاریگروں کے زیرِ استعمال سانچے عموماً بانس کے بنے ہوتے تھے۔ عربی گوند ببول کے درخت سے تراوش شدہ ہوتی تھی۔''

کاغذ سازی کے قدیم ہندوستانی طریقِ کار میں استعمال ہونے والے اوزار یہ ہوا کرتے تھے: ڈگی (ہتھوڑا) چھپری (پردہ) ساچا (ساگوانی لکڑی کا فریم) کنچواس (کھجور کے درخت کا نرم برش) اور شفافی پتھر۔ ایک ماہر اس طریقِ کار کو بیان کرتا ہے۔ ''اس طرح کی لگدی سے کاغذ سازی کا طریقِ کار چنداں مشکل نہ تھا۔ لگدی کو پانی سے تر کر کے دریائے راوی پر لے جایا جاتا تھا اور پتھروں سے کوٹا جاتا تھا اور تین روز تک دھویا جاتا تھا پھر اسے ایک 7 فٹ لمبے، 7 فٹ چوڑے اور 4 فٹ گہرے حوض پر لے جایا جاتا تھا، جو نصف پانی سے بھرا ہوتا تھا۔ لگدی کو اس حوض میں پھینک دیا جاتا تھا۔''

جب یہ اچھی طرح گھل جاتی تھی تو اس حوض کے کنارے پر بیٹھا کاریگر پانی میں جھک کر دونوں ہاتھوں میں مربع فریم کو (جس میں لگا پردا چھاننی کا کام دیتا تھا) پکڑ کر پانی کے اندر ڈبو دیتا اور پھر آہستگی اور سیدھگی سے پانی کی سطح پر لے آتا۔ پردے پر لگدی کی ایک یکساں مہین جھلی رہ جاتی۔ اس پردے کو پھر اٹھا کر پلٹ دیا جاتا اور کاغذ کی جھلی ایک پرانے کپڑے کی گدی پر پھیلا دی جاتی۔ جب اس گدی پر اچھی خاصی تہہ لگ جاتی، تقریباً 9 انچ سے 14 انچ تک موٹی، تو ان پر ایک اور پرانا کپڑا پھیلا دیا جاتا اور اس پر لکڑی کا ایک تختہ بچھا کر پتھروں سے وزن ڈال دیا جاتا۔

جب کاغذ کے ڈھیر میں سے اس دباؤ سے پانی نچڑ جاتا اور تھوڑی نمی بھی دُور ہو جاتی تو پتھروں کو ہٹا دیا جاتا اور دو افراد تختے کے دونوں سروں پر کھڑے ہو جاتے اور ہاتھ سے کاغذ کے اس ڈھیر میں اونچ نیچ کھیلتے۔ اس طریقِ کار سے اچھی طرح دبائے جانے کے بعد کاغذ کی تہہ در تہہ الگ الگ کر کے خشک ہونے کے لیے کسی عمارت کی دیواروں پر یا پھر دھوپ میں پڑے کپڑوں پر پھیلا دیا جاتا جب یہ سوکھ جاتیں تو ہر تہہ کو چمکدار لکڑی کے تختوں پر پھیلا دیا جاتا اور ایک سیپی کے ساتھ رگڑا جاتا حتیٰ کہ کاغذ چمک اٹھتا۔

یوں دریائے راوی کے کنارے کاغذ تیار کیا جاتا تھا۔ اسی طرح ملتان کے نزدیک دریائے سندھ کے کنارے پر ہوتا تھا۔ پنجاب میں رُوئی کے استعمال سے بہت اعلیٰ معیار کا کاغذ تیار ہونا شروع ہو گیا۔ اگرچہ عموماً رُوئی کا آخری چناؤ، جو ہلکے زنگی رنگ کا ہوتا ہے، استعمال کیا جاتا تھا۔

ایک محقّق کا یہ دعویٰ ہے کہ کاغذ عربوں کے ہاں پہنچنے سے قبل لاہور آ چکا تھا۔ لیکن اس میں کوئی تعرض نہیں کہ یہ کیسے آیا۔ اس بات میں بھی کوئی جھگڑا نہیں کہ علم کی یہی ایک خدمت ہے جو چنگیز خان نے نادانستگی میں سرانجام دی تھی۔ برصغیر میں کاغذ پر چھپائی کا آغاز مزید چھ سو برس کے بعد ممکن ہوا جو تامل میں ''ڈاکٹرینا کرسٹینا'' کے 16 صفحات کے کتابچے سے ہوا، جس کے مصنّفین فادر ہنریکے اور فادر مینوئل ڈی ساؤ پیڈرو تھے۔ یہ مالابار ساحل میں 1578ء میں شائع ہوا۔ یہ مختصر سی تصنیف، جس کا صرف ایک ہی نسخہ دستیاب ہے، ہندوستانی زبانوں میں سے ایک کے رسم الخط میں چھپائی کی اوّلین مثال ہے۔

''ڈاکٹرینا کرسٹینا'' کے سولہ صفحات کاغذ کے ایک ہی ورق پر روایتی آٹھ تہوں کے جزو میں چھپے ہوئے ہیں، جو 10×14 سینٹی میٹر سائز میں ہیں۔ یہ مشہور خاصۂ جہانگیری یا لاہوری کاغذ پر ہے جو اس امر کا متقاضی ہے کہ برصغیر کی تیزی سے پھیلتی ہوئی صنعتی دنیا میں کس قدر وسیع کارروائیاں جاری تھیں کہ اسے نوآبادی بنا کر اجتماعی غربت میں دھکیل دیا گیا۔ پھٹکری کے استعمال کی وجہ سے یہ کاغذ اب تک صحیح حالت میں ہے جو لاہور کی مقامی تخلیقی صلاحیت کے غیر معمولی نوعیت کے کام کی مظہر ہے۔ لاہور اور سیالکوٹ کے اوّلین کاغذ سازوں کو تسلیم کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ انہوں نے علم کی اشاعت میں معمولی نوعیت کی خدمت انجام دی ہے۔

●○●○●○●

''کمپنی عہد'' میں لاہور کے اوّلین کاروبار

جب انگریزوں نے 1849ء میں سکھوں کو گجرات کے نزدیک چیلیاں والا باغ کے مقام پر شکست دی تو قلعہ لاہور پر برطانوی پرچم ''یونین جیک'' لہرا دیا گیا تھا۔ لاہور دربار کا وجود ختم ہو گیا۔ رانی جنداں اور اس کے خاندان کو مؤثر طور پر ہٹا دیا گیا اور لاہور میں کمپنی عہد کا آغاز ہو گیا۔

تمام وسعت پذیر طاقتوں کے بارے میں سچ کہا جاتا ہے کہ کاروباری معاملات ہی ان کی اوّلین ترجیح ہوتی ہے کیونکہ اصلی مقصد ہی یہی ہے۔ فوجیں اور جنگیں اور ''ہیرو'' سب کاروباری مفاد میں مدد دیتے ہیں۔ جب ہم لاہور پر نظر دوڑاتے ہیں تو یہ دیکھنا دلچسپی کا باعث ہو گا کہ انگریز یہاں کی کاروباری منڈیوں میں کیسے وارد ہوئے۔ انارکلی بازار تو ابھی وجود میں آنا تھا۔ ساری تعمیر و ترقی انگریزوں کے اقتدار کے نقطۂ آغاز ''چھاؤنی'' میں شروع ہوئی جو ابتدائی طور پر انارکلی کے علاقے میں قائم کی گئی تھی۔ اس علاقے میں موجودہ انارکلی بازار، پرانی انارکلی، فرانسیسی فوجی مشن، جسے اب ہم سول سیکرٹریٹ کے نام سے جانتے ہیں، بھاٹی دروازے کے بیرون لوئر مال جس میں ریٹی گن روڈ، گورنمنٹ کالج اور پنجاب یونیورسٹی شامل ہیں، یہیں اوّلیں کاروباری ادارے قائم ہوئے تھے۔

1924ء کی ایک تحریر کے مطابق: ''مسٹر ولیم بیل کو لاہور میں یورپی کاروباری ادارے چلانے کا پیشرو کہا جا سکتا ہے۔ کشمیر اور چنبہ میں عمارتی لکڑی کے کاروبار کے علاوہ، جس کے بانی مسٹر ایم ٹرارّ وٹّون تھے، انہوں نے گورنمنٹ پرنٹنگ پریس کے سپریٹنڈنٹ کی حیثیت سے یہاں قدم جمائے۔ پھر اس عہدے کو چھوڑ کر اپنا چھاپہ خانہ لگا لیا۔ نیلام گھر، کتب فروشی کی دکانیں، سٹیشنری کی دکانیں اور جنرل سٹور قائم کیے۔'' حتیٰ کہ اس نے درزی خانے اور پیانو کی دکانیں بھی کھول رکھی تھیں۔ ولیم بیل نے، جو ''پنجاب ریکارڈ'' بھی شائع کرتا تھا، ایسی تمام خوبصورت پرانی چمڑے کی جلد والی کتابیں، جو آج کل ہمیں وکیلوں کے ہاں نظر آتی ہیں، بھی اسی نے شروع کیں۔ جب بیل عمر رسیدہ ہو گیا تو وہ لوئر مال پر اپنے متاثر کن بنگلے میں آرام کرنے لگا اور کاروبار اپنے داماد

جے جے ڈیوس کے حوالے کر دیا۔ اس نے اپنا کاروبار کورٹ سٹریٹ میں قائم کر لیا۔ اگر آپ آج بھی مال روڈ پر کار میں سفر کریں تو وائی ایم سی اے بلڈنگ کی ایک نکڑ میں نصب ایک پرانا بورڈ جے جے ڈیوس کی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ اس کا چھاپہ خانہ حجم میں بڑھ کر بالآخر سول اینڈ ملٹری پریس بن گیا تھا۔ ان کی بقاء سرکاری چھپائی میں تھی۔ جو بے شمار کاروبار ولیم بیل نے قائم کیے تھے، اس نے دیگر یورپی تاجروں کو فروخت کر دیئے اور ان تمام لوگوں نے انہیں ترقی دے کر خوشحال کاروباری اداروں میں بدل دیا۔

لیکن یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ لاہور چھاؤنی کو جب میاں میر منتقل کیا گیا تو بڑی بڑی دکانیں پہلے وہیں کھلیں۔ جب وہ وہاں مستحکم ہو گئے تو واپس انارکلی کے علاقے میں آ گئے۔ میاں میر میں قائم ہونے والی اوّلین دکانوں میں سے ایک ''جمشید جی اینڈ سنز'' تھی، جو 1862ء میں وہاں قائم ہوئی۔ وہ ایک ''جنرل یورپی سٹور'' چلاتے تھے۔ اس زمانہ میں یہی ترکیب رائج تھی اور شراب اور دیگر محلول، کھلونے اور گولہ بارود بھی فروخت کرتے تھے۔ پہلے پہل وہ صراحیوں میں سیاہ سفوف، آتش بازی اور گولیوں اور چھرّوں کے تھیلے بھی فروخت کرتے تھے۔ کیونکہ توڑے دار بندوقوں کا دور ابھی چل رہا تھا۔ قدیم اور اصلی جمشید جی اینڈ سنز کی دکان آج بھی سرور روڈ پر ذاکر تکہ شاپ سے متصل موجود ہے۔ انہوں نے اس کی ایک شاخ پرانی ٹولنٹن مارکیٹ کے قریب کمرشل بلڈنگ میں بھی کھولی تھی۔ انہوں نے لوئر مال کے شمالی سِرے پر ایک خوبصورت گھر بنایا تھا جو ''روز کاٹیج'' کہلاتا تھا۔ یہ شاندار گھر گورنمنٹ کالج ہاسٹل کی راہداری کے لیے مسمار کر دیا گیا تھا۔

درزیوں کے معیار سے ''کمپنی بہادر''، ایسٹ انڈیا کمپنی کو مقامی طور پر یونہی پکارا جاتا تھا، کے افسران دِق آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے لندن کے بہترین درزیوں کی لاہور آنے کی حوصلہ افزائی کی۔ اوّلین ترین کاروبار کرنے والی میسرز ''فلپس اینڈ کمپنی'' تھی جو نیلا گنبد کی موجودہ عمارت کے کونے پر واقع تھی۔ ریجنٹ سٹریٹ لندن کے تین نمایاں ترین درزی حضرات جنہوں نے لاہور میں اپنی شاخیں کھولیں وہ ''میسرز کلارک اینڈ کمپنی''، ''میسرز ایڈلارڈ اینڈ کمپنی'' (جواب بھی لندن میں کام کر رہی ہے) اور ''میسرز ڈیوتج اینڈ کمپنی'' تھے۔ ابتدائی طور پر وہ خود کو میاں میر میں محفوظ خیال کرتے تھے لیکن چند برس وہ انارکلی اور مال روڈ کے علاقے میں منتقل ہو گئے۔ سب نے خوب کمایا۔ بہرطور ان کا کاروبار کرنے کا طریقہ آج کل مروّجہ طور طریقوں سے بہت مختلف تھا۔

جب کوئی شریف آدمی سوٹ سلوانا چاہتا تو اسے عام طور پر ایک سے زیادہ سوٹ سلنے کے لیے دینے پڑتے تھے۔ لگتا تو عجیب ہے ''صرف ایک سوٹ سلوانا'' ایک ناقابلِ قبول بات تھی۔ شریف آدمی کی طرف سے درزی کی دکان پر پیغام چھوڑ دیا جاتا۔ یورپی درزی ایک بھنگی کے ہمراہ اس شخص کے گھر جاتا، چائے پیتا اور معاشرتی تعلقات کے بعد ناپ لیتا۔ بھنگی قمیصوں اور زیر جاموں کے لیے پارچہ جات لے کر جاتا تھا۔ چنانچہ شریف آدمی کی پوشاک اور آرائش و تزئین کے لیے مکمل تحریری ہدایات دی جاتی تھیں۔ یہ ایک یورپی کی زندگی

میں تقریباً ایک چھوٹی موٹی تقریب ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے درزی حضرات اگر ممکن ہو سکے تو، بڑے سے بڑے سرکاری اہلکار سے سرکاری سرٹیفکیٹ حاصل کرنا پسند کرتے تھے۔ اس سے کئی لحاظ سے درزی کی پیشہ وارانہ صلاحیتوں کا پتہ چلتا تھا۔ مقامی آبادی نے بھی درزیوں کی پیشہ وارانہ مہارت سیکھ لی اور انارکلی کی گلیوں میں اپنی چھوٹی چھوٹی دکانیں کھول لیں۔ کمپنی کے افسران انہیں ''چیپ جونز'' پکارتے تھے اور ایسی کسی دکان کے پاس دیکھا جانا معاشرتی بے عزتی خیال کی جاتی تھی۔

پھر پیشہ ور فوٹو گرافر حضرات تھے۔ لاہور کے اوّلین اور مشہور ترین فوٹو گرافروں میں سے ایک شخص تھا جس کا نام مسٹر ولیئم بارتھولومیو تھا۔ 1849ء میں جب فتح مکمل ہو گئی تو اس وقت پہلے پہل وہ قلعہ لاہور میں رہائش پذیر رہا اس وقت وہ ایک دوا ساز تھا۔ پھر وہ فرید کوٹ کے راجہ کا مشیر بن گیا اور اپنا سٹوڈیو لوئر مال پر منتقل کر دیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کی دکان بند ہو گئی اس وقت تک ایک اور فوٹو گرافر، جیمز کریڈوک، شملہ سے لاہور منتقل ہو گیا۔ اس نے اپنا سٹوڈیو لوئر مال پر قائم کیا کیونکہ مال روڈ کی حدود اس وقت جی پی او چوک تک تھی۔ اس کے انتقال کے ساتھ اس کی بھی دکان بند ہو گئی۔ بہت بعد میں ایک اور فوٹو گرافر نے اسی جگہ ''ایس رولو اینڈ کمپنی'' کے نام سے دکان کھول لی۔ آخری حیات رولو اپنے دادا کے شاگرد کی حیثیت سے دکان پر کام کرتا تھا۔ بوڑھا رولو کوئی دس برس قبل انتقال کر گیا تھا اب اس کا شاگرد اسی نام سے دکان چلاتا ہے۔

1872ء میں لاہور میں لوئر مال پر اوّلیں دوائیوں کی دکان کھلی اس کا نام ''رچرڈسن کیمسٹ'' جو بعد ازاں ''میسرز پیک ایلن اینڈ کمپنی'' کہلائی۔ اس نے بے تحاشا دولت کمائی اور جب مالکان بدل گئے تو اس نے بھی نام ''میسرز پلومر اینڈ کمپنی'' رکھ لیا۔ اصل پلومر دکان لوئر مال پر پیپلز ہاؤس کے پاس ہے۔ بعد ازاں یہ ہائی کورٹ کے بالمقابل موجودہ جگہ پر منتقل ہو گئی۔ یہ ایسا کاروبار ہے جس میں گھاٹا نہیں پڑتا اور پلومر اینڈ سنز اب بھی ایک بڑی فعال اور تاریخی دکان ہے۔ ایک لحاظ سے یہ غالباً لاہور کی قدیم ترین یورپی دکان ہے جو انگریزی راج کے ساتھ نمو پذیر ہوئی تھی۔ اگرچہ میں کسی دیگر قدیم ترین دکان کی شہادت قبول کرنے کے لیے تیار ہوں کیونکہ جمشید جی اینڈ سنز اپنی اصلی حالت اور پیشے میں کام نہیں کر رہی۔

●○●○●○●

لاہوری ککّے زئی ـــــ گھوڑوں کے سوداگر

اندرون شہر لاہور میں اصلی گھڑسواروں کا علاقہ موچی دروازے کے اندر کوچہ چابک سواراں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس علاقے کے رہائشی وہ لوگ تھے جو کسی نہ کسی طور گھوڑوں سے وابستہ تھے خواہ وہ گھڑسواری ہو یا زین سازی، گھڑسواری کے بوٹ، لگامیں، پٹے اور چابک ہوں یا محض گھوڑوں کی تجارت۔ گھوڑوں سے متعلق کسی قسم کا کام ہو اس کی کڑی ہمیشہ ''چابک سوار'' سے جا ملتی ہے۔

گھوڑوں کی تجارت اس کوچے کے ککّے زئی قبیلے کا قدرتی کاروبار تھا اور وہ لاہور کے بے شمار نخاس خانوں، خصوصاً مسجد وزیر خاں کے سامنے والے، کے ذریعے کارروائیاں کرتے تھے۔ یہ گھوڑوں کے سوداگر ''چابک سوار'' کہلاتے تھے۔ حالانکہ اس ترکیب کا مطلب ہے ''گھڑسوار۔'' پہلے زمانے میں یہاں گھڑسوار فوجی رہا کرتے تھے خصوصاً مغلیہ دور میں۔ لیکن جب سکھوں نے 1799ء میں قبضہ جما لیا تو گھڑسوار دستوں سے متعلق دیگر تاجر حضرات بھی یہاں آباد ہو گئے اور جب 1849ء میں انگریزوں کی آمد ہوئی تو کوچہ چابک سواراں میں تاجروں، صنعتکاروں اور گھڑسوار دستوں کے رہائشی افسروں کی صف آرائی تھی۔ لیکن ککّے زئی اور ان کی گھوڑوں کی تجارت ہمیشہ علاقے پر چھائی رہی۔

لاہور میں گھوڑوں کی تجارت کے بارے میں بے شمار تفصیلی تحریریں ملتی ہیں، لیکن کوئی بھی اتنی رنگین اور وضاحت بھری نہیں جتنی کہ ایک کتاب ''یادگارِ چشتی'' میں ہے، جو مولوی نور احمد چشتی کی تصنیف ہے۔ وہ ایک اور مشہور کتاب ''تحقیقاتِ چشتی'' کے بھی مصنف ہیں۔ گھوڑوں کے سوداگر ککّے زئی سب یکجا ہو کر کاروبار کرتے تھے اور منافع مشترکہ جمع آوری میں رکھتے تھے۔ عمومی منافع کا نرخ چار فیصد ہوا کرتا تھا۔ جو ایک مشترکہ مدّ میں جمع کیا جاتا تھا اور نئے چاند کے پہلے ہفتے کی پہلی جمعرات (نوچندی) کو یہ مشترکہ منافع تمام ککّے زئی قبیلے کے گھوڑوں کے سوداگروں میں مساوی تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس قبیلے کی اپنی سخت نوعیت کی اخلاقیات تھیں اور یہ ان کی روایت تھی کہ وہ پورے مول تول کے دوران منہ سے کوئی لفظ ادا نہیں کرتے تھے ماسوائے گھوڑے کی مدح میں یا رَد میں۔

جوطریقِ کار وہ استعمال کرتے تھے وہ بڑا منفرد تھا۔ جب خریدار کی سنجیدگی کو جانچنے کے بعد گھوڑے کی قیمت پر بات آتی تھی تو وہ اپنے ہاتھ پر رومال ڈال لیتے اور اشاروں کی انوکھی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ قیمت ہمیشہ اشارات سے بتائی جاتی تھی اور کبھی بھی الفاظ کے ذریعے بتائی نہیں جاتی تھی کیونکہ اسے منحوس سمجھا جاتا تھا۔ اشاروں کی زبان انگلیوں کی حرکت سے قابلِ قبول قیمت کے بارے میں آگاہ کرتی تھی۔

ایک بار مول تول ہو جاتا تو کپڑا گھوڑے پر ڈال دیا جاتا اور یوں سودا مکمل ہو جاتا۔ جب قیمت ادا کر دی جاتی تو کپڑا، لگام، کچھ سبز چارہ اور بنیادی زین کا شمار بھی قیمت ہی میں ہوتا تھا۔ سبز چارہ خوش قسمتی کی نشانی سمجھی جاتی تھی اور کوئی گھوڑا بھی کبھی کسی سوداگر نے سبز چارہ دیئے بغیر فروخت نہیں کیا تھا۔

ککّے زئی قبیلے کی اپنی اخلاقیات تھیں اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ لاہوری عوام الناس کبھی بھی ان کے طریقِ کار کو ٹھیک طرح ہضم نہ کر پائے۔ مول تول کرنے میں ان کی سخت گیری کی شہرت رہی۔ بہرحال اتنے برس کا عرصہ بیتنے کے بعد لوگ ان سے خاصے محتاط ہو چکے ہیں اور زیادہ تر یہی کوشش کرتے ہیں کہ اُن سے کوئی جھگڑا مول نہ لیں، کیونکہ ایک بار جب وہ لڑنے پر اتر آئیں تو پھر پورا قبیلہ متحد ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود آج تک جتنی بھی اقوام اندرون شہر میں آباد رہی ہیں، ان میں وہ سب سے زیادہ معمّائی ثابت ہوئے ہیں۔

گھوڑوں کے سوداگروں کا اپنے گاہکوں کے ساتھ غیر معمولی جارحانہ رویہ ہوتا تھا، لیکن جب معاملہ ان کے خاندان کی عورتوں کے بارے میں ہوتا ہے تو ٹھنڈے مزاج کے، بلا مقابلہ کامیابی دلانے والے بن کر رہ جاتے ہیں۔ ککّے زئی عورتوں کی پہچان آج بھی اس قسم کی عورتوں کی ہے جو لڑاکا صفت ہوتی ہیں اور جو معمولی باتوں پر گھنٹوں لڑتی رہتی ہیں اور ایسی زبان استعمال کرتی ہیں جس سے بے حس مجرموں کے چہرے بھی شرم سے تمتما اٹھتے ہیں۔ وہ ایک زبانی لڑائی کئی کئی روز، کئی ہفتے حتیٰ کہ کئی مہینے جاری رکھتی ہیں۔

وہ صبح اپنے باورچی خانے کے برتنوں کو اوندھا رکھنے کے بعد بحث شروع کر دیتی ہیں اور پھر بازاری زبان کا مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اتنی رنگین زبان کا استعمال ہوتا ہے کہ اندرون شہر کا کوئی مرد اس علاقے سے گزرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ وہ سب بغلی گلیوں کا استعمال کرتے ہیں اور تیزی سے گزرتے ہوئے دشنام سن کر حیا سے ان کے رخساروں پر سرخی دوڑ جاتی ہے جیسا کہ میں ایک بار کالج کے زمانے میں اس منظر کا مشاہدہ کر چکا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسی جارحانہ عورتوں کا سامنا کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ گولی کا نشانہ بن جائے۔

لیکن پھر گھوڑوں کی سوداگری کے علاوہ کوچہ چابک سواراں کے ککّے زئی اپنی بے وفائی میں بھی مشہور تھے۔ ان کی زندگی کی اچھی چیزوں کی چاہت بھی ہر دل عزیز عوامی روایتی تھی۔ اور کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کے وسائل کی مشترکہ رسد کا ایک طرح سے اس بات کا یقینی بنانا ہوتا تھا کہ وہ سب ایک ساتھ زندگی کی آزمائشوں میں پڑیں۔ اندرون شہر کی ایک قدیم کہاوت ہے کہ ''ککے زئی گھوڑا بیچ کر بہترین نیند سوتا ہے۔'' غالباً اس لیے کہ اسے

عین مستقبل قریب میں خوشگوار دنوں کا یقین ہو چکا ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ قابلِ فہم ہے کہ ان کے خاندان کی عورتوں نے ایسی اساطیری حیثیت کیسے حاصل کر لی کیونکہ وہ تو اپنی مخالف ہمسائیوں کو ان کے خاوندوں کی نامردی کے بھی طعنے دینے میں مشہور ہیں۔

یہ چلن رہے ہیں کوچہ چابک سواراں کے ککّے زئیوں کے۔ ان کی رسومات کا جائزہ لینے کی بھی ضرورت ہے کیونکہ چشتی صاحب کے مطابق لاہور کے دیگر قبائل سے ہٹ کر وہ اپنی عورتوں کے زمانۂ حمل کی بھی رسم مناتے ہیں اور پورے نو ماہ کے عرصۂ امید کے دوران یہ رسوم جاری رہتی ہیں۔ ہر مہینے یہ متوقع ماں کے گھر مٹھائی بھیجتے ہیں خواہ وہ ہمسائی سے لڑائی میں ہی مصروف کیوں نہ ہو۔ مرد حضرات سختی سے اس کارروائی سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ وہ اکٹھے مل کر اپنے وسائل کی جمع بندی اور مل جل کر لطف اندوز ہونے کو ترجیح دیتے ہیں اور یہ نہایت سمجھداری کی بات ہے۔ جب بچے کی پیدائش ہو جاتی ہے تو وہ سخت ردِعمل کا اظہار کرتے ہیں جو اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ لڑکا ہوا ہے یا لڑکی۔ کیا کچھ کہنے کی ضرورت باقی ہے؟

لیکن اب وقت بدل گیا ہے۔ جب ڈیڑھ سو برس قبل کوچہ چابک سواراں کے ککّے زئی گھوڑوں کے سوداگر ہوتے تھے۔ وہ ابتدائی طور پر اندرون شہر سے نکل کر شاہدرہ کی جانب آباد ہو گئے جہاں ایک بستی ککّے زئیاں وجود پذیر ہے۔ وہاں آج بھی عورتوں کے مابین روزانہ زبانی کلامی لڑائیوں کی رسم ادا ہوتی رہتی ہے۔ دیگر حضرات شہر کے دوسرے علاقوں میں پھیل گئے ہیں۔ چند ایک وہیں ٹکے ہوئے ہیں جو چمڑے کی تجارت میں اپنے کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ آج یہ قبیلہ دیگر قبائل کی طرح مختلف تجارتوں میں کام کر رہا ہے جو آج کل مہیا ہیں۔ اگرچہ وہ اب بھی آمادۂ جارحیت ہیں اور ان سے معاملہ کرنا خاصا دشوار کام ہے۔ یہ ان کی نسلی توریث میں موجود ہے کیونکہ ایک تاریخی مآخذ کے مطابق وہ روس کے سخت کوش قزاق نژاد تھے، جن کی چھ سو برس قبل ترک حملہ آوروں کے ہمراہ لاہور میں آمد ہوئی تھی اور وہ تمام گھڑ سوار تھے۔

ترکمانستان میں ایک علاقہ ہے جو کاکزئی کہلاتا ہے، لیکن لفظ ککّے یونانی زبان کے لفظ ''ککوفنوس'' سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں ''بُرا۔'' لفظ ''ککا'' کی جڑیں ہند یورپی ہیں، مثلاً ''کراتیا'' کراتوس سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے ''مضبوط، طاقت، اقتدار۔'' سو یہ سخت کوش قزاق جو گھوڑوں پر سوار رہتے تھے اپنے گھوڑوں کے ساتھ ہی رہے، حتیٰ کہ مشینوں نے اُن کی جگہ لے لی۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں کہ لاہور میں گھڑ دوڑ کے لیے تیار کیے گئے گھوڑوں کے پچاس فیصد سے زائد مالکان ککّے زئی ہیں۔ یہی حال جاکیوں اور گھوڑوں کو سدھانے والوں کا ہے۔ آج تک ان سے، اپنے خاندان کی عورتوں کی طرح، معاملہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ نسلی توریث ہی تو ہے!

●○●○●○●